اسیر موسم ہجراں

ضوباریہ ساحر

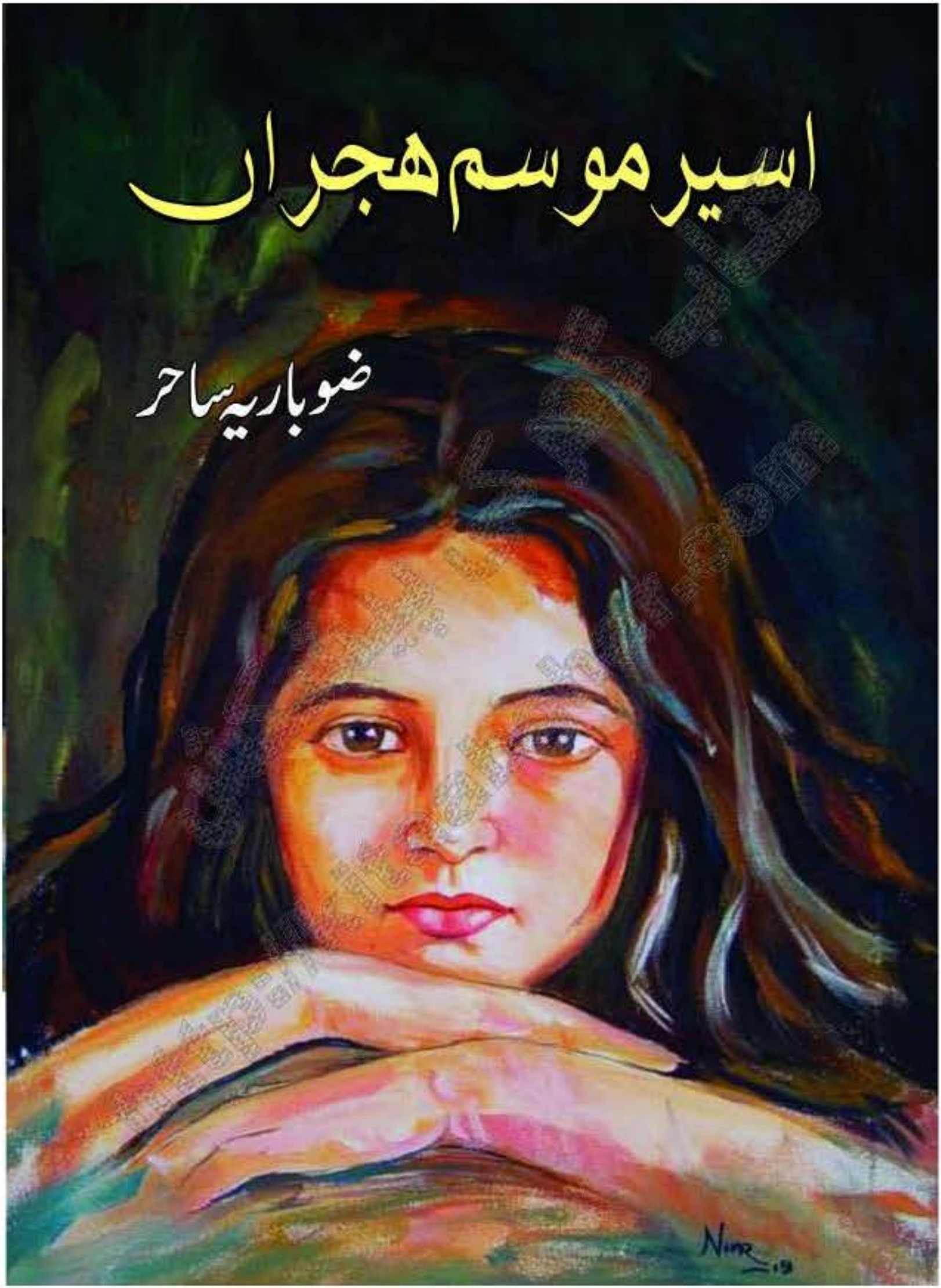

اسیرِ موسمِ ہجراں

ضوباریہ ساحر

آفتاب پبلی کیشنز
ٹبہ بابا فرید۔ عقب ضلع کچہری۔ لاہور

نوٹ:

اس ناول کے جملہ حقوق بحق مصنفہ اور پبلشرز (آفتاب پبلی کیشنز) محفوظ ہیں۔
ادارہ آفتاب پبلی کیشنز، لاہور نے اردو زبان اور ادب کی ترویج کیلئے اس کتاب کو kitaabghar.com پر شائع کرنے کی خصوصی اجازت دی ہے، جس کے لئے ہم انکے بے حد ممنون ہیں۔

انتساب!

اپنے پیارے سے بابا جانی اور امی کے نام
جن کی محبتیں پا کر ماضی کا ہر دُکھ بھول گئی
ان کے تعاون کے بغیر شاید میں یہ چند
لفظ بھی نہ لکھ پاتی۔

http://kitaabghar.com

بھاگتے ہوئے قدم یکدم رک گئے اس نے پلٹ کر اپنے عقب میں دیکھا' سیاہ گھور تاریکی کا عفریت چاروں اور اپنے پنجے گاڑے ہوئے تھا لیکن اسے اس اندھیرے میں سفر کرتے کچھ دیر ہو چکی تھی اس لیے یہ اندھیرا' یہ تاریکی اس کی نگاہوں سے نامانوس ہرگز نہیں تھی۔ پھولی ہوئی سانسوں کو اعتدال پر لانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اس نے ایک بار پھر پاؤں آگے بڑھا دیئے۔ حلق خشک لکڑی کی مانند چیخ رہا تھا ہر بن مو سے پسینہ کسی سیل آب کی مانند رواں تھا۔ اس کے پرانے بوسیدہ لباس کو پسینہ تر کر چکا تھا۔ لیکن وہ بھاگ رہی تھی۔ اسے بھاگنا تھا جانے کون سی منزل اس کی منتظر تھی؟ کہاں اس کا پڑاؤ ہونا تھا؟ کون سی جگہ ایسی تھی جہاں پہنچ کر اس کی ساخت نے دم توڑنا تھا؟ وہ خود نہیں جانتی تھی۔ جو وہ چھوڑ آئی تھی نہیں سوچنا چاہتی تھی لیکن بار بار سوچیں اس کے ذہن میں کیکٹس کے خار بن کر اتر جاتی تھیں۔ وہ نڈھال تھی پیاس سے بے حال تھی۔ لیکن پھر بھی جس قدر جلدی ہو سکتا تھا وہ یہاں سے بہت دور نکل جانا چاہتی تھی۔ جہاں اس کے ماضی کا اندھیرا اس کا تعاقب نہ کر سکے۔ یہ سڑک سے ابھی قدرے فاصلے پر تھی۔ جھاڑیوں اور درختوں کی اوٹ لیکر بھاگ رہی تھی کہ یکدم کہیں دور سے روشنی کی ایک باریک سی لکیر نے اس کی اندھیرا شناس آنکھوں کو جھنجھوڑ دیا۔ وہ ڈر گئی' سہم گئی۔ انسان نما درندوں کے چنگل سے نکلنے کی خاطر اس نے مسافت کا راستہ چنا تھا لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ دنیا میں قدم قدم پر اسے ایسے ہی انسانوں سے واسطہ پڑے گا۔ وہ سڑک کے کنارے نئی تعمیر شدہ دیوار کے ساتھ رکھے اینٹوں کے ڈھیر کے پیچھے دبک کر بیٹھ گئی۔ اس کی رگ رگ میں خون کی جگہ خوف دوڑ رہا تھا۔ دل کی دھڑکن یوں تھی جیسے اس کی رفتار کا کوئی تعین ہی نہیں تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا ابھی دل سینے کی ہڈی توڑ کر باہر نکل آئیگا۔ ہلکی ہلکی روشنی اب قدرے تیز ہو گئی تھی ساتھ ہی قدموں کی چاپ بھی ابھرتی معلوم ہوتی محسوس ہونے لگی۔ اس نے اپنا آپ مزید سمیٹ لیا۔ تیز ہوتے تنفس کو قابو میں کرنے کے لیے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر سختی سے دبایا۔ اور سر کو قدرے اونچا کر کے آہٹوں کی سمت دیکھا۔ وہ کوئی چوکیدار تھا جو سامنے سے آ رہا تھا۔ پھر کچھ ہی دیر بعد جب قدموں کی چاپیں بالکل مدھم پڑ گئیں تو اس نے ایک بار پھر اینٹوں کے ڈھیر کے عقب سے جھانکا تاریکی میں چوکیدار کا بس ہیولا سا ہی دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ڈھیر کے پیچھے سے نکلی اور ایک بار پھر اندھا دھند بھاگنے لگی۔ وہ جلد سے جلد کسی محفوظ پناہ گاہ پر پہنچ جانا چاہتی تھی۔ سڑک کے کنارے درختوں کے جھنڈ سے نکل کر وہ سڑک پار کرنا چاہتی تھی لیکن اچانک اسی اثناء میں ایک تیز رفتار گاڑی اس کے بے حد قریب پہنچ گئی۔ اس کی خوفزدہ آنکھیں جیسے ساکت سی ہو گئی تھیں۔ اسے اتنا ہی محسوس ہوا تھا جیسے گاڑی کے ٹائر چرچرائے تھے۔ پھر جیسے اس کے وجود کو ایک زوردار دھکا لگا تھا۔ اس کے بعد کیا ہوا اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ باہر کی پھیلی ہوئی تاریکی اور سناٹا اس کے وجود کے اندر اتر گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

آج خلاف معمول انہیں کلینک سے کچھ دیر ہو گئی تھی۔ اور دیر کا موجب وہ ایمرجنسی کیس تھا جو شام سات بجے ان کے کلینک پر لایا گیا تھا۔ ایک چھ سالہ بچے کو ایک تیز رفتار بس نے کچل دیا تھا۔ بچہ بالکل جاں بلب تھا جب ان کے پاس لایا گیا۔ انہوں نے ہر ممکن

کوشش کی کہ کسی طرح اس معصوم کو بچالیں لیکن شاید ملکیت ایزدی نے اس کی زندگی کی اتنی ہی بہاریں لکھی تھی۔اس بچے نے ڈاکٹر فواد کے ہاتھوں میں دم توڑا تھا۔اور اس وقت سے اب تک جبکہ رات کے گیارہ بجے کا عمل ہوگا ان کی طبیعت کا بوجھل پن دور نہیں ہو پایا تھا۔مسلسل اڑھائی گھنٹوں کی محنت ضائع ہوگئی تھی۔ذہن پر جیسے اداسی کی لکیر سی جم گئی تھی سوچوں پر جمود طاری تھا۔نگاہوں کے سامنے جیسے ایک ہی منظر ٹھہر سا گیا تھا۔نادانستگی میں ایکسیلیٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھتا چلا گیا سوچوں میں گم ہونے کے باعث انہیں روڈ کراس کرتا ہوا وہ نسوانی وجود نظر نہیں آیا تھا۔وہ چونکے تب جب وہ گاڑی کے سامنے آگئی۔عجلت میں بریکوں پر پاؤں رکھنے کے باعث گاڑی کے ٹائر بری طرح چرچرائے تھے۔لیکن دیر ہو چکی تھی۔وہ وجود ان کی گاڑی کی زد میں آچکا تھا۔انہوں نے جلدی سے اپنی طرف کا دروازہ کھولا اور گاڑی سے باہر نکلے۔ہلکے سرمئی رنگ کے پلین کاٹن کے سوٹ میں ملبوس وہ اس سیاہ تاریک رات کا ہی ایک حصہ لگ رہی تھی وہ سڑک پر اوندھے منہ گری ہوئی تھی۔ریشمی سیاہ بالوں نے اس کے چہرے کو اپنی حفاظت میں لے رکھا تھا۔انہوں نے تیزی سے آگے بڑھ کر اسے سیدھا کیا۔اس کی پیشانی سے خون بہہ رہا تھا۔جو غالباً سڑک پر گرنے کے باعث لگنے والی چوٹ کی وجہ سے تھا۔بظاہر پورے وجود پر کوئی زیادہ نمایاں چوٹ یا زخم نظر نہیں آرہا تھا۔ممکن ہے وہ خوف و دہشت کی زیادتی سے بے ہوش ہوگئی ہو۔بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اچانک کوئی غیر متوقع حادثہ ہمارے حواس سلب کر لیتا ہے۔اس کے ساتھ بھی شاید یہی ہوا ہوگا۔ڈاکٹر فواد نے سر اٹھا کر ارد گرد دیکھا۔دور دور تک کسی ذی روح کا وجود احاطہ بصارت میں نہیں آیا تھا۔

''تو کیا یہ لڑکی اتنی رات گئے اکیلی ہی کہیں سے آرہی تھی۔کیا مسئلہ ہوگا اس کے ساتھ۔''انہوں نے اس کی پیشانی سے بھل بھل بہتے خون کو دیکھا۔ایک ہاتھ سے اس کی پیشانی کے زخم کو زور سے دباتے ہوئے انہوں نے ایک بار پھر سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا' مگر نتیجہ ابھی وہی تھا۔ہر گزرتا لمحہ اس اجنبی لڑکی کو رنگینیوں سے دور لے جا رہا تھا۔انہوں نے پریشانی سے اس لڑکی کی طرف دیکھا اور پھر جیسے یکدم ہی فیصلہ ہوگیا انہوں نے اسے اٹھا کر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لٹا دیا۔خود تیزی سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی آگے بڑھا دی۔تیزی سے گاڑی دوڑاتے وہ پانچ چھ منٹ میں ہی پندرہ منٹ کا راستہ طے کر کے گھر پہنچ گئے تھے۔چوکیدار نے گیٹ کھولا اور وہ گاڑی اندر لے گئے۔گاڑی کو پورچ میں کھڑا کر کے باہر نکلے۔وسیع و عریض کوٹھی کے بیشمار کمروں کی لائٹس آف ہو چکی تھی۔لیکن ایک کمرہ جو کوٹھی کے بالکل کونے میں تھا۔اس کے باہر جلنے والی لائٹ دیکھ کر ڈاکٹر فواد نے طمانیت بھرا سانس لیا۔بیک ڈور کھول کر انہوں نے اُس زخمی لڑکی کو باہر نکالا اور کندھے پر ڈال کر لمبے لمبے ڈگ بھرتے اُس کمرے کی جانب بڑھ گئے۔دروازے کے بالکل قریب پہنچ کر انہوں نے اندر جھانکا۔پھپھو شینا حسب معمول تخت پوش پر بیٹھی ہاتھ میں تسبیح لیے اپنا ورد دہرا رہی تھیں۔ان کی خوبصورت آنکھیں بند تھیں۔چہرے پر نرمی اور روشنی کا جو ملا جلا تاثر تھا۔ان کی شخصیت کو ایک عجیب سا تقدس بخشتا تھا۔سفید دوپٹے کے ہالے میں ان کا صبیح چہرہ اپنے اندر جیسے پوری کائنات کا حسن سمیٹے ہوئے تھا۔ڈاکٹر فواد نے آگے بڑھ کر دھیرے سے ان کو پکارا۔

''پھپھو شینا۔''

انہوں نے چونک کر آواز کی سمت دیکھا۔ آنکھوں میں تعجب کی پرچھائیں سی لہرائی۔ ''ضدی تم اس وقت اور.....اور یہ.....'' ان کا جملہ ڈاکٹر فواد کے کندھے پر جھولتی بے ہوش لڑکی کو دیکھ کر ادھورا رہ گیا۔ ڈاکٹر فواد نے آگے بڑھ کر اس لڑکی کو بیڈ پر لٹا دیا۔

''میری گاڑی سے ایکسڈنٹ ہو گیا ہے۔ نہ جانے کون ہے.....کہاں سے آ رہی تھی.....کہاں جانا تھا.....کچھ علم نہیں؟ جب سے ایکسڈنٹ ہوا ہے بے ہوش ہے۔ پھپھو ذرا اسے دیکھئے گا میں اپنا فرسٹ ایڈ باکس لے آؤں۔'' ڈاکٹر فواد کمرے سے نکل گئے۔ پھپھو شینا نے جائے نماز کا کونہ موڑا اور اٹھ کر بیڈ کی طرف آ گئیں۔ بیڈ پر بے ترتیبی سے بکھرے وجود کو قدرے سمیٹ کر چادر اوڑھائی اور اس کے قریب بیٹھ گئیں۔ بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ کچھ مانوس سے نقوش تھے لیکن پہلے کبھی دیکھا نہیں تھا۔ اس کی غلافی آنکھیں.....پنکھڑیوں جیسے ہونٹ.....ناک چاند کی طرح.....روشن پیشانی اور پیشانی کے گرد کالے بالوں کا ہالہ۔ شینا پھپھو کی آنکھوں میں اس کے لیے محبت ہلکورے لینے لگی۔ دل میں ایک نرم سا احساس چٹکیاں لینے لگا۔ دروازے پر کھٹکا ہوا۔ ڈاکٹر فواد اندر آ گئے تھے۔ انہوں نے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر باکس رکھا۔ روئی بھگو کر اس کی پیشانی کا زخم صاف کیا اور پھر اس کی بینڈیج کرنے لگے۔ پھپھو بھی قریب بیٹھی بغور ان کو دیکھے جا رہی تھیں۔ بینڈیج سے فارغ ہو کر وہ کمرے سے ملحقہ باتھ روم میں جا کر ہاتھ دھو کر آئے اور پھر پھپھو کے پیروں کے پاس نیچے قالین پر ہی بیٹھ گئے۔

''ضدی کوئی اور مسئلہ تو نہیں؟''

''اوہو پھپھو! کیوں پریشان ہو رہی ہیں کوئی اور مسئلہ نہیں ہے۔ آپ تو جانتی ہیں اچھی طرح میں امی سے پھر بھی جھوٹ بول سکتا ہوں لیکن آپ سے.....ناممکن!!''

''ضدی میں تمہیں اچھی طرح جانتی ہوں میں پریشان نہیں ہوں۔ بس یونہی لڑکی ذات ہے ناں سب گھر والے کیا کہیں گے یہ سوچ پریشان کر رہی ہے۔ خیر اب پٹی تو تم نے کر دی ہے اب اس کو ہوش میں لانے کی بھی کوئی تدبیر کرو۔'' پھپھو شینا کے کہنے پر انہوں نے خود بھی سوچا کہ ایک گھنٹے سے زائد وقت گزر چکا تھا۔ حادثہ اتنا شدید بھی نہیں تھا کہ بے ہوشی اتنی طویل ہوتی۔ ابھی وہ اسے ہوش میں لانے کا سوچ ہی رہے تھے۔ کہ کمرے میں کسی نے جھانکا یہ تائی مقسوم تھیں۔ گھر بھر میں پھپھو شینا کے بعد ڈاکٹر فواد اگر کسی پر اعتبار کرتے تھے وہ تائی مقسوم تھیں۔ اللہ کی طرف سے ان کی گود خالی تھی لیکن دل غنی تھا۔ خدا نے ان کے دل میں ممتا کے خزانے بھر دیئے تھے۔

''شینا کیا بات ہے! یہاں کیا کر رہا ہے تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟'' تائی کے لہجے میں سچی پریشانی تھی۔

پھپھو شینا کے چہرے پر ایک مسکراہٹ پھیل کر معدوم ہو گئی۔

بھابھی.....میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ اندر تو آیئے۔'' تائی مقسوم نے بیڈ پر لیٹی ہوئی لڑکی کو دیکھ لیا تھا۔ قدرے حیران سی وہ کبھی پھپھو کی طرف دیکھ رہی تھیں اور کبھی ڈاکٹر فواد کی طرف۔

''یہ.....یہ.....کون ہے یہ لڑکی؟''

''تائی امی میری گاڑی سے ٹکر ہوگئی تھی۔'' ڈاکٹر فواد نے مختصر سا جواب دیا۔

''او اللہ کے بندے تو اس کو گھر کی بجائے ہسپتال لے کر جانا چاہئے تھا۔ خدا جانے کتنی زخمی ہو۔'' تائی کے لہجے میں تردد تھا۔

''او ہو تائی امی..... کچھ زیادہ چوٹ نہیں ہے۔ دہشت کے زیر اثر بے ہوش ہے۔ ابھی ہوش میں آجائیگی۔''

''تو بھلا کوئی پوچھے تو سہی یہ رات کے اس پہر سڑک پر کیوں دندناتی پھر رہی تھی۔ ایک تو آج کل کی لڑکیاں بھی شتر بے مہار کی طرح جدھر منہ اٹھا چل پڑیں۔ اب خدا معلوم کس کی بہن بیٹی ہے۔ ان کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی؟'' تائی مقسوم ہمدرد تو تھیں لیکن حقیقت پسند بھی تھیں اس بارے میں تو ڈاکٹر فواد نے بھی نہیں سوچا تھا۔ پھپھو شینا کی دو ہی بیٹیاں تھیں روبیہ اور انیقہ وہ دونوں بھی باتوں کی آواز سن کر پھپھو کے کمرے میں آگئیں۔ وہ دونوں انتہائی اشتیاق سے اس خوابیدہ وجود کو دیکھ رہی تھیں۔

''مما..... یہ کون ہیں؟'' انیقہ کا لہجہ بھی اشتیاق سے لبریز تھا۔

''پتا نہیں بیٹا..... زخمی ہے۔ ہوش میں آئے گی تو پتا چلے گا۔'' پھپھو شینا اسے جواب دینے کے ساتھ ساتھ اس لڑکی کو بھی دیکھ رہی تھیں۔ جو دھیرے دھیرے کسمسا رہی تھی۔ اس کے بند ہونٹ وا ہوئے اور ان میں سے ایک سسکاری بلند ہوئی اور پھر جیسے رفتہ رفتہ وہ ہوش میں آنے لگی تھی۔ نیم وا ہونٹوں سے ٹھہر ٹھہر کر کراہیں نکل رہی تھیں۔ کمرے میں موجود افراد نے چونک کر اس کی سمت دیکھا اور پھر سب ہی اس کے اردگرد بیٹھ گئے۔ سب کی نظروں نے اسے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ اور پھر سب نے دیکھا کہ اس نے دھیرے دھیرے اپنی غلافی آنکھوں پر سے پردہ اٹھالیا۔

☆.....☆.....☆

اسے خبر نہیں تھی کہ وہ کتنی دیر تک تاریکیوں کی ہمسفر رہی تھی۔ جانے کتنے لمحے' کتنے گھنٹے' کتنے دن بیت چکے تھے۔ اس کے حواسوں پر سیاہ کہر نے تسلط جما رکھا تھا۔ پھر جیسے اس کہر کی چادر میں ننھے ننھے شگاف پڑنے لگے۔ اندھیرے پر روشنی غالب آنے لگی۔ روشنی جو زندگی ہے..... روشنی جو سانسوں کی ضمانت ہے۔ وہی روشنی اس کے کانوں کو سماعت' اس کے ہونٹوں کو گویائی اور آنکھوں کو بصارت دینے پر تلی ہوئی تھی۔ اس کے وجود کے ریشے ریشے میں درد سانسیں لے رہا تھا۔ آنکھوں کی پتلیاں آپس میں یوں پیوست تھیں گویا کبھی نہ کھلنے کی قسم کھالی ہو۔ اس نے لڑکھڑاتے قدموں سے ہوش کی وادی میں قدم رکھا۔ تو سماعت کے اردگرد کے ماحول سے کچھ بھنبھناہٹ آمیز آوازوں سے آشنا ہوئی۔ شاید اس کے اردگرد کچھ لوگ جمع تھے جو آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ وہ کہاں تھی؟ اور کب سے تھی؟ یہ نہیں جانتی تھی۔ بس ذہن کے ایوانوں میں ایک سوچ جاگ رہی تھی کہ اس کی آنکھوں میں تیز روشنی کا جھماکا ہوا تھا اور اس کے وجود کو ایک زوردار درد آمیز جھٹکا لگا تھا۔ پھر اندھیروں کے ساحروں نے اسے اپنے سحر میں جکڑ لیا تھا۔ جانے کون کون سی ظلمتوں کی مسافت طے کی تھی اُس نے اور اب روشنیوں کے سفیر جانے کہاں لے کر آئے تھے اُسے۔ اس کے ہونٹوں سے درد بھری سسکاری بلند ہوئی اور پھر وہ آہستہ آہستہ کراہنے لگی۔

''فہدی دیکھو اسے ہوش آ رہا ہے۔'' ایک نسوانی آواز کہیں بہت دور سے آئی تھی اور اس کی نیم وا آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔ اس کے اردگرد کئی افراد جمع تھے۔ نکھرے نکھرے خوبصورت چہروں والے افراد جن کے چہروں پر اسے ہوش میں آتے دیکھ کر عجیب سا سکون پھیل گیا تھا۔ اس نسوانی آواز کے جواب میں ایک شخص تیزی سے آگے بڑھا تھا۔ شاید ڈاکٹر تھا کیونکہ اس کے ہاتھ میں طبی آلات تھے۔ اس نے اسٹیتھی سکوپ سے اس کی ہارٹ بیٹ چیک کی۔

''اب یہ بالکل ٹھیک ہیں۔''

''خدایا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔'' قدرے فربی مائل صبیح چہرے والی خاتون جو اس کے سرہانے بیٹھی ہوئی تھیں' آسودہ سے انداز میں بولیں۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کے اردگرد بکھرے ہوئے یہ مہربان چہرے کون تھے؟ وہ یہاں کس طرح پہنچی؟

''کیسا محسوس کر رہی ہو بیٹا؟'' تیکھے تیکھے نقوش والی خاتون چہرے پر محبت سجائے اس سے پوچھ رہی تھیں۔ یکدم اس کی آنکھیں گرم پانیوں سے بھر گئیں۔

''ارے ارے ماما یہ تو رونے لگیں۔'' ایک معصوم سے سترہ اٹھارہ سالہ لڑکی آگے بڑھ کر فربہ اندام خاتون سے مخاطب ہوئی۔

''نہیں بیٹا روؤ نہیں۔ تمہیں چوٹ لگی ہوئی ہے آرام کرو۔ ہاں یہ بتا دو کہ اس وقت کچھ کھانا پینا پسند کرو گی؟''

پھپھو شینا ان کو دودھ گرم کر کے پلائیں۔'' بھاری پروقار آواز پر اس نے پلکوں کی چلمن اٹھا کر آواز کی سمت دیکھا۔ وہ اس کے بالکل سامنے ہی تو بیٹھے تھے۔ ان کی آواز پر روبیہ تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔ پھپھو شینا کی طرح ان کی دونوں بیٹیاں بھی ہر دلعزیز اور ہمدرد طبیعت کی مالک تھیں۔ انیقہ میں تو معصومیت تھی لیکن روبیہ کی طبیعت میں ٹھہراؤ اور بردباری تھی۔

''بیٹا اگر تمہاری طبیعت قدرے بہتر ہو تو کیا تم بتا سکتی ہو کہ تمہارا نام کیا ہے؟ کہاں رہتی ہو؟'' پھپھو شینا نے نرمی سے کہا لیکن ان کے سوال کے جواب میں جو ردعمل ظاہر ہوا وہاں موجود سبھی افراد بوکھلا گئے۔ وہ جو خاموش آنسو بہا رہی تھی ان سوالوں پر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''دیکھیے ..... دیکھیے پلیز خاموش ہو جائیے۔ آپ کی پیشانی پر کافی گہرا زخم ہے۔ اس طرح تو وہ مزید کھل جائے گا اور بلیڈنگ شروع ہو جائے گی۔ پلیز خاموش ہو جائیے۔ تائی امی پلیز انہیں خاموش کروائیں۔'' ڈاکٹر فواد اس کی ظاہری حالت کے پیش نظر قدرے پریشان نظر آ رہے تھے۔

''دیکھیں آپی ..... آپ ہماری بہن ہیں خود کو اکیلا مت سمجھیں۔'' انیقہ آگے بڑھ کر اس کے قریب بیٹھ گئی اور اس کا مرمریں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر سہلاتے ہوئے بولی۔ وہ ان نرم رویوں کی کہانی میں الجھی ہوئی تھی۔ اوپر والے نے اس کی زندگی کی ڈور کو یوں الجھا دیا تھا کہ وہ چاہنے کے باوجود سلجھا نہیں پا رہی تھی۔ جن پتھروں میں وہ محبوس تھی اور ان کا جس زدہ حصار توڑ کر آئی تھی وہ تو اب بھی اس کے

وجود میں گڑے ہوئے تھے۔ وہ کس طرح ان سے پیچھا چھڑا سکتی تھی۔ لیکن اس وقت اس کے اردگرد پھولوں سے نرم، چاندنی جیسے ٹھنڈے رویے تھے۔ خوشبودار لہجے تھے۔ اور وہ ان لہجوں کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے بمشکل اپنے آپ کو بولنے پر آمادہ کیا۔

''میرا نام آریان ہے..... مم..... میرا دنیا میں کوئی نہیں۔'' وہ ایک بار پھر رونے لگی تھی۔ ''ارے..... بس خاموش بھی ہو جاؤ۔ جس کا کوئی نہیں ہوتا اس کا خدا ہوتا ہے۔ تم اپنے آپ کو یہاں محفوظ سمجھو۔ ہم سب کو اپنا سمجھو۔ اکیلی تھی تم اب نہیں ہو سمجھیں۔'' تائی مقسوم اپنے ازلی پیار بھرے لہجے میں نہایت اپنائیت سے گویا تھیں۔

''لو روبیہ بھی آ گئی..... اٹھو شاباش ہمت کرو..... ایک گلاس دودھ ہے پی لو پھر سونے کی کوشش کرنا۔'' پھپھو شینا نے اسے سہارا دے کر بٹھایا اور روبیہ نے دودھ کا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اس نے چند ایک گھونٹ لے کر باقی کا دودھ گلاس میں ہی چھوڑ دیا۔

''اوہو بھئی..... پی بھی لو اب۔'' روبیہ نے گلاس دوبارہ اس کے ہونٹوں سے لگایا۔ تو دو گھونٹ لے کر اس نے منہ موڑ لیا۔

''بس دل نہیں چاہ رہا۔''

''چلو پھر سونے کی کوشش کرو۔ فہدی کوئی دوائی کھانے کی بھی دی۔'' تائی مقسوم نے ڈاکٹر فواد سے پوچھا۔

''نہیں کچھ خاص ضروری تو نہیں اگر یہ اپنی طبیعت بہتر سمجھیں تو بتا دیں میں کوئی پین کلر دے دیتا ہوں۔'' تائی سے بات کرتے کرتے انہوں نے اپنا رخ آریان کی جانب کر دیا۔

''نہیں میں اب ٹھیک ہوں شکریہ۔'' وہ کچھ کترائے سے انداز میں بولی۔

''چلو پھر سب اپنے اپنے کمرے میں چلو آرام کرنے دو اسے۔'' تائی مقسوم حتمی انداز میں کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ تو ان کی تقلید میں روبیہ، اتیقہ اور ڈاکٹر فواد بھی کمرے سے نکل گئے۔ البتہ پھپھو شینا اسے آرام کرنے کی تلقین کرتی ہوئی خود دوبارہ جائے نماز پر بیٹھ گئی تھیں۔ آریان کی نگاہیں ان کے چہرے کو بار بار گرفت میں لے لیتیں۔ ایسا نورانی اور مقدس چہرہ اتنی مہربان طبیعت..... کیا دنیا میں نیکی اب بھی قائم ہے۔ کیا یہی وہ لوگ ہیں کہ جن کے باعث آسمان ہمارے سروں پر چھاتا تانے کھڑا ہے اور زمین نے کسی ماں کی طرح اپنا سینہ فراخ کر کے ہمارے قدموں کو جا بخشی ہوئی ہے۔ ہاں ایسے لوگ ہی درحقیقت سراپا رحمت ہوتے ہیں۔ جنکے وجود سے مترشح ہونے والا نور چاند اور سورج کے قائم رہنے کی دلیل ہے۔ اس کے ذہن میں بہت کچھ گڈمڈ ہو رہا تھا۔ لیکن آنکھیں تکان کے باعث بند ہونے لگی تھیں۔ سو اس نے خود کو نیند کی دیوی کی آغوش کے سپرد کر دیا۔ پھپھو شینا جب اپنا ورد مکمل کر کے اٹھیں تو وہ نہایت گہری نیند میں تھی۔ انہوں نے جھک کر اس کی پیشانی پر آئی پریشان لٹوں کو نرم انگلیوں سے پیچھے کیا اور اس پر کمبل درست کر کے نائٹ بلب جلا کر اپنے کمرے سے ملحقہ گیسٹ روم میں جا کر لیٹ گئیں۔ اس لڑکی کے وجود سے اٹھی مانوس سی خوشبو انہیں بہت کچھ یاد دلا رہی تھی۔ لیکن یہ سب ان کا واہمہ ہی ہو سکتا تھا۔ بھلا ایسا کب ممکن تھا جیسا وہ سوچ رہی تھیں۔ نیند تو ان کی ویسے بھی کم تھی زیادہ تر وقت ذکر و عبادت میں ہی گزرتا تھا۔ لیکن اس وقت جو خیال سوئی کی طرح ان کے ذہن میں چبھ گیا تھا وہ چاہنے کے باوجود اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکی تھی۔ موذن کی پہلی آواز کے ساتھ ہی انہوں نے بستر چھوڑ

دیا۔ ساری رات بستر پر کروٹیں بدلتے گزر گئی تھی۔ نیند کی ایک جھپکی بھی نہیں آئی تھی۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئیں۔ آریان بہت گہری نیند میں تھی۔ انہوں نے ایک لحظہ کو ٹھہر کر اس کے پاکیزہ چہرے کے ایک ایک نقش کو بغور دیکھا۔ ہر نقش ان کے خیال پر مہر تصدیق ثبت کر رہا تھا۔ پھر جیسے وہ یکدم حال کی دنیا میں واپس آ گئیں اور وضو کر کے فجر کی نماز ادا کرنے میں مشغول ہو گئیں۔

☆.....☆.....☆

ڈاکٹر فواد کا گھرانا اچھے خاصے افراد پر مشتمل تھا۔ ان کی فیملی سمیت پانچ فیملیاں ایک ہی وسیع و عریض کوٹھی میں سمٹی ہوئی تھیں۔ سب سے بڑے شفقت تایا اور تائی مقسوم اولاد کی نعمت سے محروم ہونے کے باوجود ہر ایک کے لیے اپنے دل میں بے حد پیار رکھتے تھے۔ ان سے چھوٹے عارب تایا اور شینا پھپھو جنہیں کبھی بچوں نے تائی کہہ کر نہیں پکارا تھا کیونکہ انہیں پھپھو کہلوانا زیادہ پسند تھا۔ ان کی دو بیٹیاں روبیہ اور اتیقہ۔ ان سے چھوٹے بابر چچا اور زاہدہ چچی۔ اظہر اور حسنین۔ سب سے چھوٹے چچا شاکر اور ان کی بیگم حدیقہ تھیں ان کے دو بچے تھے۔ انا اور باصر۔ سب گھر والے الگ الگ پورشنز میں رہتے تھے۔ لیکن کھانا ایک ہی جگہ پکایا اور کھایا جاتا تھا۔ چھوٹی چچی حدیقہ اپنے مزاج اور طبیعت کے باعث فیملی میں کچھ زیادہ ہر دلعزیز نہیں تھیں نہ ہی انہیں کچھ خاص پرواہ تھی۔ البتہ چچاؤں میں آپس میں گاڑھی چھنتی تھی یہی وجہ تھی جو سب مختلف النوع مزاج رکھنے کے باوجود ایک ہی گھر کے مکین تھے۔

اس گھر کو جوڑ کر رکھنے میں دو شخصیات کا ہاتھ زیادہ تھا۔ تائی مقسوم اور پھپھو شینا کا۔ تائی مقسوم تو دور پرے کی رشتہ دار تھیں جبکہ پھپھو شینا، تایا عارب کی سگی چچازاد بھی تھیں۔ سو اس لحاظ سے وہ دگنی اہمیت کی حامل تھیں۔ لیکن انہیں تایا عارب نے وہ مقام نہیں دیا تھا جس کی وہ اہل تھیں اگرچہ سسرال میں ان کے نام کا ڈنکا بجتا تھا۔

☆.....☆.....☆

مسرت جہاں اسم بامسمیٰ تھیں شوخ، چنچل، کھلنڈری، دوشیزگی کی مکمل تصویر۔ حسن ایسا کہ بہار بھی آئے تو پل بھر کو رک کر دیکھے اور دل میں صدر لے کر روانہ ہو جائے۔ لمبے لمبے سیاہ گیسو، بادلوں کو شرماتے ہوئے۔ بڑی بڑی سیاہ گھور آنکھیں جن میں رات کی ساری سیاہی سمٹ آئی تھی۔ دودھیا رنگت جیسے سورج کی پہلی انمول، ان چھوئی کرن نے صبح کا ماتھا چوما ہو۔ پانچ بھائیوں کی لاڈلی بہن۔ بچپن سے ہی اماں بی نے ان کی تربیت پر خاص توجہ دی تھی۔ آنچل سے ڈھکا سر۔ سینے کی اٹھانوں پر حیا کا پلہ۔ چال میں نزاکت اور بولنے میں حلیمی۔ اماں بی جانتی تھیں کہ نجیب الطرفین سادات گھرانے کی بیٹیوں میں کیا خوبیاں ہونی چاہئیں لیکن اس سب کے باوجود انہوں نے کبھی مسرت جہاں پر ضرورت سے زیادہ سختی نہیں کی تھی۔ گھر بھر میں ان کے چنچل قہقہے گونجتے رہتے تھے۔ بھابھیاں ان سے بہت پیار کرتی تھیں۔ بلکہ یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ بھابھیوں نے انہیں اپنے بچوں کی طرح پالا تھا۔

شبیر حسین بہت بڑے ٹرانسپورٹر تھے۔ شہر میں ان کی کئی گاڑیاں چلتی تھیں۔ مسرت جہاں ان کی بھی بے حد لاڈلی تھیں۔ شام گئے وہ جب گھر آتے تھے۔ تو مسرت جہاں ان کے گلے میں بازو ڈالے فرمائشیں کرتے نہ تھکتی تھیں۔ اور انہوں نے کبھی آدھی زبان سے بھی نہ

نہیں کہا تھا۔ دولت کی ریل پیل ہونے کے باوجود اخلاقی برائیاں اس گھر سے کوسوں دور تھیں۔ شاید اس کی وجہ یہی رہی ہو کہ یہ گھرانا خالصتاً اسلامی گھرانا تھا۔ نماز روزے کی پابندی، صدقہ وخیرات کی روایت اس خاندان میں شروع سے چلی آرہی تھی۔ شبیر حسین ماہ رمضان میں کتنے ہی غریب گھرانوں کو پورے پورے مہینے کا راشن ڈلوا کر دیتے۔ ان کی گاڑیوں پر کئی ایسے بچے کام کرتے تھے۔ جن کے آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ لیکن انہوں نے کبھی ان کا حق مارنے کی کوشش نہیں کی۔ اچھا کھلایا۔ اچھا پہنایا۔ وقت پر مزدوری دی۔ یہی وجہ تھی کہ خدا نے انہیں سعادت مند اولاد دی تھی۔ وہ اپنے بچوں سے پیار بھی بہت کرتے تھے۔ لیکن جہاں اصول کی بات آتی تھی وہاں ان کا رویہ اور برتاؤ بے لچک ہو جاتا تھا۔ اماں بی ان کی مزاج آشنا تھیں۔ عاجز اور منکسر المزاج ہونے کے باعث ان دونوں کی بہت اچھی نبھ رہی تھی۔ بلکہ شبیر حسین اپنی بیوی کا بہت احترام کرتے تھے۔ ان دنوں ساون کی آمد آمد تھی۔ گھنگھور گھٹائیں آسمان کو اپنی سرمئی آغوش میں سمیٹتی' ادھر سے ادھر چکراتی رہتی تھیں لیکن ابھی ساون کی پہلی بارش نہیں ہوئی تھی۔ مسرت جہاں نے ہارسنگھار کے درخت کے ساتھ جھولا باندھ لیا۔ ساری ساری شام ان کی جھولا جھولنے گزر جاتی۔ اماں بی بھی اپنی چارپائی درختوں کے نیچے لا بچھاتیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی نم آلود ہوا نے گرمی کا زور توڑ دیا تھا۔ حلقے جھلستے درودیوار کو بھی ٹھنڈک میسر آگئی۔ مسرت جہاں شام کے وقت وسیع دالان میں پانی کا چھڑکاؤ کر دیتی تھیں۔ پھر تو گویا زمین کی سوندھی سوندھی خوشبو ایک خمار کی طرح فضا پر طاری ہو جاتی تھی۔ یوں جیسے زمین اپنے بارآور ہونے کے خواب دیکھنے لگتی۔ اس کی نادیدہ آنکھوں میں بہار کے سپنے ہلکورے لینے لگتے۔ آسمان کی روشنیاں اس کی گود بھرنے کو بے چین اور وہ بارش کی بوندوں کو ماں کی طرح آغوش میں لینے کو بے تاب۔

اس دن مسرت جہاں جھولا جھولنے کے لیے ہارسنگھار کے درخت کی پناہوں میں جانے لگیں تو یکدم فلک راجہ کو ان پر ٹوٹ کر پیار آیا۔ اس کی آنکھوں میں بہتے خوشی کے ٹھنڈے آنسوؤں نے بڑھ کر مسرت جہاں کے صبیح رخساروں کی بلائیں لیں۔ انہوں نے جھٹ سے سر اٹھایا۔ گھور گھٹائیں بڑے مدھ بھرے انداز میں انہیں تک رہی تھیں۔ یوں لگا وہ برآمدے تک نہ پہنچ پائیں گی اور بادل ان کا راستہ روک لیں گے۔ انہوں نے بھاگ کر درخت کے نیچے سے چارپائی اٹھائی اور تیز تیز قدموں سے چلتی برآمدے تک پہنچیں۔ چارپائی بچھا کر انہوں نے کچن میں جھانکا۔ بڑی بھابھی رات کے کھانے کے لیے سالن بنانے میں مصروف تھیں۔ شینا بھابھی برتن دھو رہی تھیں۔

''بھابھو! بادل آگئے۔'' جملہ کسی چہکار کی صورت ان کے حلق سے نکلا تھا۔ دونوں نے پلٹ کر دیکھا۔

''پگلی.....'' بڑی بھابھی مسکرا کر دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئیں۔

''ارے یہ کوئی چھوٹی موٹی خبر ہے کیا..... باہر نکل کر تو دیکھیں۔ کیا منظر ہے۔ اف..... جی چاہتا ہے کسی پرندے کی طرح اڑ کر بادلوں تک جاؤں انہیں چھو کر آؤں اور پھر آ کر آپ کو بتاؤں کہ بادل کیسے ہوتے ہیں۔'' وہ آنکھیں میچے خود ہی اپنے کہے لفظوں سے محظوظ ہو رہی تھیں۔

''ارے پاگل لڑکی! بادل صرف دھواں ہوتے ہیں اور کچھ نہیں۔ ان کا سارا لطف اس پانی میں ہے جو ان سے برستا ہے۔ بادل تو

بس یہاں سے دیکھنے میں ہی اچھے لگتے ہیں۔" شینا بھابھی ان کی باتوں پر مسکراتے ہوئے گویا انہیں سمجھا رہی تھیں۔

"جانتی ہوں! لیکن حسن کو محسوس کرنے میں بھلا ہرج بھی کیا ہے۔" انہوں نے مصنوعی ناراضگی سے شینا بھابھی کی طرف دیکھا۔

"ہرج ہے! کیوں نہیں ہے؟ حسن اگر موجود ہو تو اسے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ سراب تک پہنچنے کا خواب ہمیشہ تعبیر کو روتا ہے۔ پگلی! تم ابھی بچی ہو۔ زمانے کے سرد و گرم سے نا آشنا۔ تم کیا جانو! جو چیزیں دور سے دیکھنے میں بھلی لگتی ہیں جب ہاتھوں میں آجاتی ہیں تو ان کا اصل کتنا بے رنگ، کتنا پھیکا ہوتا ہے۔" شینا بھابھی کے لہجے میں ہلکا سا ملال گھل گیا۔ بھابھی مقسوم نے پلٹ کر ان کی طرف دیکھا ان کی نگاہوں میں شینا بھابھی کے لیے محبت اور شائد سمجھوتے کا پیغام تھا۔ اور یہ پیغام تو وہ پچھلے دو سال سے سمجھ رہی تھیں۔ وہ یہاں سمجھوتہ ہی تو کر رہی تھیں۔ ان کے والد بلال حسین کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد ان کے تایا شبیر حسین نے انہیں اپنے بڑے سے چھوٹے بیٹے عارب کے لیے مانگ لیا تھا۔ سب جانتے تھے کہ عارب بھائیوں میں مزاجاً تو سب سے اچھا ہے۔ لیکن اس کی ایک دو عادات ایسی تھیں جن کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن شینا بھابھی پچھلے دو سال سے نباہ کر رہی تھیں۔ اور حقیقت حال کا سوائے بھابھی مقسوم کے کسی کو علم نہیں تھا۔ اس وقت بھی بھابھی شینا نے فوراً اپنے محسوسات کو کنٹرول کیا اور موضوع بدل دیا۔

"مسرتی! بارش تو برسنے بھی لگ گئی۔" کچن کی کھڑکی سے باہر کا سماں چند ہی لمحوں میں جل تھل ہو گیا تھا۔

"بھابھی ماں! ایسے موسم میں بھلا کیا کیا جاتا ہے؟" ان کے لہجے پر فرمائش کا عنصر غالب تھا۔ بھابھی مقسوم نے مصنوعی انداز میں انہیں گھورا۔

"چٹوری کہیں کی! تم چل کر اماں بی کے پاس بیٹھو میں ابھی پکوڑے بنا کر لاتی ہوں۔" اور مسرت جہاں تو جیسے من کی مراد بن کہے پوری ہو جانے پر نہال سی ہو گئیں۔ چھاجوں چھاج برستا مینہ۔ درختوں کے مکھ دھو دھو کر زمین کو سیراب کر رہا تھا۔ پرندے کچھ دیر لطف اٹھانے کے بعد اب شاید اپنے گھونسلوں میں دبک گئے تھے۔ کہ آسمان پر سوائے گھٹاؤں کے اور کچھ نہ تھا۔ ہاں دھرتی کے رنگ نکھر کر اپنی نیرنگیاں بکھیرنے لگے تھے۔

"اماں بی! بارش میں نہانے کو جی چاہ رہا ہے۔" مسرت جہاں اٹھلا کر بولیں۔ "بیٹا! ساون کی پہلی بارش ہے آسمان کی میل اتارنے کو ہوتی ہے۔ اگلی بار خوب دل بھر کے نہانا۔ یہ بارش تو سو بیماریاں لاتی ہے۔" اماں بی کے سمجھانے پر وہ مان گئیں۔ "اماں بی! کیا آسمان بھی میلا ہوتا ہے۔"

"ہاں! کیا بارش سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ کیسا تھا اور اب دیکھو کیسا ہے؟" اماں بی کے کہنے پر انہوں نے غور سے دیکھا تو قائل ہو گئیں۔

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں اماں بی! اب آسمان صاف لگ رہا ہے۔

"اماں بی! رات کے کھانے میں میٹھا کیا بنایا جائے؟" بھابھی مقسوم اماں بی کے قریب آ کر بیٹھ گئیں۔

"ارے بیٹا! جو دل چاہے بنا لو۔ میرے شاکر اور اظہر تو کھیر پسند کرتے ہیں۔ باقی سب سے بھی پوچھ لو۔"

''اماں بی! کھیر ہی ٹھیک ہے سبھی شوق سے کھالیں گے۔'' شینا بھابھی ہاتھ میں پکوڑوں کی پلیٹ تھامے آ گئی تھیں۔

''چلو! پھر تیاری کرتے ہیں۔'' بڑی بھابھی اٹھ گئیں۔ اماں بی بھی مغرب کی نماز پڑھنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ لیکن مسرت جہاں وہیں کرسی پر بیٹھی بارش سے لطف اندوز ہوتی رہیں۔ پتا نہیں کیا بات تھی۔ بارش انہیں یونہی لگتی تھی جیسے آسمان کوئی سخی تھا جو بنا مانگے اپنے دامن کے موتی لٹاتا پھرتا تھا۔ وہ برآمدے کے ستون سے لگ کر کھڑی ہو گئیں اور ہاتھ کا دامن پھیلا کر وہ موتی سمیٹنے کی کوشش کرنے لگیں۔

اسی پل بلیک لینڈ کروزر گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔ پورچ میں آ کر رکی اور اس میں سے شبیر حسین اپنے شاہانہ طمطراق کے ساتھ باہر نکلے۔

''بیٹا رانی! آپ یہاں بارش میں کیا کر رہی ہیں۔'' یہ ان کا مخصوص انداز تھا۔

''وہ ابا میاں! موسم بہت اچھا تھا اس لیے یہاں کھڑے ہو کر بارش دیکھنے کو دل چاہا۔'' انہوں نے جواب دیا تو وہ سر ہلا کر آگے بڑھ گئے۔ مسرت جہاں بھی پھر وہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہریں۔ اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ شاید وہ موسم کی ٹھنڈک اپنے وجود میں اتار چکی تھیں۔

☆.....☆.....☆

اس کی آنکھ کسی کھٹکے سے کھلی تھی۔ چند ثانیوں کو تو اسے احساس ہی نہ ہوا کہ وہ کہاں ہے۔ اجنبی اور نامانوس جگہ۔ وسیع و عریض بیڈ پر کمبل اوڑھے اس کا وجود ایک پل کو اسے خود بھی بیگانہ سا لگا۔ ماحول میں کچھ ہلچل تھی۔ کوئی چہل پہل تھی۔ چند نسوانی آوازیں تھیں۔ جو غالباً ساتھ والے کمرے سے آ رہی تھیں کیونکہ جس کمرے میں وہ تھی۔ اس کے علاوہ وہاں کوئی موجود نہیں تھا۔

''ماما.....'' آپ روبی کو سمجھا لیں اس نے پھر میرا پین نکال لیا۔'' ایک آواز آئی قدرے جھنجلاتی ہوئی۔

''اوہو بیٹا! اس میں لڑنے والی تو کوئی بات نہیں۔ الماری میں دیکھو۔ شاید کوئی پین رکھا ہو۔'' بہت بردباری سے جواب دیا گیا۔

''ماما جھگڑے کی بات نہیں۔ بات اصول کی ہے۔ جب وہ خود اپنی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگانے دیتی۔ تو میری چیزیں کیوں ادھر ادھر کرتی ہے۔'' وہ آواز ہنوز غصے کا اظہار بنی ہوئی تھی۔ ''ٹھیک ہے! اب بند کرو صبح صبح اس طرح لڑنا۔ سمجھا دونگی اسے میں۔ تم آ کر ناشتہ کر لو کالج سے دیر ہو جائیگی۔'' جواب میں قدرے خاموشی چھا گئی۔ جسکا مطلب یہ تھا کہ ماں کی بات مان لی گئی تھی۔ وہ خاموشی سے لیٹی ہوئی تھی۔ ابھی تک اس گھر کے مکینوں میں سے کوئی بھی اس کے سامنے نہیں آیا تھا۔ کافی دیر گزر گئی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس گھر کے لوگ اسے کسی بے جان شے کی طرح اس کمرے میں رکھ کر بھول گئے تھے۔ کس قسم کے لوگ تھے؟ وہ ٹھیک طرح جان نہیں پائی تھی۔ اتنا اسے یاد تھا کہ ان سب کے رویوں میں اس کے لیے سختی اور اجنبیت نہیں تھی۔ ملائمت اور اپنائیت تھی اور یہی احساس اس کے اندر سکون، وقتی سکون بن کر اترا تھا۔ اور طویل مسافت کے بعد جس نے اس کے جسم سے زیادہ اس کی روح کو تھکایا تھا۔ اسے نیند آ گئی تھی۔ کل کیا ہونا تھا؟ کل کیا ہو سکتا تھا؟ سب کچھ وقتی طور پر بھلا کر وہ مطمئن سی ہو گئی تھی۔

''ارے! تم کب سے جاگ رہی ہو؟'' فربہی مائل خوبصورت سی خاتون اس کے قریب آئیں۔ شاید یہ انہی کا کمرہ تھا جہاں وہ براجمان تھی۔

''میں..... میں تو کافی دیر سے جاگ رہی ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

''اوہو سوری بیٹا۔ دراصل صبح صبح میری بیٹیاں گھر کو میدان کارزار بنائے ہوئے ہوتی ہیں۔ سب کچھ بھول جاتا ہے کیا کرنا ہے۔ کیا نہیں کرنا۔ ایک منٹ باتیں بعد میں مجھے یقین ہے تمہیں بھوک لگ رہی ہوگی۔ وہ سامنے واش روم ہے تم فریش ہو جاؤ میں اتنی دیر میں ناشتہ لے آتی ہوں۔'' وہ کمرے سے باہر نکل گئیں۔ آریان کمبل ایک طرف پھینک کر اٹھ گئی۔ باتھ روم کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تو مکینوں کی امارت اور خوش ذوقی سے مرعوب سی ہوگئی۔ ہلکے سرمئی رنگ کی ٹائلز کے ساتھ باتھ روم فٹنگ۔ واش بیسن۔ چیئر کموٹ۔ باتھ ٹب ہر چیز ہلکے سرمئی رنگ کی تھی۔ اس نے واش بیسن کے ساتھ لگے بڑے سے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ گلابی رنگت صرف ایک دن اور رات میں ہی مرجھا کر سرسوں کے پھول سی ہوگئی تھی۔ سیاہ بالوں کی الجھی ہوئی لٹیں چہرے کے گرد بے ترتیبی سے جھول رہی تھیں۔ پیشانی پر دائیں طرف بھنوؤں سے تھوڑا اوپر زخم کی بینڈیج تھی۔ اس نے ہلکے ہلکے دو چار چھپکے سے مارے بال سمیٹ کر یونہی جوڑا سا باندھ لیا۔ اور تولیئے سے منہ خشک کرتی باتھ روم سے باہر آگئی۔ سامنے ہی وہ خاتون ناشتے کی ٹرے بیڈ پر سجائے اسے محو انتظار ملیں۔

''آؤ! بیٹھو اور تکلف برطرف رکھ کر ڈٹ کر ناشتہ کرو۔ فہدی ابھی تھوڑی دیر میں آئے گا تمہیں چیک کرنے کے لیے۔ ویسے وہ رات بھی کہہ رہا تھا کہ کوئی ایسی میجر انجری نہیں ہے۔ جلدی امپروو کر لوگی تم۔'' یہ بولتے بولتے یکدم رک گئیں پھر کچھ سوچ کر دوبارہ گویا ہوئیں۔ میرا خیال ہے کہ جب سے تم جاگی ہو اس وقت سے مسلسل میں ہی بولے جا رہی ہوں تم نے کیا نہ بولنے کی قسم کھا رکھی ہے۔'' وہ اب مسکرا رہی تھیں۔

''آنٹی! میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں۔ کیا کہوں۔ یوں بھی آپ بولتی زیادہ اچھی لگتی ہیں۔'' اس نے ان کی جانب مسکرا کر دیکھا تھا۔ جانے کیوں ان کی موجودگی اور ان کی باتوں کی وجہ سے وہ خود کو کسی حد تک ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔

''ہوں! تو باتیں کرنے کا گر جانتی ہو۔ ویسے میری روبیہ تمہاری طرح ہے۔ خاموش خاموش۔ سلجھی بلکہ کبھی کبھی کچھ الجھی الجھی سی لیکن اس سے چھوٹی انیقہ تو ایسی ہے جیسے کسی باتیں کرنے والے کھلونے کو چابی دے کر چھوڑ دیا جائے۔'' وہ بہت محبت بھرے انداز میں کہہ رہی تھیں۔ آریان کی پلکوں پر نمی سی دم توڑ گئی۔

''اماں! تم..... تم بھی تو یونہی پیار کرتی تھیں مجھ سے..... چھوٹے چھوٹے نوالے بنا کر کھلانے سے لیکر تعلیم کے میدان تک میرے ہمقدم رہیں۔ پھر..... پھر آخر..... اب کیوں دوریاں حائل ہوگئیں ہمارے درمیان..... کیوں تمہاری محبت بھری آنکھیں مجھے نظر نہیں آتیں..... تمہاری مامتا بھری آغوش کیوں دور ہوگئی مجھ سے۔'' نوالہ جیسے اس کے حلق میں اٹک گیا تھا۔ بالکل ایسے کہ اسے لگا کہ بس اس کی آخری سانسیں ہیں۔ شینا پھپھو کی نظریں اس کے چہرے پر پڑیں۔

''ارے..... ارے تمہیں کیا ہوا۔'' تیزی سے سرخ پڑتی رنگت اور آنکھوں سے بہتے پانی نے انہیں بوکھلا دیا۔ ان کی سمجھ میں اور تو کچھ نہ آیا گلاس پانی کا بھر کر اس کے منہ سے لگا دیا۔ ایک دو گھونٹ پی کر اس نے آنسوؤں کے گولے کو حلق سے نیچے کیا۔ لیکن چہرے

کے تاثرات بدستور ویسے ہی تھے۔

''دیکھو بیٹا! تمہیں جو پریشانی ہے۔ ہم سے کہو یقین کرو ہم تمہاری پوری مدد کریں گے۔ لیکن تم تنہا اس طرح پریشان ہوتی رہو گی تو بھلا کیا حاصل.....؟ شینا پھپھو جیسے اسے حوصلہ دیتے ہوئے بولیں۔ لیکن اس کی کہانی ایسی ہی تھی جو اس کے دریدہ دل میں ہی پنہاں رہتی تو اچھا تھا۔ وہ ڈوب رہی تھی۔ اس لیے تنکے کا آسرا چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کا دماغ مسلسل ادھیڑ بن میں لگا ہوا تھا۔ ظاہر تھا کہ وہ یہاں مستقل تو رہنے نہیں آئی تھی۔ اسے سوچنا تھا کہ آگے کیا قدم اٹھایا جائے کہ وہ حوادث زمانہ سے محفوظ ہو جائے۔ فی الحال تو یہی پناہ ہی اس کے لیے غنیمت تھی۔

''نہیں آنٹی.....کوئی پریشانی نہیں۔'' وہ جبراً مسکرائی۔ ''دراصل آپ کی باتیں سن کر مجھے اپنی امی کی یاد آ گئی تھی۔''

اس کی بات پر انہیں یقین نہیں آیا تھا۔ وہ مہربان آنکھوں والی عورت ساری رمزیں جانتی تھی۔ ضرور اس لڑکی کے بیک گراؤنڈ میں کوئی ایسی بات تھی۔ جو یہ اپنے بارے میں بات کرتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔ لیکن وہ اصرار کر کے اس کے زخموں کو کریدنا نہیں چاہتی تھیں۔

''کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟'' انہوں نے آواز کی سمت دیکھا ڈاکٹر فواد اپنی سحر انگیز شخصیت کے ساتھ دروازے میں موجود تھے۔

''ارے فہدی! میرے کمرے میں آنے کے لیے تمہیں اجازت کی ضرورت کب سے پڑنے لگی۔''

''پھپھو! اب یہ صرف آپ کا کمرہ نہیں ہے ناں!'' انہوں نے کنکھیوں سے آریان کی طرف دیکھتے ہوئے قدرے شرارت آمیز انداز میں کہا۔

''دیکھو بھئی! میرے کمرے میں کوئی اجنبی نہیں ہے۔ آریان بھی روبیہ، انیقہ کی تیسری بہن ہے سمجھے۔'' انہوں نے محبت سے کہا۔ آریان کا سر جھکا ہوا تھا۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ اس پل شینا پھپھو کے چہرے پر جو خوبصورت تاثر سمٹا ہوگا۔ وہ دیکھ کر ماں کی ہوک کم ہو جائے گی۔

ذرا اپنی نبض چیک کروایئے۔'' جھکے ہوئے سر کے سامنے بھاری مردانہ ہاتھ نظر آیا۔ اس نے خاموشی سے دایاں ہاتھ آگے کر دیا۔ ان کی انگلیاں اس کی کلائی پر متحرک ہوئیں تو ایک لمحے کو وہ حیا آمیز جھجک کا شکار ہو گئی۔ ان کی نظریں گھڑی کی سوئیوں پر تھیں۔

''شی از پرفیکٹلی آل رائٹ پھپھو!'' وہ شینا پھپھو سے مخاطب تھے۔

''فہدی! ذرا اس کا زخم بھی دیکھ لو.....'' پھپھو کے کہنے پر انہوں نے آگے بڑھ کر بینڈیج کھول دی۔ خون میں تر روئی کو نہایت احتیاط اور نرمی سے زخم سے الگ کیا۔ پیشانی پر ایک انچ لمبا اور تقریباً دو سینٹی میٹر گہرا زخم کا نشان تھا۔ خون رسنا بند ہو چکا تھا۔ انہوں نے ٹیوب نکال کر زخم پر دوا لگائی۔

''پٹی کی اب ضرورت نہیں ہے۔ یہ ٹیوب رکھ لیں۔ دن میں تین چار بار لگائیں گی تو ایک آدھ دن میں کافی بہتر ہو جائیگا۔ اچھا پھپھو میں کلینک چلوں۔ دیر ہو رہی ہے۔'' وہ پہلے آریان سے پھر پھپھو سے بات کر کے باہر نکل گئے۔ آریان اس سارے عرصے میں

خاموش رہی تھی۔ پھپھو شینا بھی اسے لیٹنے کی تلقین کرتی ہوئی برتن اٹھا کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔ کمرے میں اب وہ تھی یا پھر بگولوں کی طرح چکراتا ہوا اس کا ماضی، عفریت کی طرح منہ کھولے سامنے کھڑا حال۔ اور بے اماں مستقبل۔

☆.....☆.....☆

آج ''سادات نگر'' میں جیسے رنگ ہی رنگ اترے ہوئے تھے۔ مسرت جہاں نے فرسٹ کلاس پوزیشن لی تھی میٹرک میں۔ اماں بی کے تو فخر کے مارے پیر ہی زمین پر نہ ٹک رہے تھے۔ ان کی آنکھیں جگمگا رہی تھیں اپنی ہونہار بیٹی کی کامیابی پر۔ بھائی الگ بے حد خوش تھے۔ سوئے اتفاق سب ہی گھر پر موجود تھے۔ شام کی چائے کے انتظار میں سب درختوں کے نیچے کرسیاں بچھائے بیٹھے تھے۔ جب کرمو نے کوئی رجسٹری لا کر مسرت جہاں کے ہاتھ میں تھمائی۔

''چھوٹی بی بی! باہر ڈاکیے نے یہ کاغذ دیا ہے اس پر دستخط کر دیں۔'' مسرت جہاں نے دستخط کر کے وہ کاغذ اسے تھمایا اور ابھی لفافہ کھولنے ہی لگی تھیں کہ شاکر نے اچک لیا۔ لفافہ کھول کر مارکس شیٹ پر نظر دوڑائی۔

''چچ..... چچ..... پانچ بھائیوں کی لاڈلی بہن، اور اس بری طرح فیل..... افسوس صد افسوس..... ہماری تو ناک کٹوا دی تم نے۔'' سنجیدہ صورت لیے وہ مسرت جہاں سے ہمکلام تھا۔

''کیا مطلب.....؟ اتنے اچھے پیپر ہوئے تھے میرے..... مجھے دکھائیں مارکس شیٹ.....'' وہ روہانسی ہو کر بولیں اچک اچک کر خود سے دو فٹ لمبے شاکر حسین سے مارکس شیٹ چھیننے کی کوشش کرنے لگیں۔

''ارے کیوں ہماری بٹیا رانی کو ستاتے ہو..... بتا دو کیا نتیجہ نکلا؟ ابا میاں کی مداخلت نے شاکر حسین کو مزید شرارت سے باز رکھا اور انہوں نے مصنوعی رونی صورت بنا کر سند مسرت جہاں کے ہاتھ میں دے دی۔ مارکس شیٹ پر نگاہ ڈالنے کے بعد پہلے تو مسرت جہاں کی آنکھیں حسرت سے پھیلیں یوں کہ رینگ کر کانوں سے جا لگیں۔ پھر ایک فلک شگاف چیخ ان کے شنگرفی ہونٹوں سے بلند ہوئی۔ کاغذ ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گیا اور پھر جو انہوں نے چھکوں چھکوں رونا شروع کیا تو مانو اماں بی اور بھابھیوں کے تو ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے۔

''ارے بچی! رہنے دو کوئی بات نہیں..... پھر امتحان دے دینا یوں رونے سے بھلا اب کیا حاصل!'' اماں بی اس کا سر سینے سے لگائے تسلی آمیز انداز میں کہہ رہی تھیں۔

''ارے اماں بی! کیوں دل چھوٹا کرتی ہیں۔ ہم نے تو پہلے ہی عرض کی تھی کہ ان تلوں میں تیل نہیں۔ آپ ہی کو شوق چرایا تھا۔'' اظہر بھائی نے چھیڑا تو مسرت جہاں نے شاکی نظروں سے ان کی طرف دیکھا اور تنک کر بولیں۔

''یہ آنسو غم کے نہیں خوشی کے ہیں۔ دشمن جلتے رہیں۔ اماں بی ہم پاس ہو گئے ہیں ساڑھے آٹھ سو میں سے ساڑھے چھ سو نمبر لیے ہیں۔'' وہ اظہر بھائی کو زبان دکھا کر چڑا رہی تھی۔ اماں بی تو خوشی سے نہال ہو گئیں۔ جھٹ سے بڑھ کر ان کی پیشانی چوم لی۔ ابا میاں نے اسی وقت جیب سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر ان کے ہاتھ پر دھرا۔ شفقت بھائی اور عارب بھائی دونوں زمینوں پر گئے ہوئے تھے۔ بابر

بھائی نے کہا کہ جوان کی لاڈلی بہن فرمائش کرے گی وہ پوری کریں گے۔

''تو ٹھیک ہے بابر بھائی! مجھے کالج میں ایڈمشن دلا دیں۔'' مسرت جہاں دلار سے بولیں تو بابر بھائی ایک لحظہ خاموش ہو کر ابا میاں کی صورت دیکھنے لگے۔ جن کے چہرے پر مسرت جہاں کی فرمائش سن کر سنجیدگی سی طاری ہو گئی تھی۔ گھر بھر میں میٹرک سے آگے صرف اظہر بھائی اور شاکر ہی گئے تھے۔ اب مسرت جہاں بھی اس میدان کارزار میں اترنا چاہتی تھیں۔ اماں بی بھی کچھ خاموش نگاہوں سے مسرت جہاں کو دیکھنے لگیں۔

''کیا ہوا؟..... ابا میاں..... کیا میں نے کچھ غلط کہہ دیا..... ابا میاں! اتنے اچھے مارکس آئے ہیں میرے، کسی بھی اچھے کالج میں آسانی سے ایڈمشن مل جائے گا۔'' بات یہ نہیں ہے بیٹا جی! ہم جانتے ہیں کہ آپ کا ذہن بہت اچھا ہے۔ تعلیمی ریکارڈ بھی قابل تعریف ہے لیکن ہمیں افسوس ہے کہ ہم آپ کو آگے پڑھنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔'' ابا میاں کے حتمی انداز نے پل بھر کو ماحول پر سکوت طاری کر دیا۔ مسرت جہاں کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ شاید انہیں توقع نہیں تھی کہ ابا میاں یہ فیصلہ صادر کریں گے۔

''لیکن کیوں ابا میاں.....؟'' بہت دھیمی آواز میں انہوں نے کمزور سا احتجاج کیا۔

''اس لیے کہ بیٹیاں گھر کی چار دیواری کے اندر اچھی لگتی ہیں۔'' ابا میاں یہ کہہ کر اٹھ گئے تھے اور اپنے ساتھ ساتھ خوشیوں کے سارے رنگ بھی سمیٹ کر لے گئے تھے۔ آہستہ آہستہ کرسیاں خالی ہونے لگیں مقسوم بھابھی اور شینا بھابھی اٹھ کر کچن کی طرف چل دیں۔ اظہر بھائی کسی دوست سے ملنے نکل کھڑے ہوئے اور شاکر اپنے کمرے کو چل دیا۔ اب وہاں صرف اماں بی تھیں یا پھر بابر بھائی..... مسرت جہاں نے عجیب سے انداز میں ان دونوں کی طرف دیکھا۔

''اماں بی..... ابا میاں کیا سمجھتے ہیں مجھے..... کیا ان کا یہ خیال ہے کہ پڑھ لکھ کر میں اس خاندان کی ذلت کا باعث بنوں گی..... اماں بی..... کیا میں نہیں جانتی کہ کن حدود کا تعین کیا گیا ہے ہمارے خاندان میں لڑکیوں کے لیے۔'' وہ بولتی ہوئی ان کے قریب نیچے بیٹھ گئیں ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔

''اماں..... مجھے اجازت لے دیجئے..... میں وعدہ کرتی ہوں کبھی ان حدود کو پار نہیں کروں گی جو میرے لیے مقرر کی جائیں گی۔ پلیز اماں بی..... ابا میاں کو منا لیں۔'' ان کے لہجے اور آنکھوں میں التجا تھی۔

''بیٹا! تم اچھی طرح جانتی ہو، تمہارے ابا میاں ایک بار جو فیصلہ کر لیں کبھی اس سے ہٹتے نہیں ہیں..... انہوں نے کچھ سوچ کر ہی ایسا کہا ہوگا۔ وگرنہ وہ تمہارا دل کبھی نہیں دکھا سکتے۔'' انہوں نے مسرت جہاں کو سمجھانا چاہا۔

''اماں بی..... صرف ایک بار کوشش کر کے دیکھیں۔ ممکن ہے آپ کی بات مان جائیں وہ۔'' مسرت جہاں نے ہمت نہیں ہاری تھی۔

''ٹھیک ہے۔ ایک بار بات کر کے دیکھ لیتے ہیں۔'' بابر بھائی بھی مسرت جہاں کے ہمنوا بن گئے۔ اماں بی خاموشی سے دونوں کی طرف دیکھ رہی تھیں لیکن ان کا ذہن کہہ رہا تھا کہ لفظ رائیگاں جائیں گے۔ وہ ان کے شریک حیات تھے۔ زندگی کی بتیس، تینتیس

بہاریں ان کے سنگ دیکھی تھیں انہوں نے..... ان سے زیادہ بہتر بھلا کون جان سکتا تھا کہ شبیر حسین جس قدر نرم دل رکھتے تھے اندر سے چٹان کی طرح سخت اور مضبوط تھے۔ ان کے فیصلے شروع سے ہی مقدم جانے جاتے تھے۔ کسی میں جرأت نہیں تھی کہ کوئی فیصلے میں ترمیم کی خواہش کرتا یا ان کی ماننے میں کوئی عذر لنگ کرتا۔ خود اماں بی نے کبھی ان کے جلال کو آواز دینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ جو کچھ انہوں نے کہا فوراً تسلیم کر لیا۔ شاید اسی لیے ان کی اچھی بھی تھی۔ لیکن اب مسرت جہاں کی فرمائش سن کر وہ مخمصے میں پڑ گئی تھیں۔ اتنا تو وہ جان گئی تھیں کہ جو فیصلہ انہوں نے کر لیا ہے وہ بدلے گا نہیں..... لیکن بیٹی کا دل رکھنے کی خاطر انہوں نے ابا میاں سے بات کرنے کی ٹھان لی۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد جب سب اپنے اپنے کمروں کو سدھار گئے اور ابا میاں حسب معمول کچھ دیر کے لیے اسٹڈی روم میں جا بیٹھے تو اماں بی بھی ان کے پیچھے اسٹڈی روم میں چلی آئیں۔

''کیا بات ہے زہرہ خاتون..... آپ کچھ پریشان ہیں۔'' ابا میاں نے خاموش بیٹھی اماں بی سے پوچھا۔ ان کے اس طرح آ کر [illegible] لیکن ان کی تا [illegible] لہجہ نہیں رہیں۔

''آپ کچھ کہنا چاہتی ہیں؟'' انہوں نے جیسے حوصلہ آمیز انداز اپنایا۔

''شاہ جی! ساری زندگی آپ نے جو کہا..... میں نے تسلیم کیا۔ کبھی آپ کی کسی بات کسی حکم سے سرتابی کی جرأت نہیں کی۔''

''تو آپ کو تجدید کی ضرورت کیوں پیش آ گئی۔'' ابا میاں نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا۔

''اس لیے کہ آج پہلی بار آپ سے کچھ مانگنے آئی ہوں۔ سوچتی ہوں ایسا نہ ہو کہ دست سوال دراز کرنے کے بعد خالی لوٹ آنے کا پچھتاوا مل جائے۔''

''کیا مطلب؟..... کیا آپ ہم سے کوئی ایسی چیز مانگنا چاہتی ہیں۔ جس کی قدرت ہم نہیں رکھتے۔'' ابا میاں سیدھے ہو بیٹھے تھے۔ کتاب جو ان کے ہاتھ میں تھی انہوں نے بند کر کے سامنے ٹیبل پر رکھ دی اور پوری طرح اماں بی کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''نہیں قدرت تو رکھتے ہیں..... لیکن شاید وہ چیز آپ دینا نہ چاہیں۔'' اماں بی کا انداز انہیں الجھائے جا رہا تھا۔

''زہرہ خاتون! یہ آج آپ کس انداز میں بات کر رہی ہیں۔ جو بھی کہنا ہے کہہ دیجیے۔ یقین جانیے اگر اس چیز پر ہمارا اختیار ہوا۔ آپ کی فرمائش پوری کرنے کی جرأت ہم میں ہوئی تو بخدا انکار نہیں کریں گے۔''

''میں آپ سے یہ کہنا چاہتی ہوں..... کہ مسرت جہاں زمانے کی اونچ نیچ، اپنا اچھا، برا سمجھتی ہے۔ عزت، ذلت کا خیال رکھ سکتی ہے۔ اس کی آرزو ہے کہ اسے آگے پڑھنے دیا جائے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ اس میں ایسی قباحت بھی نہیں۔ آخر لوگوں کی بیٹیاں سکولوں کالجوں میں پڑھ ہی رہی ہیں۔''

''ان لوگوں میں اور ہم میں بہت فرق ہے زہرہ خاتون! ہم آل نبیؐ اولاد علیؑ ہیں۔ جن کی مستورات نے سورج سے بھی پردہ کیا

تھا۔ ہم کس طرح مسرت جہاں کو کھلے منہ کالج آنے جانے کی اجازت دیں۔ ہم ان کی ایسی بے پردگی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ انہوں نے پڑھنا ہے تو ہم انہیں کتابیں منگوا دینگے۔ گھر بیٹھ کر پڑھیں اور پیپر دے دیں۔"

"شاہ جی! کالج میں جا کر پڑھنے اور خود تیاری میں بہت فرق ہے۔ پھر وہ جو مضامین لینا چاہتی ہے وہ ایسے گھر بیٹھے نہیں پڑھے جا سکتے۔"

"زہرہ خاتون! زندگی کے اتنے سال گزار کر بھی آپ سمجھ نہیں پائیں کہ ہمارا مزاج کیا ہے؟ ہم کیا چاہتے ہیں۔ افسوس صد افسوس ہم اور اب کیا کہہ سکتے ہیں جب زندگی کا ساتھی ہی سمجھ نہ پائے۔ انہوں نے میز پر سے کتاب اٹھالی تھی۔ یہ گویا اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ اب اس موضوع پر مزید گفتگو نہیں کرنا چاہتے۔ اماں بی کو پہلے ہی جانتی تھیں کہ وہ اپنا فیصلہ کسی طور نہیں بدلیں گے۔ وہ خاموشی سے ان کے پاس سے اٹھ گئیں۔ کچھ ملول سی تھیں کہ صبح مسرت جہاں کے پوچھنے پر کیا کہیں گی؟ اپنے کمرے میں آتے ہوئے انہوں نے مسرت جہاں کے کمرے کی بتی جلتے دیکھی تھی۔ وہ ان کے دل کی بے چینی کو جان گئیں مسرت محنتی تھیں۔ لائق تھیں اور پڑھائی کی شوقین بھی۔ خود اماں بی واجبی سا پڑھی لکھی ہوئی تھیں لیکن تعلیم کے حصول کو برا نہیں سمجھتی تھیں۔ پھر اب تو زمانہ بدل گیا تھا۔ بیٹا اور بیٹی دونوں کو مساوی حقوق دیئے جا رہے تھے۔ پھر ان کے گھر میں بیٹی کے لیے الگ سے قوانین کیوں وضع کیے جا رہے تھے۔ رات ایسی ہی سوچوں میں گزر رہی تھی۔ جانے کس گھڑی پلک سے پلک لگی۔ اذانوں سے کچھ دیر بعد میں آنکھ کھلی۔ وضو کر کے فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد وہ تسبیح کر رہی تھیں۔ جب دروازے سے مسرت جہاں داخل ہوئیں۔

سفید قمیض شلوار پر بڑا سا انڈین ململ کا دوپٹہ اوڑھے وہ اجلی نکھری صبح کا ہی حصہ لگ رہی تھیں۔ بالوں کی لٹیں دوپٹے کی اوٹ سے جھانک رہی تھیں۔

جانے کیوں اماں بی کو ان کے چہرے پر پھیلے رنگ کچھ پھیکے اور ملال میں ڈوبے ہوئے لگے۔ ایک ہی شب جانے کون سی سوچوں کے تانوں بانوں میں الجھ کر ان کے معصوم چہرے نے سنجیدگی کی دبیز چادر اوڑھ لی تھی۔ شرارت سے چمکتی آنکھیں کچھ بجھی بجھی سی لگیں۔

"بیٹا رانی! وہاں دروازے کے پاس کھڑی کیا کر رہی ہو؟..... یہاں آؤ میرے پاس۔" انہوں نے بہت پیار سے کہا تو مسرت جہاں نے ایک پل کو سر اٹھا کر ان کی سمت دیکھا اور پھر دھیرے دھیرے سہج سہج قدم اٹھاتی ان کے قریب آ گئیں۔ جیسے وہ کانچ کی بنی ہوں اور پتھریلی زمین پر چلنا پڑ گیا ہو۔

"یہاں بیٹھو میرے پاس....." اماں بی نے جائے نماز سمیٹ کر وہیں اپنے قریب ہی تخت پوش پر ان کے بیٹھنے کی جگہ بنائی۔ وہ خاموشی سی اماں بی کے پاس بیٹھ گئیں۔

"بیٹا! کیا ناراض ہو گئیں مجھ سے؟"

"نہیں اماں بی! ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ نے ایسا کیوں سوچا؟" مسرت جہاں نے ان کے خیالات کی تردید کی۔

''بیٹا! ہم نے تو پوری کوشش کی لیکن تمہارے ابا میاں جب ایک بار کچھ کہہ دیتے ہیں تو پھر اس پر سے ایک انچ ادھر ادھر نہیں ہوتے۔ان کا اقرار، اقرار ہوتا ہے اور انکار کا مطلب انکار۔''

''اماں بی! آپ مجھے وہ بات کیوں سمجھا رہی ہیں۔جو پہلے سے میرے علم میں ہے۔میں جانتی ہوں کہ وہ نہیں مانیں گے۔''

''تو پھر بیٹا! یوں دل چھوٹا نہ کرو۔ہنسو بولو۔جیسے پہلے خوش رہتی تھی اسی طرح۔''اماں بی کے کہنے پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر بکھر کر معدوم ہوگئی۔

''اماں بی! میرا ایک خواب تھا میں ڈاکٹر بننا چاہتی تھی۔اور خواب ہی تو زندگی کا حاصل ہوتے ہیں۔مجھے کم سے کم اپنے خوابوں کے ٹوٹنے پر اداس تو ہونے دیں۔''ان کی بات سن کر اماں افسردہ سی نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگیں۔

''بیٹا! میرے اختیار میں ہوتا تو تمہارے خواب ٹوٹنے نہ دیتی۔تمہارے ابا میاں کی سوچ بھی اپنی جگہ ٹھیک ہے۔وہ باہر کا ماحول دیکھتے پرکھتے ہیں۔اچھی طرح جانتے ہیں۔اسی لیے مستقبل کی پریشانی سے بچنے کی پیش بندی کرتے ہیں۔تم بھی یہ سوچ لو کہ ان کا یہ فیصلہ شاید تمہارے حق میں اچھا ہو۔''وہ بے دلی سے اماں بی کی باتیں سن کر وہاں سے اٹھ گئیں۔پھر آنے والے چھ سات بوجھل دن جیسے گھسٹ گھسٹ کر گزرے تھے۔مسرت جہاں کی خوش نوائیوں پر تو جیسے خزاں نے سیاہ پنجے گاڑ دیئے تھے۔گھر میں سناٹے سے گونجنے لگے۔جس میں بلبل کی لہکار سے ہر دم رونق رہتی تھی۔وہ خاموش ہوگئی تھی۔اور اس کی یہ خاموشی گھر بھر کو تشویش میں مبتلا کیے دے رہی تھی۔مسرت جہاں نے نہ تو ضد کی نہ ہی رونا دھونا مچایا۔بس غیر ضروری باتیں ختم کر دیں۔ان کی اس نمایاں تبدیلی نے اماں بی اور ابا میاں کو بھی پریشان کیا۔

''زہرہ خاتون! مسرت جہاں آج کل کیوں چپ چپ سی رہنے لگی ہیں؟''ابا میاں کے سوال پر انہوں نے کچھ ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں کہ آپ سے زیادہ بہتر اس کا سبب کون جانتا ہے۔لیکن منہ سے کچھ نہ بولیں۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہیں ہماری طرف؟.....کیا ہم قصوروار ہیں اس بات کے؟''ان کے دوبارہ سوال کرنے پر بھی اماں بی کچھ نہ بولیں۔خاموشی سے بیٹھی ساگ بناتی رہیں۔

''ٹھیک ہے آپ جواب نہیں دینا چاہتیں۔تو ہم مسرت جہاں کو بلا کر خود پوچھ لیتے ہیں۔''اور پھر انہوں نے واقعی اسی وقت مسرت جہاں کو بلوا لیا۔

''بیٹھیے بیٹا!''مسرت جہاں ان کے سامنے بیٹھ گئیں۔

''کیا ہم آپ کی خاموشی اور اداسی کا سبب جان سکتے ہیں؟''وہ عمیق نظری سے مسرت جہاں کے کھلے کتاب جیسے چہرے کا مطالعہ کرنے لگے۔ابھی وہ اتنی سمجھدار نہیں ہوئی تھیں کہ جذبوں اور تاثرات کو چھپا سکیں۔ہر جذبہ آنکھوں کے آئینے پر آ کر اپنی اصل صورتحال دکھا دیتا تھا۔

''جی.....ابا میاں!''انہیں توقع نہیں تھی کہ ابا میاں یوں بطور خاص انہیں بٹھا کر ان کی خاموشی کا سبب جاننا چاہیں گے

''ہم کہہ رہے ہیں کیا آپ ہمیں اپنی اس خاموشی کی وجہ بتائیں گی؟''

''کوئی نہیں ابا میاں! ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ کچھ نروس سی ہوگئی تھیں۔ شاید اس لیے کہ آج تک انہوں نے ابا میاں سے کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا۔

''بیٹا! اولاد کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو جائے کتنی ہی خود مختار، کتنی ہی انڈیپینڈنٹ ہو جائے۔ ماں باپ کی نظروں میں اس کا بچپن ہی رہتا ہے۔ آپ اس وقت جھوٹ بول رہی ہیں۔ ہم یہ بھی اچھی طرح جان رہے ہیں۔ آپ نہیں بتانا چاہتیں تو نہ سہی، ہم ان باپوں میں سے نہیں جو اولاد پر بے جا سختی کریں۔'' ان کے لہجے میں تاسف کا ہلکا سا شائبہ تھا۔

''ابا میاں..... آپ ناراض مت ہوں۔ اصل میں میرا ایک خواب تھا۔ ڈاکٹر بننے کا خواب۔ لیکن میں آپ کے فیصلے کے آگے سر نہیں اٹھاؤں گی۔ بس وقتی طور پر کچھ دکھ ہوا۔'' مسرت جہاں سادگی سے کہتی ہوئی شبیر حسین کو اتنی پیاری لگیں کہ انہوں نے جھٹ سے گوہر مقصود ان کی گود میں ڈال دیا۔

''اور اگر ہم اس دکھ کا' اس رنج کا مداوا کر دیں۔'' وہ مسکراتی نگاہوں سے ان کی جانب دیکھ رہے تھے۔ وہ کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں ان کی طرف دیکھنے لگیں۔

''ہم کل ہی میڈیکل کالج سے آپ کے لیے فارم منگوائیں گے۔ اب تو خوش ہیں ناں۔'' ان کی بات سن کر مسرت جہاں کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ گویا ایک مژدہ جانفزا تھا جس کا حرف، حرف ان کے اندر روح بن کر اتر گیا تھا۔

''لیکن ایک بات..... اسے ہماری پہلی اور آخری نصیحت، تنبیہ یا پھر حکم سمجھ لیں کہ اپنے خوابوں کی تکمیل میں ہماری عزت و حرمت کا خون مت شامل کیجیے گا۔ جس بے داغ پوشاک میں ملبوس ہیں آپ اس پر ہم ذلت کا کوئی چھینٹا نہیں برداشت کر پائیں گے۔'' ابا میاں کے جملوں میں جانے کیا تھا کہ ایک پل کو مسرت جہاں لرز کر رہ گئیں۔ لیکن ان احساسات پر بہت جلد خوشی کا احساس غالب آ گیا۔ گھر بھر کو خبر ہو گئی تھی کہ مسرت جہاں کو ابا میاں نے کالج میں ایڈمشن لینے کی اجازت دے دی۔ بھابھیوں نے مبارکباد دی۔ سوائے عارب بھیا کے' ابا میاں کے اس فیصلے کو سبھی نے سراہا تھا۔

☆.....☆.....☆

طبلے پر تھاپ پڑی اور گھنگھرو جھنجھنا اٹھے۔ سرخ قالین کے وسط میں دو گورے گورے پاؤں موسیقی پر ہر جذب کے عالم میں متحرک ہو گئے۔ سفید چاندنیوں پر گاؤ تکیے لگائے بیٹھے امارت کا رعب ڈالنے والے، دن کو اجلے لباسوں میں گھومنے والے اور راتوں کو سیاہی میں گناہوں سے آلودہ نفس ہونے والے تماش بین پوری طرح متوجہ ہو گئے۔ اس بازار میں جہاں عورت جنس کی طرح بکتی ہے۔ اسے خریدنے ایسے ہی شریف ابن شریف آتے ہیں۔ عورت بے بس بھی ہے، خود مختار بھی۔ ظالم بھی ہے، مظلوم بھی۔ حاکم بھی ہے، محکوم بھی۔ لیکن اس بازار میں جہاں دن سوتے، راتیں جاگتی ہیں عورت محض ایک کھلونا ہے۔ بگڑے ہوئے بچوں کے ہاتھوں میں تھمایا گیا ایسا

کھلونا کہ جسکے نصیب میں صرف ٹوٹنا اور بار بار ٹوٹنا ہی لکھ دیا گیا ہے۔

اور کچھ دیر میں کٹ جائے گا ہر بام پہ چاند
عکس کھو جائیں گے آئینے ترس جائیں گے

عرش کے دیدہ نمناک سے باری باری
سب ستارے سرِ خاشاک برس جائیں گے

آس کے مارے تھکے ہارے شبستانوں میں
اپنی تنہائی سمیٹے گا، بچھائے گا کوئی

بے وفائی کی گھڑی، ترکِ مدارات کا وقت
اس گھڑی اپنے سوا یاد نہ آئے گا کوئی

ترکِ دنیا کا سماں ختمِ ملاقات کا وقت
اس گھڑی اے دلِ آوارہ کہاں جاؤ گے؟

مغنیہ کی آواز میں درد تھا، سوز تھا۔ اس کے لبوں سے تلخ حقیقت نرمل نرمل لفظوں کی صورت میں ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہو رہی تھی۔ سارے ماحول پر فسوں طاری تھا۔ وہ منچلے جو آنکھوں میں شوق و ہوس کا ایک جہاں آباد کیے رقاصہ کی ایک ایک جنبش کو نظروں ہی نظروں سے دل میں اتار رہے تھے۔ گانے والی کی جانب متوجہ ہو گئے۔ کالے بارڈر کی کریم کلر کی ساڑھی میں لمبے سیاہ بال پشت پر دھرے، بالکل سادہ چہرے والی یہ عورت اس ماحول کا حصہ تو ہرگز نہیں لگ رہی تھی۔

اس گھڑی کوئی کسی کا بھی نہیں، رہنے دو
کوئی اس وقت ملے گا ہی نہیں، رہنے دو

اور ملے گا بھی تو اس طور کے پچھتاؤ گے
اس گھڑی اے دلِ آوارہ کہاں جاؤ گے؟

اور کچھ دیر ٹھہر جاؤ کہ پھر نشترِ صبح
زخم کی طرح ہر اک آنکھ کو بیدار کرے

اور ہر کشتہ وا ماندگی آخر شب
بھول کر ساعت درماندگی آخر شب
جان پہچان، ملاقات پہ اصرار کرے

لفظ ختم ہو چکے تھے یا شاید گویائی سے محروم ہو گئے تھے۔ رقص کرتے قدم بھی تھم گئے۔ طبلہ نواز، سارنگی نواز گونگے ہو گئے۔ لیکن اس سراپا نازنین کے الفاظ نے ماحول پر جو فسوں طاری کر دیا تھا وہ اسی طرح قائم تھا۔ وہ جا چکی تھی اور اس کے جاتے ہی روشنیوں کے باوجود اندھیرا سا پھیل گیا۔ جھروکے سے لگ کر کھڑی چھ سات سال کی بچی وہ سب بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ اس اجنبی ماحول میں اگر اس کی شناسائی کسی کے ساتھ تھی وہ صرف اور صرف اسی ساحرہ سے تھی جو ابھی ابھی محفل کو حنوط کر کے جا چکی تھی۔ پھر اس چھ سال کی بچی کو کسی نے نرم گرم آغوش میں لیا تھا۔ مانوس سی خوشبو نتھنوں سے ٹکرائی تھی۔

''ماں.....'' اس کے لبوں نے بڑے پیار سے یہ لفظ کہا تھا۔ اور پھر پلٹ کر وہ اس سے لپٹ گئی تھی۔

''ماں.....ماں.....'' اس کی روح اسی لفظ کی تکرار کر رہی تھی۔ جب کسی نے اسے جھنجھوڑا۔ اس کی آنکھیں کھل گئیں۔

''تو.....تو.....کیا وہ سب خواب تھا یا میرے تحت الشعور میں چھپا ماضی عکس بن کر آنکھوں میں اتر آیا تھا۔ پھر ماں کا لمس، اس کی خوشبو کیسے اتنی شدت سے اس کے حواسوں پر حاوی تھی۔ اسے لگا سچ مچ اس کی ماں آ گئی..... ماں جو محبت کا سمندر ہے۔ ماں جو آفاقی سچ ہے۔ جس کی ممتا کے آگے بڑے سے بڑا طوفان بھی پل بھر کو ٹھہر نہیں سکتا۔ وہی ماں جس کی ممتا کے..... شجر کے نیچے سے اٹھ کر وہ امتحانوں کی کڑی تمازتوں میں آ بیٹھی تھی۔ جانے کتنی آزمائشیں تھیں۔ کتنے چکر تھے اس کے پاؤں میں۔'' اس کے ہونٹ خشک تھے۔ نمی سے بالکل نا آشنا۔ آنکھیں بھی پرائی پرائی سی لگ رہی تھیں۔ اس نے زبان لبوں پر پھیر کر انہیں تر کرنا چاہا لیکن اسے لگا اس کے منہ کے اندر زبان نہیں خشک لکڑی کا چٹخا ہوا ایک ٹکڑا رکھا ہوا ہے۔ اور اس کا حلق اس چٹخے ہوئے ٹکڑے کو حرکت دینے سے معذور تھا۔

''طبلہ، گھنگھرو، رقص کرتے ہوئے سفید کبوتری سے پاؤں، سوز میں ڈوبی درد بھری آواز، لمبے گھنیرے بالوں والی پیکر حیا صورت، ماں.....

کیا وہ سب خواب تھا؟ نہیں.....! وہ خواب ہی تو نہیں تھا وہ لمس اس کے لیے نہ تو نیا تھا نہ ہی انوکھا ہاں حیات آفریں ضرور تھا۔ بوجھل بوجھل پلکوں تلے ایک ہی مہربان صورت کی شبیہ لہرا رہی تھی۔ دھیرے دھیرے اس کی پلکوں پر کوئی نادیدہ بوجھ آن ٹکا تھا۔ خود بخود اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اور اب..... اب اسے نیند سے بھی خوف آنے لگا تھا۔ شاید اس کی آنکھیں

خوابوں سے کترانے لگی تھیں۔ان خوابوں میں رنگ بھی تو نہیں تھے نہ ہی امیدوں کی روشنی تھی۔بس ماضی کے سیاہ دھبے تھے جوان کی روشن اسکرین پر جابجا بدصورتی کا نشان بن کر چپکے ہوئے تھے۔وہ ان سیاہ دھبوں سے پیچھا چھڑانا بھی چاہتی تو ناممکن تھا۔بس اس کی روح کسی زخمی پرندے کی طرح اس کے جسم کے قید خانے میں پھڑ پھڑاتی رہتی تھی اور شاید یہی اس کا مقدر تھا۔

☆.....☆.....☆

''آریان! کیا بات ہے بیٹا! کیا سوچ رہی ہو؟شینا پھپھو ہاتھ میں سبزی کی ٹوکری اور چھری لیے کمرے میں داخل ہوئیں تو سامنے ہی اسے بیڈ پر سر جھکائے خاموش بیٹھا دیکھ کر اس کے قریب چلی آئیں۔

''کچھ نہیں آنٹی.....میں نے کیا سوچنا ہے؟بس یونہی.....''عجیب سا ٹالنے والا انداز تھا اس کا۔

''آریان!تم نے بتایا تھا کہ تمہارا کوئی نہیں.....نہ امی نہ ابو نہ بہن بھائی وغیرہ.....اب تک تم کس کے پاس رہتی تھیں؟''شینا پھپھو کے پوچھنے پر آریان نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔یہ وہ سوال تھا۔جس کا کبھی نہ کبھی اسے جواب دینا ہی تھا۔اپنی ذات کو قابل اعتبار ٹھہرانے کے لیے معاشرے میں اپنے مقام کا تعین کرنا تھا۔وہ سنبھل گئی۔شاید اس لیے کہ اپنی بقاء کی جنگ اسے تنہا لڑنی تھی۔

''آنٹی.....بچپن سے ہی ایک رشتے کی خالہ کے ہاں رہتی تھی۔چند دن پہلے وہ فوت ہوگئیں۔ان کے دوسرے رشتہ دار گھر پر قبضہ جمانے کی خاطر مجھے جان سے مار دینے کے درپے ہوگئے کیونکہ وہ اپنا گھر میرے نام کرگئی تھیں۔سو ان لوگوں سے اپنی جان بچانے کی خاطر مجھے وہ جگہ چھوڑنی پڑی۔''شینا پھپھو کو اس پر بے ساختہ پیار آگیا۔کیا اس کا کومل وجود حالات کی ٹھوکروں کا متحمل ہوسکتا تھا۔لیکن پروردگار بھی جانے کیا سوچ کر اپنے بندوں پر نت نئی آزمائشوں کے دروازے کھول دیتا ہے۔اس سے وہ انہیں روبیہ اور انیقہ کی ہی طرح لگی۔

''آریان! کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ تم ہمیشہ کے لیے یہاں رہ جاؤ میرے پاس۔میری بیٹی بن کر۔تمہیں دیکھ کر مجھے کوئی بے طرح یاد آجاتا ہے۔شاید اسی طرح اس کی یاد کا دکھ کم ہوجائے۔''شینا پھپھو کی آنکھیں خلا میں جیسے کسی نکتے پر مرکوز تھیں۔ذہن میں کچھ دھندلے دھندلے عکس واضح ہو رہے تھے۔''

''آنٹی!کون.....کون یاد آجاتا ہے؟''آریان کے پوچھنے پر ابھی انہوں نے جواب نہ دیا تھا کہ تائی مقسوم نے کمرے میں جھانکا۔

''ارے شینا!تم یہاں اطمینان سے بیٹھی ہو اور ادھر زاہدہ اور حدیقہ کی لڑائی ہو رہی ہے۔''انہوں نے عجلت میں کہا اور واپسی کو مڑ دیں۔شینا پھپھو نے سبزی کی ٹوکری اور چھری وہیں قریب ہی تپائی پر رکھ دی اور اٹھ کر ان کے پیچھے چل دیں۔

''بھابھی!''انہوں نے آگے جاتی تائی مقسوم کو آواز دے کر روکا۔وہ رک گئیں اور پلٹ کر ان کی طرف دیکھنے لگیں۔

''بھابھی!کیا ہوا.....کیوں جھگڑ پڑیں دونوں؟''شینا پھپھو متفکر سی ہوگئی تھیں۔

''ارے شینا!جانتی تو ہو ایک سیر ہے تو دوسری سوا سیر۔جب سے حدیقہ بیاہ کر آئی ہے۔دونوں میں بنی نہیں۔حدیقہ کی عادت کا بھی تمہیں پتہ ہے کیسے مرچ مصالحے لگا کر بات کرتی ہے۔بس اس نے زاہدہ پر طنز کیے اور وہ کھول اٹھی۔''تائی مقسوم نے بتایا۔وہ دونوں

آگے پیچھے چلتے ہوئی بڑی اماں کے کمرے کی طرف بڑھنے لگیں۔

''لیکن بھابھی! جھگڑے کا سبب کیا ہے؟''

''یہی تمہارے کمرے میں جو لڑکی ہے..... یہی جھگڑے کا موجب ہے۔ اصل میں زاہدہ کچھ دیر پہلے باورچی خانے میں کھانا پکا رہی تھی کہ حدیقہ پہنچ گئی۔ چھوٹتے ہی اس نے یہ بات کہی کہ ''بھابھی! فواد میاں تو جوان ہو گئے۔ خیر سے لڑکی بھگا کر لائے ہیں۔'' بس یہ بات لڑ گئی زاہدہ کو۔ اس لیے کہ میں اور فہدی صبح اسے ساری صورتحال سے آگاہ کر چکے تھے۔ جانتی ہو نا زاہدہ فہدی کے معاملے کتنی حساس ہے۔ اپنے بیٹے کے بارے میں ایسے کلمات کہاں برداشت کر سکتی تھی۔ اس نے جواب میں حدیقہ کے بھائی شرافت کا کچا چٹھا کھول کر رکھ دیا۔ اور اب دونوں بڑھ چڑھ کر ایک دوسرے پر خاندانی حملے کر رہی ہیں۔'' وہ دونوں چلتے چلتے بڑی اماں کے کمرے تک پہنچیں۔ اندر سے آتی تیز آوازوں سے انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ معاملہ عدالت عالیہ تک پہنچ چکا ہے۔ لیکن جج اس وقت خاموش تھا۔ البتہ متحارب گروپ جی جان سے ایک دوسرے پر کیچڑ اچھال رہے تھے۔ وہ دونوں کمرے میں داخل ہوئیں۔ حدیقہ چچی اور زاہدہ چچی دونوں ہی شدید غیض و غضب کے عالم میں ایک دوسرے کو گھور رہی تھیں کہ اگر اجازت ہوتی تو ایک دوسرے کی تکہ بوٹی کر دیتیں۔ بھابھی مقسوم نے آگے بڑھ کر زاہدہ چچی کو کندھے سے تھاما۔

''زاہدہ! تم بڑی ہو۔ درگزر سے کام لو۔ چھوٹے اکثر ایسا کر جاتے ہیں۔ بڑوں کا کام ہے صبر و تحمل سے پیش آئیں۔''

''بالکل بڑوں کا کام ہے صبر و تحمل سے پیش آئیں تاکہ چھوٹے سر چڑھ کر ناچیں۔ ارے بھابھی۔ گز بھر کی زبان ہے اس کی۔ نہ لحاظ نہ مروت۔ خدا جانے ماں نے کیسی تربیت کی ہے نہ چھوٹے کا پتہ نہ بڑے کی خبر۔ اپنی انہی عادتوں کی وجہ سے سارے خاندان سے کٹ گئی ہے۔ شاکر جیسے اچھے لڑکے کو بھی خاندان بھر میں ذلیل کر کے رکھ دیا۔ اب بھی کلیجے میں ٹھنڈ نہ پڑی۔'' زاہدہ چچی نے موشگافی کی۔

''بس بس..... اچھی طرح جانتی ہوں میں اس گھر کے بڑوں کو۔ خرابی اپنی اولاد میں ہوتی ہے اور دوسروں پر چڑھ دوڑتے ہیں۔ بیٹی تو آپ کی بھی ہے۔ کیا تربیت کر رہی ہیں اس کی۔ اتنی بڑے گائے کی گائے ہو گئی۔ چائے تو بنانی نہیں آئی اسے۔'' حدیقہ چچی نے جواباً حملہ کیا۔

''دیکھو حدیقہ! بات بڑھانے کا کوئی فائدہ ہے۔ تم مان کیوں نہیں جاتی ہو کہ تمہاری غلطی ہے۔ بغیر تحقیق و تصدیق کے تم نے بات کیوں کی۔ فہدی سے تم اچھی طرح واقف ہو۔ کس ٹمپرامنٹ کا لڑکا ہے وہ۔ وہ کوئی کھلنڈرا ٹین ایجر نہیں۔ ایک سلجھا ہوا۔ پڑھا لکھا، پروفیشنل آدمی ہے۔ کلینک چلا رہا ہے ذمہ دار ڈاکٹر ہے۔ ایسی چیپ اور غیر ذمہ دارانہ حرکت کر سکتا ہے وہ؟ پھر تم نے اس کی ماں سے اس کے متعلق اس طرح بات کی۔ تو اس کا بھڑکنا تو بنتا ہی تھا۔'' ثنیا پھپھو نے سمجھانے کی کوشش کی۔ حدیقہ چچی بدلحاظی سے کچھ دیر سب کی طرف دیکھتی رہیں پھر تن فن کرتی کمرے سے نکل گئیں۔ یعنی سمجھانے کے باوجود انہوں نے اپنی غلطی تسلیم نہ کی۔

''اماں بی! آپ کچھ کہتی کیوں نہیں اسے..... آپ نے سر پر چڑھا رکھا ہے۔ ہوتے ناں آج ابا میاں! پھر میں دیکھتی کہ یہ کس طرح بڑوں کے منہ لگتی ہے۔'' زاہدہ چچی کا پارہ نیچے آ ہی نہ رہا تھا۔ اس لیے کہ حدیقہ چچی غلطی کر کے ماننے والوں میں سے نہیں تھیں۔ وہ

غلطی کر کے شیر کی طرح سینہ تان کر کھڑی ہوئی جاتی تھیں۔ کہ کرلو جو کرنا ہے اور ان کی یہی عادت گھر والوں کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ انہوں نے آتے ہی الگ گھر کا مطالبہ کر دیا تو اماں بی نے فوراً شاکر حسین کو گھر بنوا دیا۔ اس کے باوجود کسی نہ کسی معاملے میں ٹانگ اڑانے کو آموجود ہوتیں۔

''زاہدہ! میں عزت سے ڈرتی ہوں۔ تم چاروں نے کبھی میرے سامنے زبان نہیں کھولی۔ ہمیشہ میرا احترام کیا لیکن اس عورت کی زبان کے آگے خندق ہے۔ یہ بولتے سے سوچتی نہیں اس لیے میں اس سے زیادہ کلام ہی نہیں کرتی۔'' بڑی اماں اسان بے بولیں۔ زاہدہ چچی خاموش ہو گئیں۔ لیکن اندر ہی اندر کھول رہی تھیں۔ بھابھی مقسوم اور شینا پھپھو کے سمجھانے پر کسی حد تک وہ مان گئیں۔ لیکن ان کے چہرے سے ناراضگی کے تاثرات بدستور مترشح تھے۔

''شینا! کیا وہ بچی یہاں آسکتی ہے؟ میں ملنا چاہتی ہوں اس سے۔'' بڑی اماں نے کہا۔ ''پتہ تو چلے کون ہے..... کہاں سے آئی ہے..... فہدی اسے کیوں لے کر آیا؟''

''کیوں نہیں بڑی اماں! آ کیوں نہیں سکتی۔ اصل میں مسئلہ یہ تھا کہ فہدی اس لڑکی کے متعلق جانتا کچھ نہیں تھا کہ یہ کون ہے کہاں سے آئی ہے۔ آدھی رات کو تنہا سڑک پر کس لیے کھڑی تھی۔ چوٹ تو کچھ زیادہ نہیں آئی تھی۔ دہشت سے بے ہوش ہو گئی تھی۔ فہدی کہہ رہا تھا کہ میرے ضمیر نے گوارا نہ کیا کہ میں اسے یوں تنہا سڑک پر بے ہوش پڑا چھوڑ کر آجاتا۔ پھر خیر سے بھرا پڑا گھر ہے۔ اس کی باآسانی عیادت اور دیکھ بھال کی جاسکتی تھی۔''

''لیکن وہ اسے ہسپتال بھی تو لے جاسکتا تھا۔ وہاں اس کی زیادہ بہتر دیکھ بھال ہو سکتی تھی۔'' بڑی اماں نے کہا۔

''اس نے یہ بھی کہا کہ لے جانے کو تو میں اسے کلینک میں بھی لے جاسکتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ کسی اور کا نہ ہونا اس کو مشکوک بنا دیتا اور مجھے بھی۔ اس لیے میں نے بہتر سمجھا کہ گھر لے چلوں۔''

''ہوں..... ٹھیک ہے تم اس لڑکی کو یہیں لے آؤ۔'' شینا پھپھو بڑی اماں کی بات سن کر کمرے سے نکل گئیں۔ کمرے میں گھمبیر خاموشی چھا گئی۔ ہر نفس اپنی اپنی جگہ سوچوں کے گرداب میں پھنسا ہوا تھا۔ چند ثانیوں پر محیط یہ وقفہ اس وقت ختم ہوا جب شینا پھپھو کے ہمراہ وہ کومل سی لڑکی کمرے کے اندر داخل ہوئی۔ کمرے میں موجود تینوں خواتین نے بیک وقت اس کی طرف دیکھا تھا۔ وہ بھی انہی کی جانب متوجہ تھی۔ سو انہیں یوں اپنی طرف دیکھتا پا کر وہ قدرے نروس ہو گئی۔

''جی اماں بی! یہ آریان ہے اور آریان یہ ہماری اماں بی..... یہ بھابھی مقسوم ان سے تو کسی حد تک تمہارا تعارف ہو بھی چکا ہوگا اور یہ زاہدہ..... فہدی کی امی.....'' آریان نے تینوں خواتین کو بغور دیکھا اور پھر جیسے اس کی نگاہیں بڑی اماں کے جھریوں زدہ چہرے پر ٹک گئیں۔ بڑی بڑی خواب ناک آنکھیں جو وقت کی ستم ظریفی سے قدرے ڈھلک گئی تھیں۔ لیکن وقت کا ظالم ہاتھ ان کی چمک چھیننے میں ناکام رہا تھا۔ پتلے پتلے گلابی ہونٹ اور نسواں ناک۔ سفید بالوں کو بڑے سے سفید آنچل میں چھپائے سفید چکن کے سوٹ میں ان کا وجود

اسے اس قدر مقدس اور پاکیزہ لگا کہ وہ بے اختیار چند قدم چل کر ان کے قریب نیچے بیٹھ گئی۔ انتہائی ادب اور احترام کے ساتھ ان کا نرم گرم لجلجا سا ہاتھ اپنے سرد ہاتھوں میں تھام کر آنکھوں سے لگا لیا۔ یوں لگا جلتی ہوئی آنکھوں پر کسی نے برف کی ڈلی رکھ دی ہو۔ بڑی اماں عالم حیرت میں اس کی جانب دیکھ رہی تھیں۔ اس کا یہ طرزِ عمل ان کے لیے بالکل غیر متوقع اور عجیب سا تھا۔ لیکن وہ بولیں کچھ نہیں۔ شاید وہ منتظر تھیں کہ آریان کچھ کہے۔

''بڑی اماں! کیا آپ مجھے بھی بڑی اماں کہنے کی اجازت دیں گی؟'' یہ سوال تھا یا اس کے زخمی وجود سے نکلی کراہ، اس کی محرومیوں کا آئینہ جو بڑی اماں کے دردمند دل میں ترازو ہو گیا تھا۔

''ہاں بچی! کیوں نہیں..... شوق سے کہو میں تمہاری بڑی اماں ہوں۔'' ان کا خلوص لفظوں میں ڈھل کر لبوں سے آزاد ہوا تو جیسے اسے سکون سا آ گیا۔

''بس! مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔ بڑی اماں! میں نے زندگی میں اوپر والے سے کچھ مانگا تو صرف رشتوں کا غرور مانگا اور آج آپ نے مجھ سے یہ رشتہ جوڑ کر میری تمنا پوری کر دی۔ اوپر والے نے میری دعا مستجاب کر دی۔'' شینا پھپھو نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔ کل سے اب تک یہ پہلی طویل بات تھی جو اس نے کی تھی۔ اس کی بات کے جواب میں پھر بڑی اماں کچھ نہیں بولی تھیں۔ اس لیے کہ جب اسے اپنا لیا تھا تو پھر یہ جان کر کیا لینا تھا کہ وہ کون تھی؟ کہاں سے آئی تھی؟ وہ اب ان کی تھی، ان کے پاس رہنا تھا اسے۔ ان سب کے لیے یہی کافی تھا۔

☆.....☆.....☆

آج اسے اس گھر میں تیسرا دن۔ روبیہ اور انیقہ تو اس سے ایسی دوستی ہو گئی تھی جیسے وہ شروع سے ہی ان کے ساتھ رہتی آ رہی ہو۔ روبیہ اور وہ تقریباً ہمعصر ہی تھیں۔ جبکہ انیقہ چھوٹی تھی۔ چھوٹی تو تھی لیکن ہری مرچ۔ اس وقت وہ تینوں لان کے گھاس پر براجمان تھیں۔ موسم نے یکدم ہی بے وفا محبوب کی طرح رنگ بدلا تھا۔ صبح سے کڑکتی دھوپ کی تمازت سے جھلستے دیوار و در اب آسمان کی عنایت پر کچھ پرسکون دکھائی دے رہے تھے۔ ہولے ہولے چلتی ہوا درختوں اور پودوں کے پتوں سے سرگوشیاں کرتی ان کی کہتی آ جا رہی تھی۔ یہ تینوں پھولوں کے کنج کے قریب بیٹھی تھیں ان سے قدرے فاصلے پر بچھی لان چیئرز پر گھر کی دیگر خواتین چائے اور خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔

''ویسے آریان آپی! آپ نے اب تک ہمارے گھر کے افراد کے بارے میں کوئی رائے نہیں دی۔'' انیقہ نے شریر ہوا کی اٹھکیلی سے ماتھے پر جھول آنے والی لٹ کو انگلی سے پیچھے کرتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ اس کے سوال پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ آریان کے لبوں پر در آئی۔

''کیا بہت ضروری ہے؟'' سوال کے جواب میں اس نے الٹا سوال کر دیا۔

''بالکل! جب ہم کسی خاص ماحول میں، یا چند افراد کے درمیان میں رہتے ہیں تو خود بخود ہمارا ذہن وہاں کے بارے میں ایک رائے قائم کر لیتا ہے مثبت یا منفی اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آپ کے ذہن میں بھی رائے محفوظ ہے اس وقت۔'' انیقہ فلسفیانہ انداز میں گویا ہوئی۔

''خدارا نکی! اپنا فلسفہ بول کر بلاوجہ دماغ پلپلا کرنے کی کوشش مت کرو۔ اچھا خاصا موسم ہے اور بہت ہی اچھا موڈ بھی۔ دونوں غارت ہو جائیں گے۔'' روبیہ اس کی باتوں سے اکتا کر بولی۔ ''آریان آپی! ازل سے ہی بے چارے فلسفیوں کے ساتھ ایسا ہوتا آیا ہے۔ خواہ وہ جبران ہو یا سقراط۔ دکھ کا زہر پلاتے ہیں اسے یہ زمانے والے۔ کوئی قدر نہیں ٹیلنٹڈ لوگوں کی یہاں۔'' مصنوعی سرد آہ بھر کے انیقہ نے کہا تو آریان مسکرانے لگی۔

''دیکھو بھئی! سیدھی سی بات ہے نہ تو ہم فلسفی کی بکریاں ہیں کہ تمہاری باتیں سن سن کر دماغ کا خانہ خالی کر دیں اور نہ ہی تم کوئی اتنی بلند پایا فلسفی ہو جسکا کہا ہوا اتنا قیمتی ہو کہ ہم اپنا وقت ضائع کرتے پھریں۔'' روبیہ نے کہا۔

''ٹھیک ہے! ٹاپک چینج کیے لیتے ہیں۔ آریان آپی نے تو اپنی رائے نہیں دی۔ البتہ ہماری خواہش ہے کہ ہم اپنی رائے سے اس پیاری سی لڑکی کو جواب ہماری آپی بھی ہیں ضرور شیئر کریں۔''

''کیا مطلب؟..... کونسی رائے..... کس کے بارے میں'' روبیہ نے حیرت سے انیقہ کی طرف دیکھا۔

''ارے یہی جو رشتوں کی فوج ظفر موج ہے ہمارے اردگرد انہی کے بارے میں اور کیا۔'' انیقہ نے جیسے روبیہ کی کم عقلی پر ماتم کرنے والے انداز میں کہا۔

''اس کی کیا ضرور ہے..... بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی؟''

''ارے روبیہ! کیوں بے چاری کو بار بار ٹوک دیتی ہو..... کہنے دو۔ ہاں انیقہ بولو..... کیا کہنا چاہتی ہو تم۔'' آریان نے پہلے روبیہ اور پھر انیقہ کو مخاطب کیا۔ تو انیقہ نے چڑانے والے انداز میں روبیہ کی طرف دیکھا اور گویا ہوئی۔

''ہاں جی! تو ہم یہ کہہ رہے تھے کہ ہر انسان کی اپنے ماحول اور اردگرد بسنے والوں کے بارے میں اپنی ذاتی رائے ہوتی ہے۔ باقی سب کیا سوچتے ہیں۔ اس کا تو ہمیں علم نہیں البتہ ہماری رائے سادات نگر کے باسیوں کے بارے میں کچھ یوں ہے۔ ارے..... ارے ایک منٹ..... انیقہ یوں خاموش ہوئی جیسے اسے کچھ بھول گیا ہو اور وہ یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

''ہوں..... تو جناب سفید کرتے شلوار اور دوپٹے میں لپٹی لپٹائی، سمٹی سمٹائی سی یہ ہمارے گھر کی سب سے بزرگ ہستی ہیں۔ ان کے سفید بالوں اور پروقار شخصیت کی طرح ان کا دل بھی اسی قدر قابل تعظیم و تکریم ہے۔ اور ہمیں یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ اس گھر میں سے ہماری سب سے زیادہ دوستی انہی سے ہے۔ عرف عام میں انہیں بڑی اماں کہتے ہیں اور عرف خاص یعنی ہم انہیں دادو کہتے ہیں۔ سادات نگر انہیں کی راج دھانی ہے۔ گھر کے اندر داخل ہوتے ہی آپ کو ایک خوبصورت سرسبز لان نظر آئے گا۔ یقیناً لان کی دلکش آرائش، ترتیب اور خوبصورتی دیکھ کر آپ مکینوں کی خوش ذوقی اور محنت کو سراہیں گے لیکن ایسا ہرگز نہیں کیونکہ یہ سارا کمال مکینوں کا نہیں، مالی کا ہے۔ اس گھر والے آرائش و زیبائش اور محنت کو پسند ضرور کرتے ہیں لیکن اس آتش میں بے خطر کود پڑیں ایسا قطعی نہیں۔'' انیقہ ایک پل کو رکی۔ آریان دلچسپ نگاہوں سے اس کی سمت دیکھ رہی تھی۔ جبکہ روبیہ اسے کھا جانے والی نگاہوں سے گھور رہی تھی۔ اس نے روبیہ کی تیز نگاہی کو نظر انداز

کرتے ہوئے بیان وہیں سے جوڑا جہاں سے سلسلہ کلام ٹوٹا تھا۔

''لان کے بالکل سامنے تین سیڑھیاں چڑھنے کے بعد ایک چمکدار چکنے فرش والا برآمدہ ہے۔ برآمدے کے بالکل سامنے لکڑی کا بڑا سا منقش دروازہ ہے یہ ہال کمرہ ہے جسے گھر کے افراد ٹی وی لاؤنج کہتے ہیں۔ لیکن آپ اسے کچھ بھی کہہ لیں۔ ڈرائنگ روم، سٹنگ روم، میٹنگ روم جو بھی آپ سمجھ لیں۔ کمرے کی دیدہ زیب ڈیکوریشن اور لشکارے مارتے ہوئے فرنیچر کی صفائی اپنے ہاتھوں سے نہیں بلکہ ملازمہ کے ہاتھوں پر کڑی نظر رکھ کر کروائی جاتی ہے۔ یہ ملازمہ اس گھر میں برسوں سے کام کرتی چلی آ رہی ہے۔ نام شاکرہ ہے لیکن صبر و شکر نام کو نہیں۔ گھر میں کھانا سب سے پہلے یہی کھاتی ہے چاہے مالکان نے کھایا ہو یا نہیں۔ اس بات کی محترمہ کو رتی برابر پرواہ نہیں۔ اب آتے ہیں گھر کے افراد کے پاس تو جناب سب سے پہلے ہم یہ وضاحت کرتے چلیں کہ اس رائے سے مرد حضرات مستثنیٰ ہیں۔ ہم ان کے بارے میں رائے محفوظ رکھتے ہیں۔'' انیقہ کی آخری بات پر روبیہ اور آریان کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

''کیوں مرد حضرات کے بارے میں رائے نہیں دی جا سکتی؟''

''دی جا سکتی ہے لیکن اس سے نقص امن کا خدشہ ہے۔ ہاں تو جناب گھر کی سب سے بزرگ خاتون کا تعارف تو ہو چکا۔ اب آتے ہیں اس گھر کی بڑی بہو یعنی تائی جی کی طرف۔ تائی جی ایک معصوم اور بھولی بھالی خاتون ہیں۔ ہم انہیں پیدائشی ماں سمجھتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ صرف انسانوں کے لیے ہی نہیں۔ جانوروں کے لیے بھی دل میں ڈھیروں ڈھیر پیار رکھتی ہیں۔ گھر بھر میں کسی کو کوئی تکلیف ہو سب سے زیادہ دکھ تائی کو ہوتا ہے۔ اور وہ اس تکلیف کو رفع کرنے کی کوشش میں لگ جاتی ہیں۔ شاعر نے انہی کے بارے میں کہا ہے کہ

؎ سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

''کیوں روبی! ہم نے کچھ غلط تو نہیں کہا؟'' انیقہ ایک شان بے نیازی سے بولی۔

''نہیں بھئی ہم میں اتنی جرأت کہاں کہ آپ کی کہی کسی بات کو غلط کہہ سکیں۔'' روبیہ نے اس کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ آریان کو یہ دونوں بہنیں انتہائی پیاری لگی تھیں۔

''نکی..... تم خاموش کیوں ہو گئیں۔'' آریان نے انیقہ کو کچھ سوچتے پا کر کہا تو اس نے آریان کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے کچھ دیر پہلے کی شوخی ختم ہو گئی تھی۔ چہرے پر ایک سنجیدہ مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

''دراصل جس ہستی کا میں اب ذکر کرنے جا رہی ہوں لوگوں کے لیے تو شاید وہ اتنی اہم نہ ہو۔ لیکن آپی۔ ان کی حیثیت اس بات سے لگا لیں کہ ہماری سانسوں کا ایک تانا بانا انہی کے مرہون منت ہے۔ آپ کے چہرے کی مسکراہٹ بتا رہی ہے کہ آپ جان گئی ہیں وہ کون ہیں جی ہاں آپ نے ٹھیک سمجھا باقی سب کی شینا پھپھو اور ہماری ماما۔ یہ ایسی شخصیت ہیں جن کے بارے میں میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہوں گی کہ اگر کسی نے جنت کو مجسم و متحرک دیکھنا ہو تو وہ ہماری ماما کو دیکھ لے۔'' محبت، عقیدت، احترام جانے کتنے ہی جذبے اس کے لہجے میں سمٹ آئے تھے۔ ایک ماں کی ذات کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے۔ لیکن شاید دنیا میں ایسے لفظ ہی نہیں کہ جنہیں گل ہائے

عقیدت کی صورت میں ماں کے قدموں پر نچھاور کر کے ہم یہ سمجھ لیں کہ ہمارا فرض پورا ہوا۔ ہم نے اپنی محبت کا ثبوت دے دیا۔ آریان کی گھنیری پلکوں تلے ماں کی پاکیزہ شبیہ لہرا گئی۔ کتنا سکون کتنی طمانیت تھی اس آغوش میں۔ کتنا پیار تھا آنکھوں میں۔ وہ سکون، وہ طمانیت وہ مامتا۔ وہ محبت سبھی کچھ اس کی میراث۔ اس کی جاگیر تھا۔ لیکن آج وہ راستوں کی بیٹی تھی۔ گرد سفر کی طرح قافلے کے پیچھے رہ گئی تھی۔ ڈار سے بچھڑی ایک ایسی کرلاتی کونج تھی جس کی کرلاہٹیں، سسکیاں، جس کی چیخیں اور محض صرف اس کی ذات کے اندر تک محدود تھا۔ کوئی نہیں تھا جو اس کے اندر جھانک کر اس دہشت بے اماں میں اس کی خواہشوں کی بے کفن لاشیں ڈھونڈ سکتا۔ پھر کسی کو کیا پڑی تھی بے اثر دعاؤں کے مستجاب ہونے کے منتظر رہنے کی۔ سو پوری دنیا اپنی رنگینیوں میں کھوئی ہوئی تھی۔

''آریان آپی! آپ کیا سوچ رہی ہیں!'' انیقہ نے پوچھا تو وہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''یہ سوچ نہیں رہی ہیں بور ہو رہی ہیں تمہارے اس طویل و عریض تعارف سے جس کا نہ سر ہے نہ پیر۔ جس کے ختم ہونے کے کوئی چانس نظر نہیں آ رہے۔ اگر تم اسی طرح تعارف پیش کرتی رہی تو یقیناً یہ سال یہیں لان میں بیٹھے بیٹھے گزر جائے گا۔'' روبیہ کی بات سن کر انیقہ نے برا سا منایا۔

''دیکھ لیا آریان آپی! ایسے لوگ ہوتے ہیں شخصی آزادی کو سلب کرنے والے، غیر جمہوری، ڈکٹیٹر۔''

''ارے نہیں بھئی! میں ہرگز بور نہیں ہو رہی۔ جس کے پاس تم جیسی اچھی اور مخلص دوستوں کا ساتھ ہو بھلا وہ بور یا دکھی ہو سکتا ہے۔ اصل میں مجھے اپنی امی یاد آ گئی تھیں۔'' آریان دھیمے لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولی۔

''آہم..... ہم بھی اتنی دیر سے یہی سوچ رہے تھے کہ آج تک ہماری کمپنی سوائے روبی کے کبھی کسی کو ناگوار نہیں گزری پھر آپ کی نفیس طبع ہمیں کیوں نہ برداشت کر پائی۔ خیر مس روبیہ کے کانوں تک یہ خبر یقیناً پہنچ چکی ہوگی کہ آریان آپی ہرگز بور نہیں ہو رہیں بلکہ گہری دلچسپی سے ہماری گفتگو سے مستفید ہو رہی ہیں۔ لہٰذا امید ہے کہ اب وہ اپنی چونچ بند رکھیں گی۔'' انیقہ شرارتی نظروں سے روبیہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی تو اس نے ہونہہ کہہ کر رخ دوسری طرف کر لیا۔

''یہ ہماری بہن کا مخصوص انداز ہے اس طرح رخ پھیر کر یہ ہمیں باور کرانا چاہتی ہیں کہ اب ان کی ناراضگی کا دور شروع ہو گیا ہے۔ لیکن درحقیقت ایسا نہیں۔ یہ رخ پھیر کر اس لیے بیٹھی ہیں تاکہ ہماری باتوں پر جو تاثرات ان کے خوبصورت چہرے پر آئیں وہ ہماری نگاہوں کی دستبرد سے محفوظ رہ سکیں۔'' انیقہ کی بات سن کر آریان مسکرا دی جبکہ روبیہ کھسیانی سی ہو کر سیدھی ہو بیٹھی۔ ''کیا مصیبت ہے؟ تم باز نہیں آ سکتیں۔''

''یہ ہوئی ناں بات..... ہاں تو نامکمل تعارف کی طرف آتے ہیں۔ اوہو کچن میں اٹھا پٹخ ہو رہی ہے یہ..... پلیٹ ٹوٹنے کی آواز ہے۔ گھبرائیے مت۔ ہمارے گھر کی ان خاتون کی کچن میں موجودگی کا ثبوت ہی یہی ہے۔ جی ہاں آپ ٹھیک سمجھے یہ ہیں زاہدہ چچی ہمارے خاندان کے اکلوتے ڈاکٹر فخر دادا پردادا جناب فواد حسین کی والدہ ماجدہ۔ خاندان بھر میں نیم حکیم مشہور ہیں۔ کسی کو کوئی بیماری ہو ایسے ایسے

دیسی نسخہ جات سے بہرہ مند کرتی ہیں کہ مریض کی زندگی محض ایک معجزہ ہی رہ جاتی ہے۔ ابھی تک فیملی کے افراد ٹھیک ٹھاک ہیں کیونکہ ان کے بتائے ہوئے نسخہ جات پر عمل نہیں کرتے۔ پورا خاندان حیران ہے کہ زاہدہ چچی کے ہاں اتنے ذہین وفطین بیٹے نے جنم کیسے لے لیا۔ غالباً وہ ان کی قربت ومحبت سے زیادہ فیض یاب نہ ہو پائے ہوں گے۔'' انیقہ کی بات سن کر آریان کے ذہن کے پردے پر ایک ہیولا سا سرسرایا۔ اور پھر عکس بن کر آنکھ کی پتلی پر سمٹ آیا۔

ان تین دنوں میں اس نے محض دوبارہ ڈاکٹر فواد کو دیکھا تھا۔ انہوں نے سرسری سا اس کا حال چال پوچھا تھا اور بس۔ یوں جیسے وہ اسے یہاں لا کر بھول گئے ہوں یا شاید وہ کوئی بے جان بے وقعت سی چیز تھی جس کا خیال انہیں پھر دوبارہ آیا نہیں۔

''فیضی چچی نہ ہم کسی کے نہ ہمارا کوئی مکمل تفسیر ہیں۔ نہ کسی کے معاملات میں ٹانگ اڑاتی ہیں نہ اپنے معاملوں میں دخل اندازی پسند کرتی ہیں۔ انہیں صرف اپنے میاں اور بچوں کی ہمہ وقت پرواہ رہتی ہے لہٰذا یہ سارا دن ہی آپ کو کسی نہ کسی کام میں جتی ہوئی نظر آئیں گی۔ [illegible] کا [illegible] کہتے ہیں [illegible] بھی نہیں کہتے۔'' انیقہ [illegible] فیضی چچی کو [illegible] اور انیقہ مسکرا مسکرا کر اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

''نکی..... کتنا بولتی ہو تم..... تھکتی ہی نہیں؟'' روبیہ نے کہا۔

''ارے دنیا میں آزادی رائے کا حق ہر ایک کے پاس ہے۔ ماما اور تم دونوں ہی مجھے بولنے نہیں دیتیں۔ آریان آپی کوئی غیر تو نہیں ہیں کم سے کم ان کے سامنے بولنے سے تو مت روکو۔''

''میں یہ تو نہیں کہہ رہی کہ آریان کوئی غیر ہے۔''

''چلو ٹھیک ہے بچوں کا تعارف پھر کسی دن پر اٹھا رکھیں گے۔ فیملی کی سب سے ہر دلعزیز شخصیت کا تعارف تو ہونا چاہئے ناں۔'' انیقہ کی آنکھوں میں شرارت آمیز مسکراہٹ نے کروٹ لی۔

''کون.....؟'' روبیہ نے پوچھا۔

''میری..... تمہاری، خاندان بھر کی آئیڈیل..... حدیقہ چچی۔''

کیا.....؟'' روبیہ تو جیسے مارے صدمے کے بیہوش ہونے کو تھی۔

''آئیڈیل..... حدیقہ چچی؟''

''ہاں بھئی..... اس میں غلط کیا ہے آئیڈیل بہو کی تمام تر خوبیاں ان میں درجہ اتم موجود ہیں۔ آریان آپی! روایت کا حسین ترین نمونہ ہیں ہماری یہ چچی آئیڈیل بیوی، آئیڈیل بہو، آئیڈیل چچی اور آئیڈیل بھابھی۔'' آریان نے بغور اس کی طرف دیکھا۔ انیقہ کے لہجے میں اسے طنز کا شائبہ سا ہوا۔

''تیس سال سے جڑا ہوا خاندان محض ان کی تن تنہا جدوجہد سے بکھر گیا۔ آئے روز گھر میں ہونے والے جھگڑوں میں بڑی

جانفشانی سے کام لیتی ہیں۔ اکثر گھریلو نوک جھونک انہی کی تگ و دو کی مرہون منت ہے۔ بڑی اماں کا غرور، چچوں، چچیوں کا محبت بھرا ساتھ اور احساس کا رشتہ انہوں نے بڑی عرق ریزی سے اور جان لڑا کر توڑا۔ کیا ایک خاتون میں آپ کو یہ سب خوبیاں مل سکتی ہیں۔"

"نکی..... بس کرو..... چچی نے سن لیا تو فساد کھڑا کر دیں گی۔ روبیہ نے لان میں بچھی کرسیوں کی طرف دیکھا جہاں ابھی تک تمام خواتین بیٹھی ہوئی تھیں۔ آریان نے سب کی طرف دیکھا۔ جانے کیا بات تھی۔ بڑی اماں کی طرف اس کا دل کھنچتا تھا۔ اس کی خواش ہوتی تھی کہ وہ بڑی اماں کے پاس بیٹھے ان سے باتیں کرے۔ لیکن پھر یہ سوچ کر رک جاتی کہ جانے وہ کیا محسوس کریں۔ اس کی پر سوچ نگاہیں بڑی اماں پر جمی تھیں۔ اور ذہن جانے کن بھول بھلیوں میں ڈوب ابھر رہا تھا۔ شاید انیقہ نے موضوع بدل دیا تھا۔ ماحول اب بھی خوشگوار تھا۔ سب کے چہروں پر اب بھی ویسی ہی مسکراہٹیں بہار دکھا رہی تھیں۔ لیکن آریان اس ماحول سے یکدم کٹ گئی تھی۔ یوں ہی جیسے بھری بہار میں جب ہر طرف پھول ہی پھول کھلے ہوں کوئی نوخیز کلی اچانک شاخ سے ٹوٹ کر نیچے آ گرے۔

❁ ❁ ❁

سفید براق یونیفارم میں لمبے سیاہ بالوں کی چوٹی گوندھے سادہ سے چہرے کے ساتھ وہ اس وقت ابا میاں کی عدالت میں کھڑی تھی۔

"مسرت جہاں! آج سے آپ کا کالج آنا جانا شروع ہو رہا ہے۔ آپ کو پک اور ڈراپ کرنے کی ذمہ داری ہم نے شاکر حسین کے ذمے لگا دی ہے۔ یہ بتانے کی سردست ہم ضرورت نہیں سمجھتے کہ سکول اور کالج میں انسان پڑھائی کے حصول کے لیے جاتا ہے۔ اس لیے دیگر غیر نصابی سرگرمیوں میں مشغول ہونے کو ہم اچھا نہیں سمجھتے۔ آپ سمجھ رہی ہیں ناں ہم کیا کہنا چاہتے ہیں؟" شبیر حسین عمیق نگاہی سے مسرت جہاں کے پاکیزہ چہرے کو جانچ رہے تھے۔ شاید وہ نظروں ہی نظروں میں ان کے اعتماد کو ٹٹول رہے تھے کہ کیا ان کے گھر کی یہ ..... زمانہ سے انجان کلی اتنی مضبوط ہے کہ گھر کی چار دیواری سے باہر نکل سکے۔

"اجلے کپڑے پہننا مشکل نہیں ہوا کرتا بٹیا رانی! ان کے اجلے پن کو برقرار رکھنا مشکل ہوتا ہے۔ آپ گھر سے باہر ضرور جا رہی ہیں لیکن ہر دم اس گھر کی روایات کو اپنے ساتھ رکھیے گا۔ ہم مزید کچھ نہیں کہیں گے۔ تھوڑے کو ہی بہت جانیے۔" ابا میاں نے بات ختم کر کے چائے کی پیالی ہاتھ میں تھام لی۔ اماں بی نے ان کے ہاتھ میں پچاس کا نوٹ تھمایا اور وہ دونوں کو خدا حافظ کہتی ہوئی باہر نکلی آئیں۔ باہر آتے ہی فضا میں یوں گہرا سانس لیا جیسے بڑی دیر سانس روکے کھڑی ہوں۔ اپنے کمرے میں آ کر انہوں نے یونیفارم پر اوڑھنے والا میرون دوپٹہ تہہ کر کے فائل میں رکھا اور برقعہ جسے وہ خیمہ کہا کرتی تھیں۔ اوڑھ کر باہر آ گئیں۔ شاکر حسین اپنی بائیک چمکانے میں مصروف تھا۔

"آ گئی چڑیل! تم بھی میری آزادی سلب کرنے کی کوششوں میں لگی رہا کرو۔ آؤ بیٹھو۔" مسرت جہاں کو اس کی بات سن کر غصہ تو بہت آیا مگر ضبط کر گئیں۔ کہ اگر کچھ کہہ دیتیں تو شاکر حسین نے یہیں سب کچھ بھول بھال کر جھگڑا شروع کر دینا تھا۔ اور وہ ابا میاں کی عدالت کی وجہ سے پہلے ہی کافی لیٹ ہو چکی تھیں۔ سو چار و ناچار خلاف عادت خاموشی سے بائیک پر بیٹھ گئیں۔ شاکر حسین بائیک اسٹارٹ کر کے گھر سے باہر لے آیا۔ مسرت جہاں پہلے بھی سکول جاتی رہی تھیں لیکن آج جانے کیا بات تھی۔ سیاہ نقاب کے پیچھے سے بھی انہیں دنیا

نکھری نکھری، اجلی اجلی، نئی نئی سی لگ رہی تھی۔ یوں جیسے کائنات ساری کی ساری بدل کر ان کے سامنے آ گئی ہو۔ انہوں نے نئی کتابوں سے بھرا بیگ یوں دبوچ کر سینے سے لگا رہا تھا جیسے اس میں ہفت اقلیم کی دولت سنبھال رکھی ہو جس کے کھو جانے کا خدشہ لاحق ہو۔ جانے ذہن کس سوچوں میں غلطیاں وہ پیچاں تھا کہ کالج پہنچنے کی انہیں خبر تک نہ ہوئی۔

''اے! اب اترنا بھی ہے یا چھٹی تک یہیں بیٹھے رہنے کا ارادہ ہے۔'' شاکر حسین کی آواز انہیں حقیقت کی دنیا میں لے آئی۔ منزل آ چکی تھی یا شاید یہ وہ راستہ تھا جو انہیں ان کی من پسند منزل پر لے جا سکتا تھا۔ وہ بائیک سے اتر آئیں۔

''ایک بجے آ جاؤں گا لینے..... اس درخت کے نیچے میرا انتظار کرنا سمجھی۔'' گیٹ کے بائیں طرف لگے بڑے سے پیپل کے درخت کی طرف اشارہ کر کے انہیں سمجھانے کے بعد شاکر حسین نے بائیک کو گھوڑے کی طرح ایڑ لگائی اور پلک جھپکنے میں یہ جا وہ جا۔ مسرت جہاں تو جہاں کی کہاں کھڑی رہ گئیں۔ کالج کی لڑکیاں ابھی آ رہی تھیں۔ وہ بھی ان میں شامل ہو کر کالج کے گیٹ سے اندر داخل ہو گئیں۔ کہاں گورنمنٹ کا ایک سادہ سا مختصر سی عمارت پر مشتمل سیکنڈری سکول اور کہاں پوسٹ گریجوایٹ کالج۔ جس بات نے مسرت جہاں کو پریشان کیا وہ یہ تھی کہ کالج میں کوایجوکیشن سسٹم تھا۔ جگہ جگہ لڑکے لڑکیاں ٹولے بنائے کھڑے اور بیٹھے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ پریشان سی وزیٹرز لابی میں کھڑی دیکھ رہی تھی۔ غالباً اپنے ڈیپارٹمنٹ کے بارے میں عدم معلومات نے انہیں کچھ حواس باختہ کر دیا تھا۔ بمشکل برقع اتار کر تہہ کر کے انہوں نے بڑا سا میرون دوپٹہ اچھی طرح اوڑھ لیا۔ عجیب گاؤدی قسم کے لوگ تھے۔ جنہیں بے چاری مسرت جہاں کی طرف متوجہ ہونے کی فرصت ہی نہیں تھی۔

''ایکسکیوزمی مس! کیا میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں؟'' بھاری مردانہ آواز مسرت جہاں کو کچھ پریشان کر گئی۔ انہوں نے بوکھلا کر اپنے سامنے موجود شخصیت کو دیکھا تھا۔ مہذب لب و لہجہ اور سلجھی ہوئی شخصیت۔ مسرت جہاں کے بوکھلانے پر وہ بھی قدرے پیچھے ہٹ کر دیکھنے لگا۔ غالباً اپنی بات کا یہ ردعمل اس کے لیے غیر متوقع تھا۔

''وہ..... وہ سائنس ڈیپارٹمنٹ کس طرف ہے؟'' وہ کچھ ہکلا کر اپنا مدعا بیان کر گئیں۔ کسی نہ کسی سے تو انہیں پوچھنا ہی تھا۔ اب اس نے اپنی خدمات پیش کیں تو انہوں نے بھی جھٹ سے اپنا مسئلہ بیان کر دیا۔

''آئیے میرے ساتھ.....'' وہ آہستہ روی سے ان کے آگے آگے چل پڑا۔ مسرت جہاں کی مثال ایسے اندھے کی طرح تھی جسے بالکل انجان جگہ پر لا کر تنہا چھوڑ دیا جائے اور اسے کچھ سجھائی نہ دے رہا ہو کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے چل پڑیں۔

''آپ غالباً نیو ایڈمشن ہیں؟'' وہ جیسے پرسنل تذکرہ پوچھ رہا تھا۔

''جی ہاں!'' مسرت جہاں کے حلق سے مری مری سی آواز برآمد ہوئی۔ انہیں تو اپنا پہلا دن ہی بہت کٹھن لگ رہا تھا اور ابھی تو کئی سال پڑے تھے۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔

''میں یہاں انگلش ڈیپارٹمنٹ میں فورتھ ایئر کا سٹوڈنٹ ہوں۔ فرجاد علی نام ہے میرا۔'' وہ اسی طرح ان کے آگے آگے چلتے

ہوئے اپنا تعارف بیان کر رہا تھا۔ مسرت جہاں نے کوئی جواب نہ دیا۔ انہیں اس بات سے بھلا کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ کہ وہ کون ہے کیا کرتا ہے؟ البتہ اس مہربانی پر وہ اس کی شکر گزار تھیں کہ اس کی وجہ سے وہ بھٹکتے رہنے سے بچ گئی تھیں۔

''لیجیے مس! آپ کا ڈیپارٹمنٹ آ گیا۔'' وہ جیسے کسی بڑی فتح یا کامیابی کا اعلان کر رہا تھا۔ مسرت جہاں کے چہرے پر اطمینان اور سکون کا رنگ پھیل گیا۔ شاید انہیں خدشہ تھا کہ وہ کہیں ان کی غلط رہنمائی نہ کر رہا ہو۔ لیکن وہ ان کے ارادے کے برخلاف کافی اچھا شخص ثابت ہوا تھا۔

''بہت بہت شکریہ!'' منزل پر پہنچتے ہی ان کے حواس اور اعتماد بحال ہو گیا۔

''اٹس او کے..... ایسی کوئی بات نہیں'' وہ جانے لگا پھر جاتے جاتے جانے کیا یاد آیا کہ پلٹ کر ان کی طرف دیکھا اور وہ جو آگے بڑھنے لگی تھیں اس لیے رک کر اپنی جانب دیکھتا پا کر رک گئیں۔

''میں نے یہ کہنا تھا کہ یہ آپ کے ہمسایہ میں میرا ڈیپارٹمنٹ ہے۔ کسی بھی پریشانی میں آپ بلا جھجک مجھ سے کنسلٹ کر سکتی ہیں۔'' وہ یہ کہہ کر رکا نہیں آگے بڑھ گیا مسرت جہاں بھی اپنے ڈیپارٹمنٹ کی طرف بڑھ گئیں۔ باقی کا دن کافی سکون سے گزرا۔ تین پیریڈز لگے تھے باقی دن فری گزر گیا۔ مسرت جہاں کے لیے یہ دنیا انوکھی سی تھی۔ رنگین اور شاید کسی حد تک پراسرار بھی۔ وہ اپنی فطری سادگی اور معصومیت کے باعث کسی سے زیادہ گھلی ملی تو نہیں تھیں لیکن انہیں یہ ماحول کچھ عجیب سا ضرور محسوس ہوا تھا۔ کہاں ان کا گھرانہ خیمہ پوش خواتین جو بازار جانے کو بھی گناہ تصور کرتی تھیں۔ اور کہاں یہ فیشن زدہ مغربیت کی دلدادہ لڑکیاں جو لڑکوں جیسے ڈریسز زیب تن کیے بالوں کو آزادی کے نام پر کٹوا کر عجیب و غریب ہیئت بنائے ہوئے تھیں۔ آزادانہ لڑکوں سے میل جول اور دوستیاں گانٹھ رہی تھیں۔ ''شاید اسی لیے ابا میاں مجھے اجازت نہیں دے رہے تھے۔ وہ تو مرد ہیں ناں باہر کی دنیا سے اچھی طرح واقف شاید انہیں یہ خدشہ ہو کہ میں بھی ان لڑکیوں جیسی ہو جاؤں گی!'' اپنی اس سوچ پر وہ خود ہی ہنس پڑیں۔

''اب ایسی بھی گئی گزری نہیں ہوں جو یوں اوٹ پٹانگ حرکتیں کرنے لگ جاؤں۔ ابا میاں کا خدشہ بے بنیاد تھا میں یہ ضرور ثابت کروں گی۔'' انہوں نے گویا دل میں مصمم ارادہ کر لیا۔ کالج آف ہو چکا تھا۔ انہیں درخت کے نیچے کھڑے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ لیکن شاکر حسین کا کہیں کوئی پتا نہیں تھا۔ فرجاد بائیک پر سوار ان کے پاس رک کر انہیں آفر دینے کے بعد جا چکا تھا۔ کالج بھی تقریباً خالی ہو چکا تھا۔ پہلا ہی دن اور ایسا عجیب و غریب انہیں شاکر حسین پر غصہ آنے لگا تھا۔

''آ جائیں ایک دفعہ میں کسی طرح گھر پہنچ جاؤں پھر دیکھنا اماں بی سے دس جوتے نہ پڑوائے تو۔'' سڑک تقریباً سنسان ہو چکی تھی اور اب مارے خوف کے ان کی جان آدھی ہو رہی تھی۔ اور اس سے پہلے کہ وہ بے ہوش ہو کر زمین کا بوسہ لینے کو لپکتیں سامنے سے آتے شاکر حسین کو دیکھ کر ان کی جان میں جان آ گئی۔ شاکر حسین نے ان کے بالکل سامنے بائیک روکی۔

''اے! فوت تو نہیں ہوئیں ڈر کے مارے۔'' انہیں خاموش کھڑا دیکھ کر شاکر حسین ان کا کندھا ہلا کر بولا۔ جواب میں

انہوں نے ڈبڈباتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''ارے ارے! تم تو رونے لگ گئیں۔ سوری بہنا! وقت کا صحیح پتا نہیں تھا۔ میں تو دیکھو ٹھیک ایک بجے پہنچ آیا ہوں مجھے کیا پتا کہ کالج ساڑھے بارہ بجے آف ہو جائیگا۔ اگر کالج جلدی آف ہو جایا کرے تو وزیٹرز لابی میں میرا انتظار کیا کرنا یہاں نہیں۔'' انہیں بہلا پھسلا کر بائیک پر بٹھا کر شاکر حسین گھر لے آیا۔ لیکن ان کا موڈ کچھ زیادہ اچھا نہیں تھا۔ سو منہ سر لپیٹ کر پڑی رہیں۔ شاید انہیں اس بات کا غصہ تھا کہ پہلا ہی دن گزرا تھا کالج کا اور پریشانیوں میں گھری رہی تھیں۔ مستقبل میں کیا ہونا تھا۔ شام کو سو کر اٹھنے پر البتہ طبیعت بحال تھی۔ نہا دھو کر فریش ہو کر وہ باہر صحن میں آ گئیں جہاں گھر کی خواتین بیٹھی باتوں میں مصروف تھیں۔ موضوع گفتگو زاہدہ بھابھی تھیں جو چند روز سے اپنے میکے میں مقیم تھیں۔ بابر بھائی جتنے تحمل اور بردبار تھے زاہدہ بھابھی اسی قدر تیز مزاج تھیں۔ اماں بی اور ابا میاں کے ساتھ تو انہوں نے کبھی جھگڑا نہیں کیا تھا۔ نہ ہی گھر کے دیگر افراد کو ان سے کوئی شکایت تھی۔ لے دے کے بچے تھے بابر بھائی تو ان کے پاس شکوے شکایات کے دفتر کھلے تھے۔ جانے کیا بات تھی دونوں میاں بیوی ایک دوسرے سے محبت کرنے کے باوجود ایک دوسرے کی بات سمجھ نہ پاتے تھے۔ زاہدہ بھابھی چھوٹی سی بات پر بھڑک اٹھتی تھیں۔ جھگڑا ہمیشہ ان کی وجہ سے طول پکڑتا تھا۔ پھر گھر کا کوئی نہ کوئی فرد بیچ بچاؤ کرا دیتا تھا۔ لیکن اس بار شاید معاملہ کچھ سنگین نوعیت کا تھا جو وہ فواد اور مہوش کو بھی اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔ اور بابر بھائی بھی اس بار کچھ زیادہ ہی خاموش اور بے پرواہ سے بنے پھر رہے تھے۔

''اماں بی.....!'' مسرت جہاں صحن میں آ کر اماں بی کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گئیں۔

''کیا بات ہے؟ زاہدہ بھابھی کہاں ہیں؟ کیا پھر روٹھ کر گئی ہوئی ہیں؟''

''ارے بیٹا! جانتی تو ہو مزاج کی تیز ہے دل کی بری نہیں پر یہ بات بابر کو کون سمجھائے۔ روٹھ کر میکے جا بیٹھی ہے لاکھ کہا بیٹا جا کر لے آؤ۔ اسی مان سمان میں گئی ہوگی کہ میاں منا کر واپس لے آئے گا۔ مگر یہ بھی رٹ لگائے بیٹھا ہے کہ جیسے گئی ہے اسی طرح واپس آ جائے میں لینے نہیں جاؤں گا۔'' اور میرا فہدی کے بغیر دل نہیں لگ رہا۔'' اماں بی افسردہ سی تھیں۔

ایسا نہ ہو کہ میں جاؤں اور وہاں سے خالی ہاتھ بھیج دی جاؤں۔ یہ بے عزتی مجھ سے برداشت نہیں ہوگی۔''

''ارے نہیں اماں بی! زاہدہ کم سے کم آپ کے ساتھ ایسا رویہ نہیں رکھے گی۔ مجھے یقین ہے۔'' شینا بھابھی عصر کی نماز سے فارغ ہو کر یہیں آ بیٹھی تھیں ان کی بات سن کر اماں بی نے پرسوچ انداز میں سر ہلا دیا۔ مسرت جہاں جو شاکر حسین کی شکایت کرنے آئی تھیں۔ گھریلو پریشانی میں بھول بھال گئیں۔

☆.....☆.....☆

''ویسے بھابھی فیضی..... آپ نے دیکھی ہے وہ لڑکی جو دو تین دنوں سے یہاں آئی ہوئی ہے یا شاید لائی گئی ہے۔'' حدیقہ کا انداز تمسخرانہ تھا۔ فیضی چچی اظہر چچا کے لیے ناشتہ تیار کرنے میں مصروف تھیں۔

''ارے حدیقہ! ہمیں کیا کوئی کچھ کرتا پھرے..... ہماری صحت پر کیا اثر پڑتا ہے۔ پھر بڑی اماں نے اسے قبول کرلیا۔ بھابھی شینا الگ اس کی طرفدار ہیں۔ بھابھی مقسوم کی بھی ساری ہمدردیاں اس کے ساتھ ہیں۔ پھر دیکھنے میں وہ کسی اچھے خاندان کی لڑکی لگتی ہے۔ سلجھی ہوئی باوقار سی۔'' فیضی چچی نے گویا بات ختم کرنا چاہی۔

ارے کیوں کوئی کچھ کرتا پھرے۔ بھرپرے گھر میں ایسے غلط اقدام کی حوصلہ افزائی کا نتیجہ پتا ہے کیا نکل سکتا ہے۔ گھر میں بچیاں بھی ہیں کل کو ان کے ذہنوں پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔ لگتا ہے اس گھر کے مکینوں کے لیے پہلا جھٹکا ناکافی تھا۔ ماضی میں پیش آنے والے سانحے سے بھی کوئی سبق نہ سیکھا ان لوگوں نے۔'' حدیقہ کی زبان زہر اگل رہی تھی اس کی کچن کے دروازے کی جانب پشت تھی۔ سو وہ جان نہ سکیں کہ ان کا کہا ہوا سن کر اندر آئی اماں بی کا چہرہ کیسے دھواں دھواں ہوگیا تھا۔ وہ لرزتے قدموں سے واپس پلٹیں۔ دیوار کا سہارا لیا۔ حوادث زمانہ نے اس کے وجود کو ریت کی دیوار سے بھی زیادہ کمزور کردیا تھا۔ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی وہ اپنے کمرے میں آگئیں۔ ان کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔

''الٰہی! عمر کی نقدی ختم ہونے میں کیوں نہیں آتی۔ شبیر حسین آپ مجھ سے زیادہ نیک تھے۔ پرہیزگار متقی تھے۔ سو اوپر والے نے ذلت کی زندگی سے عزت کی موت دینی بہتر جانی تھی۔ اور میرے لیے اس دنیا میں بس خارزدہ سانس رہ گئے ہیں۔ ہر آتی جاتی سانس حلق میں نیزے کی انی کی طرح چبھتی ہے۔ زخم زخم وجود لیے کب تک جیوں گی میں۔'' وہ بے آواز رو رہی تھیں۔ کیا ایسا اسم اعظم تھا جو انہیں اس اذیت سے نجات دلا دیتا۔ ماضی کے دھندلکے ان کی آنکھوں کی پتلیوں پر کانچ کے باریک روں کی مانند چبھ رہے تھے۔ اکھڑی اکھڑی سانسیں لیتی وہ اپنے بستر پر نیم جاں سی ڈھیر ہوگئیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے کوئی مسافر خاردار راستوں پر آبلہ پا چلتا ہوا اذیت کا بحر بیکراں عبور کرکے جب منزل پر پہنچے تو اسے پتا چلے کہ اس کی تو ساری مسافت رائیگاں گئی۔ یہ منزل اس کے لیے تو نہیں تھی۔ اماں بی کی حالت بھی اس وقت ایسے ہی لٹے ہوئے مسافر جیسی تھی۔ اپنے لخت، لخت دل کو سنبھالے، زبان پر خاموشی کا قفل لگائے، آنکھیں بند کیے وہ ماضی کی راکھ تخیل کے ہاتھوں سے ٹٹولنے لگیں۔ یقیناً کوئی چنگاری تھی جس کی حدت وہ اپنی سوچوں میں محسوس کرتی تھیں۔

☆.....☆.....☆

موسلا دھار بارش ہو رہی تھی سورج کی نارنجی شعاعوں پر بادل اپنے وجود کی سیاہی طاری کیے جیسے اپنی فتح کا جشن منا رہے تھے۔ پھول، پودے نکھر گئے تھے۔ لان کی گھاس تروتازہ ہوکر پہلے سے زیادہ اچھی لگنے لگی تھی۔ گھر میں آریان، انیقہ، روبیہ کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ زاہدہ چچی کی خالہ جو ایک طویل عرصے سے بستر علالت پر تھیں۔ ان کے فوت ہوجانے کی اطلاع پر گھر کے تمام افراد ان کے ہاں گئے ہوئے تھے۔ وہ پشاور کے قریبی شہر نوشہرہ میں سکونت پذیر تھیں۔ اس لیے روبیہ کا خیال تھا کہ سب کی واپسی کل شام سے پہلے نہیں ہوسکتی۔ البتہ ڈاکٹر فواد ایک ضروری کیس کے سلسلے میں کلینک چھوڑنے پر تیار نہ تھے۔ سو وہ گھر پر ہی رہ گئے۔ یوں بھی کسی نہ کسی مرد کا گھر پر رہنا ضروری تھا۔ روبیہ اپنی جاب سے چھٹی نہیں کرسکتی تھی۔ اور انیقہ کے لیے اب یوں سال کے آخر میں کالج سے فرار نقصان دہ تھا۔

''آریان آپی! ایسا کرتے ہیں آج ماما کی راج دھانی میں تخریب کاری کرتے ہیں۔'' انیقہ بڑے پرجوش انداز میں بولی۔ وہ تینوں اس وقت روبیہ، انیقہ کے مشترکہ کمرے میں براجمان تھیں۔ صبح کے دس بج رہے تھے۔ ڈاکٹر فواد کلینک جا چکے تھے۔ ماسی گھر بھر کی صفائی کر کے اور برتن دھو کر جا چکی تھی۔ انیقہ، روبیہ اور آریان نے تمام بستر وغیرہ تہہ کیے تھے اور کمروں میں پھیلی چیزوں کو ٹھکانے لگا کر اب اطمینان سے بیٹھی کاجوؤں سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔

''کیا مطلب!'' آریان نے سوال کیا۔ روبیہ نے بھی بھنویں اچکا کر انیقہ کی طرف دیکھا۔

''مطلب یہ کہ اس قدر بور دن یوں بیٹھے بیٹھے گزرے گا نہیں۔ کتابیں پڑھنے کا ابھی وقت نہیں ہوا۔ سو کچن میں جا کر کوئی نیا نویلا، انوکھا، اچھوتا سا کام کیا جائے۔ کوئی اسٹائلش سی ڈش تیار کی جائے۔ لنچ کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ اور وقت بھی گزر جائے گا۔'' انیقہ نے گویا ایک قیمتی اور مفت مشورہ شیئر کیا۔

''پہلی بات تو یہ ڈیئر سسٹر کے پڑھنے کا کوئی خاص وقت نہیں ہوتا۔ اور جس قسم کی اسٹائلش ڈش آپ بنائیں گی۔ اگر لنچ میں اس سے استفادہ کیا گیا تو نتائج کی ہولناکی کا تصور ہی لرزا دینے کے لیے کافی ہے۔ اور آخری بات یہ کہ ماما کہہ گئی ہیں۔ فریز میں چکن چیز مصالحہ لگا کر رکھے ہوئے ہیں دل چاہے تو وہ تیار کر لینا یا پھر کباب تل لینا۔ روٹی وہ صبح جاتے ہوئے بنا گئی ہیں۔'' روبیہ بڑے ٹھنڈے لہجے میں بولتی ہوئی گویا انیقہ کے خانسامی جذبات کا تیا پانچہ کر گئی۔

''کبھی ہو ہی نہیں سکتا کہ یہ گھر ترقی کر جائے۔ جس گھر میں مس روبیہ جیسے ڈکٹیٹر ہوں وہاں جمہوریت بے چاری کیا مجال جو دم بھی مار سکے۔'' انیقہ کوفت بھرے لہجے میں بولی۔ آریان اب تک خاموش بیٹھی ان کی باہمی گفتگو پر محض مسکرانے پر اکتفا کر رہی تھی لیکن لگ رہا تھا جیسے حسب معمول امن عامہ کے متاثر ہونے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔

''روبیہ کیا ہرج ہے؟ کوشش کرنے دو اسے۔ کرے گی تو سیکھے گی۔ آریان نے انیقہ کی طرف داری کی تو روبیہ خاموش ہو گئی۔ غالباً آریان کی سلجھی ہوئی طبیعت کے باعث اس نے اس سے اختلاف کرنا مناسب نہ سمجھا تھا۔

''ٹھیک ہے، آپی تم کہتی ہو تو مان لیتے ہیں۔ لیکن ان موصوفہ سے یہ ضرور کہہ دو کہ کچن کا کباڑا نہیں ہونا چاہیے۔ جو چیز جہاں سے اٹھائے۔ استعمال کے بعد وہیں رکھ دے۔ کیونکہ کام والی ماسی جا چکی ہے اور کاٹھ کباڑ پھیلا کر سمیٹنے کی عادت نہیں ہے ان محترمہ میں۔''

''ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے..... آریان آپی میرے ساتھ ہی تو ہونگی کچن میں۔ میں پھیلاتی جاؤں گی یہ سمیٹتی جائیں گی۔ کیوں آپی.....؟'' انیقہ شرارت بھرے لہجے میں آریان سے مخاطب ہوئی تو وہ مسکرا دی۔ وہ تینوں ہی کچن میں آ گئیں۔ انیقہ نے کچن کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ سارے کیبنٹ کھنگال ڈالے اور طے یہ پایا کہ چکن جنجر انیقہ تیار کرے گی۔ سلاد اور جیلی بنانے کی ذمہ داری روبیہ کی ٹھہری اور سویٹ ڈش آریان نے اپنے ذمے لے لی۔ دو گھنٹوں کی محنت کے بعد جب انہوں نے ڈائننگ ٹیبل پر اپنی اپنی تیار کی ہوئی ڈشیں رکھیں۔ تو تینوں ہی کی بھوک چمک اٹھی تھی۔ ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ وہ تینوں میز کے گرد بیٹھ گئیں۔

''کتنا اچھا ہو جو فواد بھائی بھی آ جائیں.....'' انیقہ پلیٹ اپنے آگے رکھتے ہوئے بولی۔

''تھنک آف دا ڈیول اینڈ دا ڈیول از ہیئر۔'' ڈرائنگ روم کے دروازے سے ڈاکٹر فواد نے جھانکا۔ وہ شاید ابھی آئے تھے۔ اور گھر میں اپنی فیملی کی عدم موجودگی کے باعث شینا پھپھو کے پورشن کی طرف آ گئے تھے۔

''آیئے بھائی.....'' انیقہ کے بلانے پر وہ اندر آ گئے اور آگے بڑھ کر انیقہ کے دائیں طرف رکھی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئے۔

''لگتا ہے آج کچن کو کسی اناڑی کے ہاتھ لگے ہیں۔'' خوبصورت سی سجی سجائی ٹیبل کو دیکھ کر انہوں نے ستائش اور شرارت کا ملا جلا انداز اپنایا۔

''بھائی! یہ ماڈل ہے ابھی آپ نے کوئی ایک ڈش بھی نہیں چکھی۔ رائے کھانے سے پہلے نہیں..... بعد میں دی جاتی ہے۔ ویسے آپ کا کیا خیال ہے کہ یہ صرف ایک ہاتھ کا کمال ہے۔'' انیقہ بولی۔

''نہیں خیر ہمارے گھر میں ابھی کوئی اس قدر پریکٹیکل بھی نہیں ہوا کہ اتنا کام تنہا ہی نمٹا لے۔ ویسے تو میں بھی جانتا ہوں کہ اس ٹیبل پر موجود سب سے مشکل ڈش تم نے ہی بنائی ہوگی۔'' فواد ہنوز اسی انداز میں گویا ہوئے۔

''کونسی.....؟'' انیقہ کا تجسس اور اشتیاق دیدنی تھا۔

''یہی..... جیلی.....'' فواد نے جیلی کے باؤل کی طرف اشارہ کیا۔ انیقہ نے ناراضگی سے ان کی طرف دیکھا۔

''کاش بھائی! آپ مجھ سے چند دن چھوٹے ہوتے۔'' وہ دانت کچکچاتے ہوئے بولی۔

''ہوں..... تاکہ ڈرائنگ روم میں رکھے سارے کشن اور گھر میں موجود سارے تکیے میرے سر مبارک کی مزاج پرسی کر رہے ہوتے۔'' انہوں نے چکن جنجر پلیٹ میں نکالتے ہوئے شوخ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''روبیہ..... آپ دونوں نے کیا چپ شاہ کا روزہ رکھا ہوا ہے؟'' فواد اب روبیہ اور آریان سے مخاطب تھے۔ ان کی بات سن کر آریان نے قدرے سٹپٹا کر ان کی طرف دیکھا تھا۔ انہوں نے بھی مخاطب تو روبیہ کو ہی کیا تھا لیکن ان کی کالی گھور شرارت بھری آنکھیں آریان کے صبیح رخساروں پر ٹکی ہوئی تھیں۔ نوالہ جیسے اس کے حلق میں اٹکنے لگا۔ اس نے سامنے پڑا پانی کا گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔

''روبیہ! تمہاری جاب کیسی جا رہی ہے؟'' فواد، آریان کو مزید بوکھلانے کی بجائے روبیہ سے بات چیت کرنے لگے۔

''ایکدم فرسٹ کلاس.....'' اس نے جواب دیا۔

وہ روبیہ اور انیقہ کے ساتھ خوش گپیوں کے درمیان کھانا کھاتے رہے۔ آریان کو انہوں نے مخاطب نہیں کیا۔ اس نے بھی چند نوالوں کے بعد کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ اور سر جھکائے بظاہر اپنے ہاتھوں کے ناخنوں کا جائزہ لے رہی تھی لیکن اس کی توجہ انہی کی باتوں کی طرف تھی۔ کھانا کھانے کے بعد کچھ دیر رک کر ڈاکٹر فواد تو کلینک چلے گئے۔ جبکہ انیقہ اپنی بیالوجی کی بک اٹھا کر سٹڈی روم سدھار گئی۔ روبیہ اور آریان نے مل کر کچن صاف کیا اور کمرے میں آ گئیں۔

''اینی! تم نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟'' روبیہ اور وہ بیڈ پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ روبیہ کے پوچھنے پر آریان کے ہونٹوں پر پھیلی مسکراہٹ معدوم ہوگئی۔ جانے کتنے جتنوں سے تو وہ اس مصنوعی مسکراہٹ کو ہونٹوں پر سجائے خود کو جبراً خوش ظاہر کرنے کی کوشش کرتی تھی۔

''کیا بتاؤں اپنے بارے میں..... بہت سادہ سی کہانی ہے۔ ماں باپ کو دیکھا نہیں۔ ہوش سنبھالتے ہی رشتے کی ایک خالہ کے گھر میں خود کو پایا۔ خالہ نے سگی ماں سے بڑھ کر پیار کیا۔ اور آج سے چند دن پہلے محبت اور خلوص کا وہ واحد سہارا بھی مجھ سے چھن گیا۔ اس بے اماں دنیا میں اپنی زندگی کی چند سانسیں بچانے کی تگ و دو کر رہی ہوں اور بس..... اتنی سی داستان ہے میری۔

''تو کیا خالہ کا اور کوئی رشتے دار بھی نہیں تھا؟''

''کیوں نہیں تھے..... بہت سے رشتے داری کے دعویدار پیدا ہو گئے ان کے مرجانے کے بعد۔ اس لیے کہ خالہ کی ساری زندگی کی کمائی تین کمروں کا وہ گھر ہے جو مرتے مرتے وہ میرے نام کر گئیں۔ وہ لوگ اس گھر کی خاطر کسی بھی انتہا تک جا سکتے تھے..... یہاں تک میری جان تک لے سکتے تھے۔'' آریان کی بات سن کر روبیہ نے حیرت سے دیکھا۔

''کیا مطلب.....؟ کیا انسانی جان اتنی بے وقت ہوتی ہے۔''

''اس سے بھی کہیں زیادہ..... ہم انسان مہذب دنیا کے باسی۔ اپنے اندر کے حیوان کو سلائے۔ شرافت کا لبادہ پہنے خود کو پارسا بنانے اور ظاہر کرنے کی کوششوں میں لگے رہتے ہیں لیکن جب بھی اندر کا سویا ہوا حیوان جاگ جائے تو یہ مہذب دنیا جنگل کے قانون اور تہذیب سے بھی بے بہرہ لگنے لگتی ہے۔ ایک طرف کسی مرتے ہوئے کو خون دے کر بچایا جاتا ہے تو دوسری طرف چند سو روپوں کی خاطر، تھوڑی سی زمین کی خاطر کسی کا خون بہایا جاتا ہے۔'' آریان کے لہجے میں تلخیوں کا زہر گھلا ہوا تھا۔ وہ دونوں ہم عمر تھیں۔ لیکن تجربے میں آریان اس سے کہیں آگے تھی۔ اس نے ٹھوکریں سہی تھیں۔ تلخ حالات کے تھپیڑے برداشت کیے تھے۔ جذبات و احساسات کا خون ہوتے دیکھا تھا۔ جبکہ روبیہ جو ماں کی نرم گرم آغوش میں دبکی ہوئی تھی وہ دنیا کی تلخ اور بنجر حقیقتوں کا مشاہدہ کیسے کر سکتی تھی۔ اس کی سوچ اس گھر، اس گھر کے مکینوں، اپنے سکول اور اپنی جاب سے آگے ہی نہیں جا پائی تھی۔ سو وہ حیرت کا بت بنی آریان کی باتیں سن رہی تھی۔

''اینی! پھر تم نے کیا سوچا ہے؟..... اب کیا کرنا ہے؟''

''یہی سوچا ہے کہ کسی خواتین کی فلاح و بہبود کے ادارے سے رابطہ کروں۔ کوئی چھوٹی موٹی نوکری کر لوں گی۔ زندگی کسی نہ کسی طرح تو گزارنی ہی ہے۔'' آریان کے افسردہ لہجے میں محرومیاں چیخ رہی تھیں۔

''پاگل ہو گئی ہو کیا؟ تم ایسا نہیں کر سکتیں۔ بڑی اماں ماما ہم دونوں تمہیں ایسا ہرگز نہیں کرنے دیں گے۔ اس گھر میں جہاں پہلے سے اتنے افراد بس رہے ہیں کیا تمہارے لیے جگہ نہیں نکل پائے گی۔'' روبیہ جذباتی انداز میں بولی تو آریان پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگی۔

''روبی! میں کسی کے لیے بوجھ بننا گوارا نہیں کر سکتی۔ یقین کرو تم سب لوگ بے حد اچھے اور مخلص ہو لیکن میں کیا کروں میرا دل

نہیں مانتا کہ میری وجہ سے کسی کو بے جا تکلیف ہو۔"

"اپنی! تم نے کیا تکلیف دی ہے ہمیں رہی بات بوجھ بننے کی تو اگر تم زیادہ محسوس کرتی ہو تو میرے ساتھ سکول میں جاب کرلو۔ اچھی سیلری ملے گی۔ تمہارا بہت اچھا گزارا ہو سکے گا۔ لیکن پلیز آئندہ یہ گھر چھوڑنے کی بات مت کرنا۔" روبیہ کے خلوص پر آریان کی پلکیں نم ہوگئیں۔ اسے لگا جیسے اوپر والے نے اس کی خاطر کہیں پڑاؤ کا مقام چن لیا ہے۔ اس کی آبلہ زدہ روح کو قیام کا اذن مل گیا ہے۔

"ٹھیک ہے روبی! میں سوچوں گی۔" وہ کسی گہری سوچ کے زیر اثر بولی۔

وقت نے اسے کتنا بے اماں کر دیا تھا۔ کتنا بے وقعت کر دیا تھا۔ اس کی ذات تو اب اس کی نظروں میں شاخ سے ٹوٹے ہوئے زرد خشک پتے سے بھی کہیں زیادہ بے مول ہوگئی تھی۔ زندگی ایک بوجھ کی صورت اس کی دھڑکنوں پر مسلط تھی۔ امداد سے یہ بوجھ اٹھانا تھا۔

☆.....☆.....☆

پھر روبیہ نے ہی اسے اپنی پرنسپل سمیرا ضیاء اور سکول کے مینجنگ ڈائریکٹر سر آفاق سے ملایا۔ ایک مختصر سے انٹرویو سے ہی ان دونوں نے آریان کی قابلیت کا اندازہ لگا لیا۔ ان دنوں میتھ کی ٹیچر چھٹی پر تھی سو آریان کو ایز اے کیژول ٹیچر اپائنٹ کر لیا گیا۔ آریان کو سکول کا ماحول بہت اچھا لگا۔ ننھے منے بچے، پڑھتے لکھتے کھیلتے کودتے دل کو بھلے لگتے ہیں۔ آریان نے سوچا۔ کسی نے کتنا سچ کہا ہے۔

"جب دنیا تمہیں بدصورت لگنے لگے تو کسی بچے کو آئس کریم کھاتے ہوئے دیکھ لو۔"

ان معصوم، زمانہ ناآشنا چہروں کا حسن ہی دنیا کی بدصورتی کو کم کر سکتا ہے۔ اسے پلے گروپ کا انچارج بنایا گیا۔ بڑی کلاسز میں میتھ کے تین چار پیریڈ لینے کے علاوہ باقی کا تمام وقت پلے گروپ کے ساتھ گزرتا تھا۔ اصل میں روبیہ بھی پہلے پلے گروپ کی ہی ٹیچر تھی۔ اور اس نے کہہ کر اسے اپنے ساتھ لگوایا تھا۔ آریان کو پرنسپل اور اسٹاف بھی بے حد اچھا لگا۔

"زندگی اب کچھ سہل ہو جائیگی۔" اس نے سوچا۔

پھر آنے والے دنوں اسے لگا کہ اس کی یہ سوچ کچھ ایسی غلط بھی نہیں تھی۔ دن کا آدھا حصہ سکول میں گزرنے کے بعد گھر پر وہ شینا پھپھو کا ہاتھ بٹاتی۔ باقی ماندہ وقت وہ بڑی اماں کے سنگ گزارتی۔ انیقہ کی طرح بڑی اماں اس کی بھی بہت گہری دوست بن گئیں۔ اسے یہاں رہتے ہوئے تقریباً ایک ماہ ہونے کو تھا لیکن جو اسے یہاں تک لانے کا سبب بنا تھا اس نے تو جیسے بھلا ہی دیا تھا۔ چند ایک بار کے علاوہ اس نے اس کا حال تک دریافت نہیں کیا تھا۔ شاید وہ مطمئن تھا کہ آریان محفوظ ہاتھوں میں ہے۔

☆.....☆.....☆

آج سکول کی چھٹی تھی سو روبیہ، انیقہ اور آریان تینوں شینا پھپھو کے ساتھ کام میں لگی ہوئی تھیں۔ شینا پھپھو کے اپنائیت بھرے رویے نے کچھ ہی عرصے میں آریان کو ان کے بہت قریب کر دیا تھا۔ جاب کے معاملے میں بھی وہ کافی حد تک مطمئن ہو چکی تھی۔ اس نے اپنی اس بے اماں زندگی کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا تھا۔ شاید اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اس کی حیثیت خشک زرد خزاں رسیدہ پتے جیسی تھی

جانے حالات کے تھپیڑے اسے کہاں سے کہاں لے جائیں۔ابھی کچھ طوفان تھما تھا اس کے پاؤں زمین پر ٹکے ہوئے تھے۔نگاہ اٹھاتی تو نیلا چھار فلک بھی نظر آتا تھا۔اور یہی غنیمت تھا۔اسے زیادہ کی طلب بھی نہیں تھی۔چند مہربان مگر نا آشنا چہروں کے بیچ وہ اپنوں کی بے حسی کو بھلانے کی تگ ودو میں تھی۔

''اینی! آج بازار چلو گی میرے ساتھ؟'' روبیہ دھلے ہوئے کپڑے چھت پر پھیلا کر نیچے آئی تو لان میں اسے سبزی بناتے دیکھ کر ادھر ہی آ گئی۔

''کیوں؟ کچھ خاص شاپنگ کرنی ہے۔'' آریان نے پوچھا۔ابھی دو چار دن پہلے ہی تو شینا پھپھو نوشہرہ سے واپسی پر ان تینوں کے لیے کافی کچھ خرید کر لائی تھیں۔

''یار! کل تنخواہ ملی ہے اور جب تک تنخواہ میرے پرس میں پڑی رہی گی مجھے چین نہیں آتا۔مجھے ایک ہی دن میں ساری سیلری خرچ کر کے مزہ آتا ہے۔''

''کمال ہے پورے مہینے کی محنت ایک ہی دن میں اکارت۔افسوس نہیں ہوتا کیا؟'' آریان کو اس کی بات سن کر حیرت ہوئی تھی۔

''ارے یہی تو عیاشی ہے۔باقی کا سارا خرچ ماما کے ذمے۔ان پیسوں سے صرف میں اپنے مشاغل کی تسکین کرتی ہوں۔مثلاً ڈائجسٹس، بکس، کیسٹس وغیرہ وغیرہ۔بہر حال کیا تم نے نہیں چلنا؟ ممکن ہے بازار جا کر تمہیں بھی کچھ نہ کچھ یاد آ جائے خریدنے کے لیے۔''

''ہاں چند ایک چیزیں لینی ہیں میں نے.....ٹھیک ہے شام میں چلے چلیں گے۔'' آریان کا جواب سن کر روبیہ اندر کی جانب بڑھ گئی۔

مالی لحاظ سے مستحکم ہونے کے باوجود شینا پھپھو زیادہ تر کام اپنے ہاتھ سے کرتی تھیں۔خاص طور پر کوکنگ۔جبکہ آریان نے دیکھا تھا کہ باقی چچیاں ہر کام ماسیوں کے سپرد کر کے سارا دن فارغ رہتی ہیں۔خاص طور پر اسے حدیقہ چچی کے مشاغل بہت عجیب لگے تھے۔چھوٹے چھوٹے بچوں کو بالکل نظر انداز کر کے وہ کسی پنڈولم کی طرح بازار، سلمنگ سنٹر یا بیوٹی پارلر کے درمیان چکراتی رہتی تھیں۔شولڈر کٹ سلکی بالوں کے ساتھ خوب فربہی مائل پھیکے شلجم جیسی رنگت والی حدیقہ چچی اسے تو بالکل متاثر نہ کر سکی تھیں۔خاص طور پر ان کا دیکھنے کا سٹائل ایسا ہوتا تھا۔جیسے ان کے سوا ساری دنیا بے وقعت وحقیر ہے۔آریان کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ ان سے اس کا سامنا کم ہو۔بلکہ ہو ہی نہ تو زیادہ بہتر ہے۔

☆.....☆.....☆

بازار کی رونقیں اپنے عروج پر تھیں۔روبیہ اور وہ دونوں اس وقت فیضان آرکیڈ میں موجود تھیں۔روبیہ زور شور سے دکاندار کے ساتھ بھاؤ تاؤ میں مصروف تھی۔آریان وہاں کھڑی بوریت محسوس کرنے لگی۔اس کی آنکھیں اردگرد بکھرے انسانوں کے چہروں کو ٹٹولنے لگیں۔

''کیا یہ سب بے فکرے، مست انسان اسی دنیا میں آباد ہیں۔یہ جن کے چہروں پر خوشیاں رنگوں کی صورت بکھری ہوئی

تھیں۔ جن کی آنکھیں ہر روز نئے خوابوں کی تعبیریں پا کر آسودہ اور مطمئن نظر آ رہی ہیں۔ یہ دھانی آنچلوں والی لاابالی سی لڑکیاں، مجھ سے چھوٹی، کچھ بڑی اور کچھ ہم عمران کے گھر ہوتے ہوں گے۔ گھروں میں بسنے والے ہر رشتے کی آسودگی اور سکون انہیں میسر ہوگا۔ ہر آرزو کا مل جانا ان کے لیے کوئی مشکل یا ناممکن نہیں تو..... تو پھر اے اللہ! تیری اس اتنی بڑی دنیا میں میں کس لیے اکیلی ہوں..... میری آنکھیں خواب دیکھنے سے کیوں ڈرتی ہیں۔ میں خوشیوں کا لمس کیوں نہیں پا سکتی۔'' وہ روبیہ کے نزدیک ہی کھڑی تھی لیکن خیالوں کی دنیا میں جانے کہاں سے کہاں پہنچ چکی تھی۔ اسے کچھ پتا نہیں چلا روبیہ نے کیا خریدا۔ لیکن اچانک اس کی کھوئی ہوئی آنکھوں میں دو ہیولے سے کسی نشتر کی طرح چبھے تھے اور وہ ہوش کی دنیا میں آ گئی۔ بڑے سے گلاس ڈور کے باہر سکیورٹی گارڈ کے نزدیک کھڑے وہ دو آدمی اس کی آنکھوں کے بالکل سامنے تھے۔ گھنی مونچھوں اور سیاہ کالی داڑھیوں والے وہ دونوں بھاری بھرکم شخص اپنے حلیے اور انداز سے ہی کچھ اور دکھائی دے رہے تھے۔ اس کے قدموں تلے سے جیسے زمین ہی نکل گئی۔ اس نے اپنے لرزتے ہوئے ایک ہاتھ سے اپنی چادر کا ایک کونا غیر محسوس انداز میں اپنے چہرے کے آگے کر لیا اور دوسرے ہاتھ سے روبیہ کا ہاتھ تھام کر اسے اپنی طرف کھینچا۔ روبیہ نے اس کے ہاتھ کے یخ بستہ لمس کو محسوس کرتے ہوئے اس کی جانب نظر اٹھائی۔ اس کی آنکھیں کسی وحشت زدہ ہرنی کی طرح سہمی ہوئی تھیں۔ اور رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔

''اینی! کیا بات ہے؟'' روبیہ نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''وہ..... وہ..... مم..... میرا دل گھبرا رہا ہے۔ بس چلو یہاں سے۔'' وہ گھبراہٹ آمیز انداز میں بولی۔ ان چہروں سے بچ کر، چھپ کر کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح ڈولتی پھر رہی تھی وہ اور وہ ایک بار پھر اس کے سامنے آ گئے تھے۔

''اچھا ٹھیک ہے تم باہر چلو میں پے منٹ کر کے آتی ہوں.....'' روبیہ کو وہ واقعی اس وقت ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔

''نن..... نہیں..... تم میرے ساتھ ہی چلو.....'' آریان نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ اس کی بے قرار نگاہیں ایک بار پھر گلاس ڈور کے باہر جھانکنے کو لپکیں۔

''او کے..... او کے ٹھیک ہے۔ پھر کبھی سہی.....'' روبیہ نے مزید شاپنگ کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے دکاندار کو پے منٹ کی۔ وہ دونوں شخص سیڑھیاں اتر کر بازار کی شمالی جانب جا رہے تھے۔ آریان کے سینے میں دبی سانس جیسے بہت دیر بعد باہر نکلنے کا راستہ پا کی۔ وہ دونوں بھی باہر نکل آئیں۔

''کیا خیال ہے اینی..... ایک ایک کپ آئس کریم ہو جائے۔'' روبیہ فریش لہجے میں بولی۔ حقیقتاً تو وہ اس کی موجودہ کیفیت سے کچھ کھٹک سی گئی تھی۔ اس کا خیال یہی تھا کہ آریان وہاں موجود کسی شخص کو دیکھ کر گھبرا گئی تھی۔ اس نے آریان کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھنا بھی چاہا لیکن اسے کوئی مشکوک شخص دکھائی نہیں دیا تھا۔ بہر حال اس وقت تو وہ بس یہی چاہتی تھی کہ کسی طرح آریان کی طبیعت بحال ہو جائے۔ باقی باتیں بعد میں بھی پوچھی جا سکتی تھیں۔

''نہیں روبی! بس اب گھر چلو۔'' آریان ہنوز بوکھلائی ہوئی تھی۔ روبیہ نے اس کی بات مان لی اور گاڑی گھر کی طرف جانے والے روڈ پر موڑ لی۔ آریان فرنٹ سیٹ پر اس کے قریب خاموش بیٹھی اپنی گود میں دھرے ہاتھوں پر نگاہیں جمائے جانے کس سوچ میں گم تھی۔ روبیہ نے بغور اس کی طرف دیکھا لیکن اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اسی طرح خاموشی سے ڈرائیونگ کرتی ہوئی گھر پہنچ گئی۔ آریان تمام راستے خاموش رہی تھی اور اب بھی خاموشی سے گاڑی سے اتر کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ روبیہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ آخر ایسی کونسی بات تھی جس نے اسے اس قدر ڈسٹرب کر دیا تھا۔ بہت زیادہ باتونی تو وہ پہلے بھی نہیں تھی لیکن جو خوف جو وحشت اس نے آج اس کی ذات میں محسوس کی تھی۔ اس سے پہلے کبھی نہیں کی تھی۔

''بہر حال جو بھی ہے بہت جلد سامنے آجائے گا۔'' روبیہ سوچنے لگی۔

❁❁❁

کالج کا گیٹ عبور کر کے مسرت جہاں فوزیہ کے ہمراہ لان کی طرف بڑھیں۔ آجکل پڑھائی زوروں پر تھی اور وجہ تھی فرسٹ سمسٹر کی تیاری۔ اس لیے تقریباً تمام سٹوڈنٹس ہی غیر حاضری سے اجتناب کر رہے تھے۔ وہ بھی نہایت دلچسپی اور توجہ کے ساتھ اپنے تعلیمی مراحل طے کرنا چاہتی تھی۔ ذہن کو صرف ایک مقام پر مرتکز کر کے وہ اپنی تمام صلاحیتیں بروئے کار لانا چاہتی تھیں۔ فوزیہ سے ایک دو قدم آگے چلتے ہوئے جونہی وہ لان کے بائیں جانب مڑیں ان کی نظر سامنے بیٹھے ہوئے فرجاد سے جا ٹکرائی۔ جو ان سے قدرے فاصلے پر اپنے دوستوں کے ہمراہ گھاس پر براجمان تھا۔ انہیں فوزیہ کے سنگ دیکھ کر ایک طمانیت بھری مسکراہٹ اس کے عنابی لبوں پر ابھر کر معدوم ہوگئی۔ ایک پل کو انہیں یہی لگا تھا جیسے اس کی منتظر نگاہیں ان کو دیکھتے ہی پرسکون ہوگئی تھیں۔ اور اب ان آنکھوں میں انتظار کی بجائے شوق، تجسس اور جانے کون کون سے جذبوں کی پرچھائیاں رقصاں تھیں۔ وہ ایک پل کو نروس ہوگئیں۔ تیزی سے اٹھتے قدم یوں ہلکے پڑ گئے۔ جیسے وہ کسی ٹرانس کی کیفیت میں مبتلا ہوگئی ہوں۔ انہوں نے بس ایک نظر اس کی طرف دیکھ کر نگاہوں کا زاویہ بدل لیا تھا لیکن دل ہی دل میں کتنی سوچوں نے یکدم سر ابھارا۔

پچھلے کئی دنوں سے وہ اس شخص کی معنی خیز نظروں کا سامنا کر رہی تھیں۔ کلاس میں، کلاس سے باہر، لان میں، کنٹین میں ہر جگہ جہاں کہیں وہ اس کے سامنے آجاتیں اس کی نگاہوں کا مرکز بن جاتیں۔ وہ انہیں یوں ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا جیسے پلک جھپکے گا تو مسرت جہاں کسی الوژن کی طرح غائب ہو جائیں گی۔ اور اس سے وہ دنیا و مافیہا سے بالکل بے نیاز ہو جاتا۔ وہ بھول جاتا کہ وہ اس وقت تنہا نہیں ہے۔ اس کے اردگرد بہت سے لوگ موجود ہیں مختلف کاموں میں مصروف لوگ لیکن جن کی نظروں سے کچھ چھپ جانا بہت بہت مشکل ہوتا ہے۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔ لیکن اگر وہ اسی طرح اپنے موجودہ رویے پر قائم رہا تو مسرت جہاں کے لیے اس کالج میں اپنی ریپوٹیشن برقرار رکھنا مشکل ہو جائے گی۔ اس سوچ کے ذہن میں ابھرتے ہی مسرت جہاں جیسے حواسوں کی دنیا میں آگئیں۔

''انہیں اس شخص کی حد درجہ حوصلہ شکنی کرنی ہوگی۔ صرف اسی طرح وہ سکون کے ساتھ اپنا تعلیمی کیریئر بنا سکیں گی۔ انہوں فوزیہ کی

طرف دیکھا۔ اپنی سوچوں میں مگن وہ یونہی چلتی ہوئی برآمدے کی سیڑھیوں تک آ پہنچی تھیں۔ جبکہ فوزیہ کافی فاصلے پر اپنی مشترکہ کلاس فیلو سعدیہ سے باتوں میں مصروف تھی۔ وہ رک گئیں۔ اور پلٹ کر فوزیہ کی طرف دیکھنے لگیں۔ سعدیہ سے ایک دو منٹ باتیں کرنے کے بعد فوزیہ ان کی طرف بڑھی۔

''توبہ ہے مسرت! کیا کوئی بھوت دیکھ لیا تھا؟'' فوزیہ ان کے قریب آتے ہوئے بولی۔

''کیوں.....''

''تم تو یوں آگے ہی آگے جا رہی تھی جیسے کوئی تمہارے پیچھے لگا ہوا ہو سعدیہ کی آواز دینے پر بھی نہیں رکیں۔ خیر تو ہے ناں۔'' فوزیہ گہری نگاہوں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''وہ.....وہ اصل میں سر ایاز کا پیریڈ شروع ہونے میں صرف دو چار منٹ ہی رہ گئے ہیں ان کا پتا تو ہے تمہیں کہ دیر سے آنے پر سٹوڈنٹ کو کلاس میں گھسنے نہیں دیتے۔'' مسرت جہاں کو جیسے اپنی غائب دماغی اور گھبراہٹ کا معقول جواز مل گیا۔

''سعدیہ یہی تو بتا رہی تھی کہ سر ایاز تین دن کی لیو پر ہیں۔ سو آج کا سارا دن بے کار گیا اور تمہاری اتنی عجلت بھی بے کار گئی۔

''تو پھر میرا خیال ہے کہ کلاس روم میں جانے سے بہتر یہیں لان میں بیٹھا جائے۔'' مسرت جہاں نے کہا تو فوزیہ بھی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ان کے ساتھ قدم سے قدم ملاتی لان کے نسبتاً الگ تھلگ گوشے کی طرف بڑھ گئی۔ کتابیں گھاس پر ڈھیر کرنے کے بعد وہ دونوں خود بھی بیٹھ گئیں۔

''مسرت میں چند دنوں سے تم میں کوئی تبدیلی دیکھ رہی ہوں۔ یہ تو میں نہیں جانتی کہ وہ تبدیلی مثبت ہے یا منفی لیکن میں اتنا جانتی ہوں کہ تمہیں ذہنی طور پر بہت ڈسٹرب کر رہی ہوں۔'' فوزیہ بچپن سے لیکر اب تک ان کی واحد دوست تھی اور دوست بھی ایسی جسے مزاج آشنا کہا جائے تو غلط نہ ہوگا اور اس کا یہ تجزیہ بھی کسی حد تک درست تھا کہ وہ چند دنوں سے واقعی ڈسٹرب تھیں۔

''نہیں.....'' مسرت جہاں نے مختصر جواب دیا۔ آج نہیں تو کل یہ بات اس کے علم میں آ ہی جانی تھی۔ پھر اب.....اس وقت جبکہ یہ موضوع چھڑ ہی گیا تھا تو مسرت جہاں نے یہی مناسب سمجھا کہ فوزیہ کو اپنی پریشانی کے بارے میں بتا دیں۔

''کیا وہ پریشانی تم میرے ساتھ شیئر کرو گی۔ میں یہ نہیں کہتی کہ اس طرح میں تمہاری پریشانی دور کر لوں گی۔ ہاں شاید اس طرح تم کچھ پرسکون ہو سکو۔''

''فوزیہ! مجھے فرجاد ملک کا دیکھنا اچھا نہیں لگتا۔'' انہوں نے معصومیت سے اپنی پریشانی کی وجہ بتائی۔

''کیا مطلب؟ کیا وہ خصوصی طور پر تمہیں دیکھتا ہے؟'' فوزیہ مسکراتے لہجے میں بولی۔

''شاید یہ میری غلط فہمی ہو لیکن اس کا مستقل دیکھنا مجھے بہت برا لگتا ہے۔ اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اسے کس طرح روکوں۔ یہ کالج ہے یہاں ہم پڑھنے کے لیے آتے ہیں لیکن عجیب بات ہے سٹوڈنٹس نے کالج کو بھی میرج ہال سمجھ لیا ہے۔'' مسرت جہاں

کے ایک ایک لفظ سے جھنجھلاہٹ ظاہر ہو رہی تھی۔ غالباً وہ فرجاد ملک کے اوٹ پٹانگ رویے سے تنگ آ چکی تھی۔

''ارے مسرت! لکی ہو تم۔ جانتی ہو فرجاد ملک کالج کی لڑکیوں کے لیے ہاٹ کیک ہے کتنی ہی لڑکیاں اس کی چاہت کا دم بھرتی ہیں۔ اس کی ایک نظر پانے کو جانے کیا کیا جتن کرتی ہیں اور وہ شخص جو اپنا دامن بچاتا رہا ہے۔ زندگی میں شاید پہلی بار کسی کی طرف جھکا ہے۔''

''یعنی تمہارا خیال ہے کہ میں اس کی حوصلہ افزائی کروں۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کروں کہ وہ مجھے اس کینڈلائز کرنے پر تل گیا ہے۔ شکرانے کے نفل ادا کروں اپنی متوقع بدنامی پر۔'' مسرت جہاں جلے ہوئے انداز میں گویا ہوئیں۔

''کیا بہت برا لگتا ہے تمہیں وہ.....؟''

''میرا اس سے ایسا کوئی رشتہ نہیں کہ وہ مجھے اچھا یا برے لگے۔ میرے لیے محض وہ ایکس۔ وائی۔ زیڈ ہے۔ مجھے چڑ ہوتی ہے اس طرح کے لوگوں سے جنہیں اپنے سوا کسی کا خیال نہیں ہوتا۔''

''کیا اس نے کوئی بدتمیزی کی ہے؟''

''نہیں.....''

''کیا کبھی اس نے تمہارا راستہ روکا؟''

''ارے نہیں بھئی.....''

''کیا تمہاری ذات میں بے جا انوالمنٹ کی کوشش کی؟''

''نہیں.....''

''تو پھر کس لیے تم اس کی اتنی مخالف ہو.....''

''میں نے پہلے بھی تمہیں بتایا ہے کہ بس مجھے اس کا دیکھنا اچھا نہیں لگتا۔''

''اس کے اس طرح دیکھنے سے تمہاری صحت پر کیا اثر پڑتا ہے۔''

''میں نے یہ کب کہا کہ میری صحت متاثر ہوتی ہے۔ لیکن اس طرح میری پوزیشن آکورڈ ہو جائیگی اور مجھے اپنی عزت بہت عزیز ہے۔'' مسرت جہاں گھاس کی پتیاں نوچتے ہوئے نپے تلے انداز میں بولیں۔

''پتہ نہیں مسرت! کیا وجہ ہے جو وہ تمہاری طرف متوجہ ہوا۔ وہ ایک مہذب اور شائستہ اطوار کا مالک لڑکا ہے۔ کم سے کم اس سے اچھی حرکتوں کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ بہر حال تم اسے ایوائڈ کرنے کی کوشش کرو۔''

''تمہارا کیا خیال ہے میرے ایوائڈ کرنے سے کیا وہ اپنی حرکتوں سے باز آ جائیگا۔ نہیں فوزیہ اس کی آنکھوں کا حتمی انداز نہیں دیکھا تم نے۔ یوں دیکھتا ہے جیسے ساری کائنات کو مسخر کر چکا ہو..... تم..... مسرت جہاں اپنی بات مکمل نہ کر سکیں اور اس کی وجہ وہ چیخ تھی جو چند قدم دور بیٹھی لڑکیوں کے گروپ میں سے بلند ہوئی تھی۔ وہ چاروں لڑکیاں سانپ سانپ چلاتی ہوئی تیزی سے اٹھ کر ادھر اُدھر کو

بھاگیں۔ مسرت جہاں اور فوزیہ بھی اضطراری انداز میں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اردگرد کھڑے دوسرے لوگ بھی اس طرح متوجہ ہو گئے۔ سیاہ کوبرا رینگتے ہوئے لان کے بالکل وسط میں آ گیا تھا۔ اس کے رینگنے میں ایک اضطراب پایا جاتا تھا۔ جیسے وہ کسی ممنوعہ جگہ آ گیا ہو۔ جس طرف آگے بڑھتا۔ وہاں موجود افراد کو دیکھ کر اپنا رخ بدل لیتا۔ ابھی تک اس کی کسی حرکت سے یہ اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ کس کو نقصان پہنچائے گا لیکن جب اسے کسی طرح جانے کا راستہ نہ ملا تو پھر وہ گھاس پر پھن کاڑھ کر بیٹھ گیا۔ وہاں موجود لڑکیوں کے چہروں پر خوف و ہراس کے سائے لرزاں تھے۔ ایک پل کو ماحول پر سکوت سا طاری ہو گیا۔ پھر لڑکوں کی مردانگی جیسے جوش میں آ گئی۔ کوئی ڈنڈا پکڑنے دوڑا تو کوئی اینٹ اٹھا لیا۔ لیکن کسی میں ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ ایک قدم بھی آگے بڑھاتا سانپ کا پر ہیبت وجود دیکھ کر سب کے حوصلے پست ہو رہے تھے۔ فرجاد نے ایک نظر ان سب کی طرف دیکھا اور آگے بڑھا۔

''ارے فرجاد رکو یار..... کیا کر رہے ہو۔'' عامر اس کی طرف لپکا۔ فرجاد نے خاموشی سے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا لیکن دھیمے قدموں سے آگے بڑھتا رہا۔

''فرجاد بغیر کوئی چیز ہاتھ میں لیے یوں آگے مت بڑھو انتہائی خطرناک سانپ ہے ڈس لے گا۔'' یہ روبینہ کی متفکر آواز تھی جو فرجاد کی صرف کلاس فیلو ہی نہیں تھی بلکہ اس کے لیے اپنے دل میں پسندیدگی کے جذبات بھی رکھتی تھی لیکن فرجاد کو جیسے ان سب کی آوازیں سنائی ہی نہیں دے رہی تھیں۔ اس کی ساری توجہ اس سیاہ ناگ پر مرتکز تھی جو اب اس سے محض چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ ناگ کو بھی شاید یہ احساس ہو گیا تھا کہ فرجاد اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس کا چوڑا پھن پھول اور لچک رہا تھا۔ چمکدار آنکھیں فرجاد پر جمی ہوئی تھیں اور اب آہستہ آہستہ اس کا وجود دائیں بائیں حرکت کرنے لگا۔ یوں جیسے وہ اپنے شکار پر جھپٹنے کے لیے خود کو تیار کر رہا ہو۔ سب کی نظریں فرجاد اور سانپ پر تھیں اور سانسیں سینے کے اندر سہم کر جیسے تھم گئی تھیں۔ مسرت جہاں کی نظروں میں خوف تھا اور دھڑکنیں کچھ مضطرب سی ہو گئی تھیں۔ فرجاد رک گیا اس کی نظریں ناگ کے چوڑے پھن کو تک رہی تھیں۔ پھر اس نے اپنے دونوں بازو پھیلا لیے۔ پہلے دایاں ہاتھ متحرک ہوا تو سانپ کی پوری توجہ اس کے دائیں ہاتھ کی طرف ہو گئی اس کا پھن گھوم گیا تھا۔ فرجاد نے بہت دھیرے سے اپنے جسم کو حرکت دی اور اب بایاں ہاتھ سانپ کے قریب سے گزارا۔ سانپ کا رخ ایک بار پھر بدل گیا۔ فرجاد اس کی توجہ اپنے ہاتھوں کی جانب مبذول کرانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ کبھی دائیں اور کبھی بائیں ہاتھ کی حرکت کے ساتھ سانپ بھی تیزی سے رخ بدل رہا تھا۔ اور پھر یکدم ایک کوندا سا لپکا تھا۔ ایک ثانیے کا کھیل تھا جو دیکھنے والے کے احاطہ بصارت میں بھی نہ آ سکا۔ بجلی کی سی تیزی سے اس کا داہنا ہاتھ حرکت میں آیا اور سانپ کا پھن اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ سانپ کا بقیہ جسم تلملاتے بل کھاتے ہوئے کبھی اس کے بازو سے لپٹ رہا تھا اور کبھی نیچے کو لٹک جاتا تھا۔ فرجاد نے ایک نظر اپنے اردگرد ساکت کھڑے افراد پر ڈالی۔ مسکراتے ہوئے اس نے سانپ کے سر کو ہلکا سا سہلایا اور پھر اسے اسی جگہ چھوڑ دیا جہاں سے پکڑا تھا۔ لڑکیوں کی گھٹی گھٹی چیخیں سنائی دی تھیں۔ لیکن یہ دیکھ کر سب حیران رہ گئے تھے کہ سانپ نے فرجاد کو ڈسنے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ رینگتا ہوا کالج کی باؤنڈری کی طرف بڑھ گیا تھا۔ سب کے چہروں پر اطمینان پھیل گیا۔ سینوں میں دبی سہمی ہوئی

سانسیں سکون آور ہوا کے لمس سے آشنا ہوئیں۔ فرجاد مسکراتے ہوئے عامر کی جانب آ گیا۔

''یار فرجاد! تم نے تو آج حیران کر کے رکھ دیا۔ لیکن یار اس قدر خوفناک قسم کا کوبرا تھا۔ اگر وہ تمہیں ڈس لیتا۔'' عامر کی بات سن کر فرجاد مسکرانے لگا۔ ایک ترچھی سی نظر مسرت جہاں پر ڈالتے ہوئے گویا ہوا۔

''ڈسنا اس کی فطرت ہے اس سے مفر نہیں۔ لیکن محبت میں اتنی طاقت ہے کہ اس کے آگے کبھی نہ کبھی گھٹنے ٹیکنے پڑ جاتے ہیں۔ وہ مجھے کیوں ڈستا جبکہ میرے ہاتھ کے محبت بھرے لمس سے آشنا ہو چکا تھا۔'' ایک معنی خیز مسکراہٹ اور اپنی طرف اس کا یوں دیکھنا مسرت جہاں کو ایک بار پھر چڑا گیا۔

''یہ شخص مجھے سخت رویے پر مجبور کر کے رہے گا۔ وہ بڑبڑاتی ہوئی فوزیہ کے ساتھ کلاس روم کی طرف چل دیں۔ باقی کا سارا دن فرجاد ملک انہیں دوبارہ نہیں دکھائی دیا تھا غالباً وہ کالج میں تھا ہی نہیں۔ انہوں نے سکون کا سانس لیا۔

اگلے دن کالج میں آتے ہی غیر ارادی طور پر ان کی متلاشی نگاہوں نے وہاں کا جائزہ لیا تھا جہاں وہ ہر روز اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھتا تھا لیکن آج وہاں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ وہ اپنے ڈیپارٹمنٹ کی طرف بڑھ گئیں۔ پہلے دو پیریڈز کے بعد باقی کا سارا دن بیکار تھا۔ آج فوزیہ بھی نہیں آئی تھی وہ اکیلی تھیں اور شاکر بھائی نے اپنے ٹائم پر آنا تھا۔ سو بوریت سے بچنے کے لیے انہوں نے سوچا کہ لائبریری میں وقت گزار لیا جائے۔

اس وقت بیشتر سٹوڈنٹس کلاس رومز میں تھے جو فری تھے وہ لان میں جا بجا ٹولیاں بنائے گپیں ہانک رہے تھے۔ وہ نظریں جھکائے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر لائبریری میں داخل ہو گئیں۔ وسیع و عریض لائبریری اس وقت بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ صرف لائبریرین سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھیں لیکن وہ کافی فاصلے پر تھیں۔ مسرت جہاں ابھی ان کی طرف بڑھنے لگی تھیں کہ سامنے رکھے ایک ریک کے عقب سے وہ نکل کر ان کی راہ میں حائل ہو گیا۔ ایک لمحے کو تو وہ اسے اپنے سامنے پا کر بدحواس ہو گئیں۔ گھبراتی ہوئی نظروں سے انہوں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی گہری خاموش نگاہیں ان کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں۔ وہی بے باک پر محبت آنکھیں جن سے مسرت جہاں پیچھا چھڑانا چاہتی تھیں۔ وہ کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہتی تھیں اور نہ ہی اسے کرنا چاہتی تھیں۔ وہ محبت جیسی لگژری افورڈ نہیں کر سکتی تھیں اور یہ شخص اپنی آنکھوں سے جانے کیا کیا پیغام دینے لگا تھا۔ اور آج ان کی مسلسل خاموشی سے شہہ پا کر وہ ان کا راستہ روکنے کی ہمت بھی کر چکا تھا۔ اگر وہ اسے روک نہ پائیں تو آنے والا کل کس قدر بھیانک حقیقتیں لے کر آنے والا تھا وہ اس سوچ سے بھی لرز اٹھی تھیں۔

''رستہ چھوڑیں ہمارا۔'' ایک سرسراتی ہوئی آواز ان کے حلق سے برآمد ہوئی۔ حقیقتاً فرجاد ملک انہیں بہت پریشان کر رہا تھا۔ ان کی بات کے جواب میں بھی فرجاد ملک ٹس سے مس نہیں ہوا۔

''ہم..... ہمیں جانے دیں پلیز..... آپ کیوں پریشان کر رہے ہیں۔''

''مسرت جہاں میں..... میں آپ کو پریشان کر رہا ہوں..... میں آپ کو پریشان کیوں کرونگا۔ مجھے تو بس آپ کے قیمتی وقت

میں سے چند لمحے درکار ہیں۔"

"کس لیے.....؟

"کچھ ڈسکس کرنا ہے آپ سے....." فرجاد ملک ہنوز مطمئن لہجے میں بولا۔

"میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتی براہ کرم میرا راستہ چھوڑیں۔" مسرت جہاں نے اپنی اندرونی کیفیت کو چھپاتے ہوئے حتمی انداز میں کہا۔

"لیکن میں ضروری سمجھتا ہوں کہ جو احساس آپ سے متعلق میرے دل کے اندر پنپ رہا ہے اس سے آپ کو آگاہ کروں میں نے آج تک کبھی کسی کے بارے میں اس انداز سے نہیں سوچا اور شاید اسی لیے خودداری اور انا مجروح ہونے کے خیال سے میں نے اتنے دن خود کو روکا۔ لیکن..... جذبوں پر تو کسی کا اختیار نہیں ہوتا ناں۔"

"پلیز فرجاد صاحب! لفظوں کی حرمت کو ضائع مت کیجیے گا کوئی ایسا مطالبہ کوئی ایسی امید وابستہ مت کیجیے گا جس کا اختیار میرے پاس نہ ہو۔" مسرت جہاں فرجاد ملک کے روبرو بول پڑیں۔ وہ کچھ کچھ جان گئی تھیں کہ فرجاد ملک کے اگلے جملے کیا ہونگے۔ اسی لیے انہوں نے اسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ لیکن شاید فرجاد ملک کے لیے اپنے محسوسات پر بند باندھنا اب ناممکن ہو گیا تھا۔

"میں مانتا ہوں کہ جذبوں کو مشتہر کرنا انہیں بے وقت کر دینے کے مترادف ہے۔ لیکن محبت کے آگے انسان ایک مقام پر اتنا بے بس ہو جاتا ہے کہ اسے جذبوں کو بھی اظہار کی زبان دینی پڑتی ہے۔ اور آج آپ کے سامنے میں نے اپنے جذبوں کو بھی اظہار کی زبان دے دی ہے۔ اب یہ آپ کے اختیار میں ہے خواہ ان جذبوں کو اپنے دل میں بسا کر معتبر کر دیں۔ خواہ ٹھکرا کر بے توقیر کر دیں۔" لفظ ساتھ چھوڑ گئے تھے یا پھر زبان فرجاد ملک خاموش ہو گیا۔ مسرت جہاں کی ساکت آنکھیں فرجاد ملک کے وجیہہ چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں معصوم التجائیں اور محبت کا سچ امید بن کر چمک اٹھا تھا۔ مسرت جہاں کے لیے یہ لمحے جیسے حیرت کا ایک بحر بیکراں تھے ان کے لبوں پر خاموشی کا قفل لگا ہوا تھا اور آنکھیں جھجک آمیز حیا سے جھکنے لگیں۔

"مسرت جہاں! آج آپ کا کالج میں پہلا دن ہے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ کالج میں پڑھنے کے لیے جاتے ہیں۔ دیگر سرگرمیوں میں شمولیت ہمیں اچھی نہیں لگتی۔ اسے آپ ہماری پہلی اور آخری نصیحت، تنبیہ یا پھر حکم سمجھ لیں کہ اپنے خوابوں کی تکمیل میں ہماری عزت و حرمت کا خون مت شامل کیجیے گا۔ جس بے داغ پوشاک میں ملبوس ہیں آپ اس پر ہم ذلت کا کوئی چھینٹا نہیں برداشت کر پائیں گے۔" ایک کوندتا ہوا لہجہ ان کی سماعت کے نہاں گوشوں سے نکلا اور ایک پل کے اندر اندر ان کا سارا وجود کسی ان دیکھے حصار میں مقید ہو گیا۔ ان کی جھکی ہوئی پلکیں اٹھیں تو فرجاد ملک ان آنکھوں میں ایک لمحہ نہ جھانک سکا۔ ان کی نرم آنکھیں عجیب سی سختی لیے ہوئے تھیں کہ فرجاد ملک کو لگا ان سنگلاخ چٹانوں جیسی سختی والی آنکھوں کے آگے ان کی آنکھوں میں سجنے والے خواب کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ بے وقعت زروں کی طرح ہیں۔

''نہیں فرجاد صاحب! جو راستہ آپ نے منتخب کیا ہے۔ میں اس رستے پر چلنا تو کیا اس کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتی لیکن آپ سے استدعا ہے کہ میری راہ میں اس طرح حائل ہو کر بار بار میرے سامنے آ کر میری شخصیت کو مجروح مت کریں۔'' ان کا لہجہ سخت سہی لیکن فرجاد ملک کو ان لفظوں کے پیچھے چھپا خوف نظر آ گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بظاہر پتھر کی طرح سخت نظر آنے والی لڑکیاں موم سے بھی کہیں زیادہ نرم و نازک ہوتی ہیں۔ حالات کی ہلکی سی تمازت انہیں پگھلانے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ اور مسرت جہاں تو اس کے گلشن دل کا واحد گلاب تھیں۔ وہ یہ کیسے برداشت کر لیتا کہ یہ گلاب مرجھا جائے۔

''مسرت جہاں! آپ یہ سوچ کر خوفزدہ مت ہوں کہ آپ کے انکار کی صورت میں میں کسی قسم کے اوچھے ہتھکنڈے پر اتر آؤں گا۔ آپ کی عزت و حرمت مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ آپ کو اختیار حاصل ہے اقرار کا بھی، انکار کا بھی لیکن انکار کی صورت میں بس اتنی اجازت مجھے دیجیے گا کہ میں آپ کو دیکھ سکوں۔ یہ یاد رکھیے گا کہ کبھی آپ سے سامنا ہوا تو دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر میری نظریں آپ کے چہرے کا طواف ضرور کریں گی۔ آپ مجھے اس سے مت روکیے گا۔ میں کبھی آپ کے رستے میں نہیں آؤں گا نہ ہی میرے کسی عمل سے آپ کو کسی قسم کی پریشانی ہوگی لیکن ایک بات کا خیال رکھیے گا کہ جب میں آپ کے سامنے آؤں تو ان خوبصورت آنکھوں میں حقارت اور اس صبیح پیشانی پر ناگواری کی شکنیں نہ آنے دیجیے گا کہ محبت کرنے والوں کی خودداری مجروح ہوتی ہے۔'' فرجاد ملک اپنی بات کہہ کر رکا نہیں ہوا کے جھونکے کی طرح لائبریری کے دروازے سے باہر نکل گیا۔ مسرت جہاں کی آنکھوں کے سامنے دروازے کا خالی فریم تھا۔ جہاں سے ابھی ابھی وہ گیا تھا۔ انہوں نے گلاس وال کے پیچھے بیٹھی لائبریرین کی طرف دیکھا جو اپنے آفیشل کام میں مصروف تھیں وہ بے دم قدموں سے چلتی قریبی کرسی پر ڈھے سی گئیں۔ کون سی کتاب اور کہاں کا مطالعہ دماغ کی ساری صلاحیتیں جیسے چوپٹ ہو کر رہ گئی تھیں۔ زندگی کا ایک انوکھا تجربہ ہوا تھا آج انہیں۔ ایک شخص ان سے شدید محبت کا دعویدار تھا۔ کیا حقیقی رشتوں کے علاوہ کوئی اجنبی بھی آپ سے اس قدر محبت کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ فی الوقت وہ فرجاد ملک کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے کی ہمت خود میں نہیں پا رہی تھیں۔

رات قدرے خنکی لیے ہوئے تھی سب ہی اپنے اپنے کمروں میں دبکے ہوئے تھے۔ انہوں نے ایک نظر اماں بی کے کمرے میں جھانکا وہ انہیں عشاء کی نماز میں مشغول دکھائی دیں۔ ابا میاں تین چار دنوں سے شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ ان کے مال بردار ٹرک کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا اور کافی نقصان بھی ہوا تھا۔ اس لیے وہ اور بابر بھائی دونوں گھر پر موجود نہیں تھے۔ وہ اپنے کمرے میں نہیں جانا چاہتی تھی۔ تنہائی اس وقت انہیں کسی عفریت کی طرح لگ رہی تھی۔ کہ اگر وہ اپنے کمرے میں چلی گئیں تو شاید وہ عفریت انہیں نگل ہی نہ جائے۔ انہوں نے چادر کو اچھی طرح اپنے گرد لپیٹا اور برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر وسیع و عریض صحن میں آ گئیں۔ وہ صحن جو دن بھر رونقوں سے بھرپور رہتا تھا اس وقت انتہائی خاموشی اور سناٹے کے باعث ویران سا لگ رہا تھا۔ ان کی نظریں آسمان کی جانب اٹھ گئیں۔ اکا دکا بادلوں نے کہیں کہیں ستاروں کے چمکتے چہروں کو ڈھانپ رکھا تھا۔ چاند کی زردی مائل چاندنی کسی مریض کی پھیکی مسکراہٹ کی طرح آسمان پر پھیلی ہوئی تھی۔ خنک ہوا نے انہیں زیادہ دیر تک صحن میں رکنے نہ دیا۔ بھابھی مقسوم اور شفقت بھائی جلد سونے کے عادی تھے اس لیے ان کے

پورشن میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ زاہدہ بھابھی گھر پر موجود نہیں تھیں اور رہیں شینا بھابھی تو ان کے معمولات ہی عجیب تھے۔ سارا دن سوائے اوقات نماز کے وہ کسی نہ کسی گھریلو کام میں مصروف رہتیں اور رات کو بھی دیر تک انہیں مطالعے کی عادت تھی حالانکہ عارب بھائی ان کی اس عادت کو بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ اللہ جانے کیا بات تھی عارب بھائی کی مرضی سے ان کی شادی ہوئی تھی لیکن شادی کے ابتدائی دو سال کے بعد شینا بھابھی کی طرف سے ان کی توجہ بالکل ہٹ گئی۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ بھابھی مقسوم تو تھیں ہی بے اولاد اب شینا بھابھی کے ہاں بھی ابھی تک کوئی امید کی کرن دکھائی نہیں دی تھی۔ اور کہتے ہیں کہ مرد کو باندھنے والی صرف ایک زنجیر ہوتی ہے اور وہ ہے اولاد۔ اولاد کی خاطر مرد دل سے اتر جانے والی عورت کو بھی برداشت کرتا رہتا ہے۔ مسرت جہاں نے ایک نظر شینا بھابھی کے روشن کمرے کی طرف دیکھا اور پھر بلا ارادہ ان کے قدم ان کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ انہوں نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔

''بھابھی! اندر آجاؤں۔'' شینا بھابھی نے کتاب پر سے نگاہ اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔

''مسرتی! تمہیں اجازت کی ضرورت کب سے پیش آگئی۔'' مسرت جہاں مسکراتی ہوئی اندر آگئیں۔

''کیا بات ہے آج نیند نہیں آرہی۔ کل چھٹی کرنے کا پروگرام تو نہیں؟'' شینا بھابھی نے پوچھا۔

''نہیں چھٹی تو نہیں کرسکتی ایگزامز بالکل سر پر ہیں۔ بس ویسے ہی آپ کے پاس بیٹھنے کو جی چاہ رہا تھا۔'' مسرت جہاں ان کے قریب پلنگ پر بیٹھ گئیں۔

''یہ عارب بھائی کہاں ہیں؟''

''پتا نہیں مسرتی! آجکل رات کو بہت دیر سے آنے لگے ہیں۔ کوئی پتا نہیں کہاں جاتے ہیں۔'' شینا بھابھی آزردہ لہجے میں بولیں۔

''بھابھی! عارب بھائی ایسے کیوں ہوگئے ہیں۔ پہلے تو نہیں تھے وہ اس طرح کے۔''

''ارے چھوڑو تم کیا موضوع لے کر بیٹھ گئیں۔ یہ بتاؤ اسٹڈیز کیسی جارہی ہیں تمہاری؟''

''بالکل ٹھیک.....''

''مسرت! جانتی ہو تمہارے بھائی نے کتنی مخالفت کی ہے تمہارے کالج جانے کی۔ میں آج تک نہیں سمجھ سکی کہ ان کی ایسی سوچ کیوں ہے؟''

''بس بھابھی! اپنی اپنی سوچ ہوتی ہے۔ ابا میاں نے بھی بہت مشکل سے اجازت دی ہے۔ اسی لیے تو میری یہی کوشش رہتی ہے کہ انہیں کبھی بھی شکایت کا موقع نہ ملے۔''

''بالکل ٹھیک! تمہارے اس قدم کے بعد اس خاندان کی ساری بچیوں کے لیے علم کے راستے کھل جائیں گے۔ تمہارا قابل فخر کردار ہی ان کے راستوں کے کانٹے چنے گا۔ اور مسرتی یقین کرو کہ میں سب سے زیادہ تمہارے حق میں تھی کہ مزید تعلیم حاصل کرنی

چاہئے۔ عورت محض فردِ واحد نہیں ہوتی نسلوں کی امین ہوتی ہے علم کی روشنی سے بہرہ ور ہوگی تو نسلیں سنور جائیں گی۔'' شینا بھابھی لبرل سوچ کی مالک تھیں۔ عارب بھائی سے یکسر مختلف اور کہیں زیادہ اچھی۔ مسرت جہاں کو اپنے گھر میں اماں بی اور ابا میاں کے بعد شینا بھابھی ہی زیادہ لائق محبت و تکریم لگتی تھیں۔ ابھی مسرت جہاں ان کی بات کے جواب میں کچھ کہنے لگی تھیں کہ بیرونی دروازہ کھول کر عارب بھائی اندر داخل ہوئے۔ مسرت جہاں عارب بھائی کے سامنے زیادہ نہیں ہوتی تھیں کچھ ان کی غصیلی طبیعت اور سخت گیری کے باعث ان سے خائف رہتی تھیں۔ انہیں اندر آتے دیکھ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ سلام کیا اور باہر کو قدم بڑھائے۔

''مسرت بیٹا! بیٹھو ناں کدھر جا رہی ہو.....؟'' انہوں نے جیسے رسماً پوچھا تھا۔

''بس بھائی! میں اب جانے ہی والی تھی ایک ٹسٹ کی تیاری کرنا ہے بھابھی کے کمرے کی لائٹ جلتی دیکھ کر ادھر آ گئی۔'' وہ جیسے وہاں اپنی موجودگی کا جواز بتا رہی تھیں۔

''ہاں تمہاری بھابھی کو کتابوں، رسالوں کی دنیا زیادہ پسند ہے۔ زندہ انسانوں کی نسبت۔'' طنزیہ سا لہجہ بیک وقت مسرت جہاں اور شینا بھابھی کو چبھا تھا لیکن ان میں سے کوئی بولا نہیں۔ شینا بھابھی بستر سے اٹھ گئی تھیں۔ غالباً عارب بھائی کے کھانا لینے اور مسرت جہاں بھی کمرے سے باہر نکل گئی تھیں۔ اپنے کمرے میں داخل ہوئیں تو کافی دیر پہلے کی کیفیت ایک بار پھر وارد ہوگئی۔ کمرے کی ہر چیز اجنبی اجنبی سی لگ رہی تھی۔ اکیلا پن جیسے پوری شدتوں سے ان پر آن وارد ہوا۔ کوئی شبیہہ تھی جو ہولے ہولے پلکوں کے در کھٹکھٹا رہی تھی۔ مسرت جہاں کی آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ صرف چبھن تھی۔ نارسائی کی چبھن۔ بے بسی کی چبھن۔ انہوں نے بارہا اپنے ذہن کے گوشوں سے اسے جھٹکنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ اپنی پوری شان سے ان کے ذہن و دل میں براجمان ہو رہا تھا۔

کیا تم نہیں جانتے کبھی کبھی ڈوبنے والے کو سہارا دینے والے خود بھی ڈوب جایا کرتے ہیں۔ یہ محبت..... یہ جذبہ جو کھلے ہوئے دلوں کو مرجھا دیتا ہے۔ جو سکون میں ڈوبی آنکھوں سے نیندیں غارت کر دیتا ہے۔ کیا نہیں جانتے کہ خواب جب تک آنکھوں کے اندر سجتے رہیں، سکھ دیتے ہیں لیکن جب ٹوٹتے ہیں تو ان کے بکھرے ہوئے ریزے آنکھوں میں نشتر کی طرح اتر کر بینائی چھین لیا کرتے ہیں۔ سکون اچھا نہیں لگتا تمہیں۔ کیوں خود بھی اس خارزار میں الجھتے ہو اور میری روح کو بھی اس میں گھسیٹ کر زخمی کرنا چاہتا ہو۔

مسرت جہاں کی بند آنکھوں کے سامنے وہ چہرہ روز روشن کی طرح اپنی آب و تاب لیے ہوئے تھا۔ وہ جتنا اس تصور کو جھٹک رہی تھیں۔ وہ اسی قدر ان کی سوچوں پر مسلط ہوتا جا رہا تھا۔ محبت کے بحر بیکراں میں ان کی کشتی جاں ڈول رہی تھی۔ وہ ڈوبنا نہیں چاہتی تھیں۔ لیکن یوں لگتا تھا جیسے ان کے پیروں کے ساتھ منوں وزنی پتھر بندھے ہوئے ہیں۔ جو انہیں نیچے ہی نیچے پاتال کی طرف لے جا رہے ہیں۔ وہ ہاتھ پاؤں مار رہی تھیں۔ شاید محبت کے اس نادیدہ لمس نے انہیں نڈھال کر دیا تھا۔ جن محسوسات سے ان کا معصوم دل آج تک ناآشنا تھا۔ صرف چند لمحوں کی ملاقات میں فرجاد ملک نے انہیں ان محسوسات کی حدت سے روشناس کرا دیا تھا۔

''مسرت جہاں! جس اجلی پوشاک میں آپ ملبوس ہیں ہم اس پر ذلت کا چھینٹا برداشت نہیں کریں گے۔'' پرجلال دبنگ لب و

لہجہ جیسے بازگشت بن کر ان کے چاروں طرف گونجا۔ سماعت شکن الفاظ ان کی روح تک کو لرزا گئے۔

"لیکن..... لیکن اگر کوئی ہم سے خاموش محبت کرتا ہے تو اس سے ہماری ذلت کیسے ممکن ہے۔" انہوں نے کمزور سا دفاع کیا تھا پتا نہیں اپنا یا فرجاد ملک کا۔

کیا تم جانتی نہیں مسرت جہاں کہ محبت کی دھیمی دھیمی آنچ جو فرجاد ملک کے دل میں دہک رہی ہے۔ اس کی بہت ہلکی سی حرارت تمہارے دل کو بھی تو چھو رہی ہے۔ کیا تم نہیں جانتی کہ جب چنگاری خشک جھاڑیوں پر گرتی ہے تو کیسے بھانبھڑ جلتے ہیں۔ ایسے کہ صرف جھاڑیاں ہی نہیں اردگرد موجود سر سبز درخت اور گھاس بھی اس کی لپیٹ میں آجایا کرتی ہے۔ پھر تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ محض فرجاد ملک کی محبت تمہارے لیے ذلت کا باعث نہیں بن سکتی۔ دماغ کے الفاظ کسی کوڑے کی طرح ان کی روح پر پڑے تھے۔ وہ تڑپ گئیں۔

پھر پھر اب میں کیا کروں۔ کیا فرجاد ملک کو سمجھاؤں۔ اسے روکوں کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے وہ ٹھیک نہیں۔

کیا وہ تمہاری مانے گا تمہارے کہنے سے رک جائے گا ارے پگلی یہ محبت ہے کوئی دو چار منٹ کا سفر نہیں تمام زندگی کی مسافت ہے۔ جب تم اس کی محبت پر ایمان لے آئی ہو تو پھر اقرار کیوں نہیں کرتی۔ کیوں نہیں کہتی کہ تم بھی اسے پسند کرتی ہو۔ دل کا اپنا ہی فیصلہ تھا۔ مسرت جہاں سناٹے میں آگئیں۔

نہیں یہ ٹھیک نہیں ہے یہ غلط ہے۔ وہ جیسے اپنے آپ سے لڑنے لگیں۔ دل اور دماغ کی مسلسل جنگ کا کوئی فیصلہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ ان کی آنکھیں بہنے لگی تھیں۔ پپوٹے ورم آلودہ ہو چکے تھے لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

کیا میں کالج چھوڑ دوں..... انہوں نے خود سے سوال کیا۔ لیکن درحقیقت وہ ایسا چاہتی نہیں تھیں۔

"کیوں؟ کالج کیوں چھوڑ دو بس اسے نظر انداز کرو۔ اس کی طرف دیکھنا بھی مت۔ اگر سامنا ہو تو کترا کر گزر جانا یہ سمجھ کر کہ وہ ایک اجنبی ہے محض اجنبی تم اسے جانتی ہی نہیں۔"

"لیکن کیا نظر انداز کر سکو گی تم اسے..... کیا بھول سکو گی اس شخص کو جس نے پہلی بار زندگی میں پہلی بار تمہارے در دل پر دستک دی ہے۔" مسرت جہاں کے دل نے ان سے سوال کیا۔

"نہیں..... شاید شاید میں اسے بھول نہیں سکوں گی۔" ان کا کنوارا دل محبت کی تال پر رقصاں تھا۔ دھڑکنیں بے ترتیب مگر خوبصورت انداز میں رواں تھیں۔ دماغ جیسے ان کے دل کے ہاتھوں مجبور ہو گیا۔ ان کی نگاہوں کے سامنے باب عشق کھلا ہوا تھا۔ خود بخود ان کی نظریں اس دہلیز پر جھک گئیں۔ فرجاد ملک کی بے پایاں محبت کے سامنے ان کے دل و دماغ نے ہتھیار ڈال دیئے تھے ہر سوچ، ہر مسئلہ پس پشت ڈال کر سوچوں سے خواب بننے لگیں۔

مسرت جہاں ساری رات سو نہیں سکی تھیں شاید یہی وجہ تھی کہ صبح جب وہ کالج کے لیے تیار ہوئیں تو ان کی طبیعت میں عجیب سا بوجھل پن تھا۔ شینا بھابھی بھی ان کے چہرے کی طرف دیکھ کر ٹھٹھک گئیں۔ متورم آنکھیں، جنکے گوشے ہلکا گلابی پن لیئے ہوئے تھے اور کچھ

کچھ بھیگے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

''مسرتی کیا بات ہے تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔'' وہ تشویش بھرے انداز میں بولیں۔

''بس بھابھی! سر کچھ بھاری بھاری سا ہو رہا تھا۔''

''خدانخواستہ بخار تو نہیں۔''

''نہیں۔'' انہوں نے مختصر سا جواب دیا۔

''مسرتی! مجھے تو تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ بہتر تھا آج چھٹی کر لیتی۔'' شینا بھابھی ایسی ہی تھیں ہر ایک کے لیے ہر لمحہ متفکر اور محبت بھرا دل رکھنے والی۔

''نہیں بھابھی! آج ٹیسٹ ہے بہت ضروری۔ اس لیے جانا پڑے گا۔'' گھر میں بھی تو سکون نہیں ملے گا ناں۔ انہوں نے دل میں سوچا لیکن کہا نہیں۔ شاکر بھائی تیار ہو کر آئے تو ان کے ساتھ کالج آ گئیں۔ آج کل فوزیہ بھی نہیں آ رہی تھی۔ کالج میں داخل ہوتے ہی تھوڑا فاصلے پر فرجاد ان کو نظر آ گیا۔ وہ ایک درخت سے ٹیک لگائے تنہا کھڑا تھا۔ اور اس کی نظریں بڑی بے قراری سے گیٹ پر جمی ہوئی تھیں۔ انہیں آتے دیکھ کر وہ جیسے پرسکون ہو گیا تھا۔ مسرت جہاں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا تھا اور پھر حسب معمول سر جھکائے اپنے ڈیپارٹمنٹ کی طرف بڑھنے لگیں۔

''مسرت ایک منٹ بات سنیئے۔'' بہت دھیمے انداز میں وہ بولا تھا۔ انہوں نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا وہ ان کے بہت نزدیک کھڑا تھا۔ ایک نظر چاروں طرف ڈالی انہیں یہی لگا جیسے اردگرد موجود سب لوگ ان کی طرف متوجہ ہیں سب لوگوں کی نگاہوں میں ان کے لیے تمسخر ہے طنز ہے ذومعنی نظریں انہیں اپنے چہرے پر چبھتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ لیکن کل کی طرح آج وہ اسے اگنور نہ کر سکیں۔ شاید دل میں کوئی چور بیٹھا تھا۔ جو حکم چلا رہا تھا اور وہ اس کی بات مان کر کچھ نہ بولیں بس ایک لفظ ''جی'' ان کے حلق سے برآمد ہوا۔

''مسرت! آپ..... آپ پریشان دکھائی دے رہی ہیں۔ کیا بات ہے؟''

اس کے لہجے میں اپنے لیے پریشانی محسوس کر کے وہ پہلی بار اس کے سامنے مسکرائی تھیں۔ اور فرجاد ملک دھوپ چھاؤں کا یہ روپ دیکھ کر جیسے بالکل ہی دیوانہ ہوا تھا۔ گیلی گیلی جھیل سی آنکھیں اور کلیوں جیسے نازک ہونٹ، آنسوؤں اور مسکراہٹ کا ملا جلا امتزاج۔

''نہیں کوئی پریشانی نہیں ہے.....'' انہوں نے مختصر سا جواب دے کر قدم آگے بڑھانے چاہے۔

''مسرت جہاں! کیا آج..... آپ میرے ساتھ ایک کپ کافی پئیں گی۔'' ان کی مسکراہٹ اور جواب سے اس کی ہمت بڑھی تھی۔

''کیا اس وقت.....؟'' وہ کچھ حیرانگی سے بولیں۔

''نہیں..... آپ جس وقت کہیں۔'' فرجاد سر جھکا کر بولا۔ مسرت جہاں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ بے ریا، پرخلوص، محبت بھرا یہ چہرہ، کیا اس کا باطن بھی اتنا ہی بے ریا اور محبت بھرا ہے۔ وہ سر جھکائے ان کے جواب کا منتظر تھا اور وہ اس کے متعلق سوچ رہی تھیں۔

''آپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔'' اس نے استفسار کیا۔

''پہلے دو پیریڈز کے بعد میرے پاس کچھ ٹائم ہے۔ آف ٹائم کے بعد میں کہیں نہیں جا سکتی۔''

وہ کہہ کر آگے بڑھ گئیں۔ دو پیریڈ گزرنے کے بعد جب وہ اپنے ڈیپارٹمنٹ سے باہر نکلیں تو فرجاد ملک انہیں اپنا منتظر ملا۔ مسرت جہاں نے چادر سے اچھی طرح اپنا وجود چھپا رکھا تھا۔ اس کے پیچھے بائیک پر بیٹھتے ہوئے مسرت جہاں کے دماغ نے ایک بار پھر احتجاج کیا تھا لیکن دل کے آگے اس کی ایک نہ چل سکی۔ فرجاد ملک بائیک چلا رہا تھا لیکن اسے یوں لگ رہا تھا جیسے آج وہ ہواؤں میں اڑ رہا ہے۔ جس چہرے کے خال وخد نے پچھلی بہت سی راتوں کو اسے نیند سے محروم کر رکھا تھا وہ بقول شاعر

ہم راتوں کو اٹھ اٹھ کر جن کے لیے روتے ہیں

وہ اپنے شبستاں میں آرام سے سوتے ہیں

کی تفسیر بن گیا تھا۔ جس پیکر کو تراشتے تراشتے اس کی سوچیں اس کا تخیل ----- ہو گیا تھا۔ اس کے بالکل قریب براجمان تھا۔ اس کے وجود کی دھیمی دھیمی آنچ آج فرجاد ملک کے وجود و روح میں حسرتوں کی برف پگھلا رہی تھی۔ محبت کی حرارت مل رہی تھی۔ اور اسے یوں لگ رہا تھا جیسے صدیوں سے وہ نفرتوں کے سرد خانوں میں کراتا رہا تھا۔ لیکن محبت نے کبھی جھانک نہ دیکھا تھا اور آج..... آج محبت خود چل کر اس کے پاس آ گئی تھی۔ ساری تشنگیوں کا' ساری ریاضتوں کا ثمر آج اسے مل گیا تھا۔ پہلے جذبے اس کے من مندر میں جاگے تھے۔ ایک دیوی تھی جس کے چرنوں میں پجاری کی طرح وہ محبت کے پھول دان کرتا رہا تھا۔ اسے لگا اس کی بھینٹ قبول ہو گئی تھی۔ اس سوچ کے ساتھ ہی من میں طلب جاگ اٹھی تھی۔ جس سے محبت کی جاتی ہے اس کو پانے کی آرزو خود بخود دل میں جنم لے لیتی ہے۔ اور آج جب وہ حسین پیکر اس کے انتہائی قریب تھا اس کا دل چاہا یہ سفر ساری زندگی پر محیط ہو جائے۔ یہ مانوس خوشبو اس وجود سے اٹھ رہی ہے تمام عمر میں اسی خوشبو کے حصار میں رہوں۔ دھڑکنیں رک جائیں وقت تھم جائے۔ کائنات ختم ہو جائے لیکن یہ خوشبو مجھ سے دور نہ ہو۔ اور مسرت جہاں ان کی سوچیں ایک الگ ہی منظر میں الجھی ہوئی تھیں۔ جس شخص کے سنگ ہمقدم، ہمسفر رہنے کا انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ ان کے خاندان کے لیے قابل قبول ہوگا۔ پہلے تو انہوں نے ہر طرح خود کو اس راہ پر چلنے سے روکا تھا۔ اور جب وہ اس راہ پر چل پڑی تھیں تو اب جو بھی ہو جاتا انہوں نے ایک قدم پیچھے نہیں ہٹنا تھا۔ بائیک رک گئی تو وہ بھی جیسے سوچوں کے بھنور سے نکل آئیں۔ وہ دونوں ایک بہت بڑے ریسٹورنٹ کے سامنے کھڑے تھے۔

''آیئے مسرت..... میرا خیال ہے یہاں قدرے سکون کے ساتھ ایک کپ کافی پی جا سکتی ہے۔'' فرجاد ملک مسکراتے لہجے میں بولا۔ پتا نہیں کیا بات تھی آج اسے اپنی روح ہر اذیت ہر بوجھ سے آزاد لگ رہی تھی۔ وہ سبک روی سے مسرت جہاں کے قدم سے قدم ملائے ریسٹورنٹ میں داخل ہوا۔ محبت کا ہمسفر ہونا انسان کو کتنا معتبر اور خود اعتماد بنا دیتا ہے یہ کوئی اس وقت فرجاد ملک کے حسرت آشنا دل سے پوچھتا۔

نسبتاً تاریک گوشے میں رکھے ٹیبل پر وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ فرجاد محبت پاش نظروں سے مسرت جہاں کے صبیح چہرے کو دیکھ رہا تھا اور مسرت جہاں کے رخسار شدت حیا سے تمتما رہے تھے۔ ایک انوکھی کسک، انوکھی لذت سی انہیں اپنے رگ و پے میں سرائیت کرتی محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ انجانے خدشوں اور واہموں سے ان کا کمزور سا دل گھبرا بھی رہا تھا۔

''مسرت کہنے کو تو بہت سی باتیں ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ میرے پاس وہ الفاظ نہیں ہیں جن کی ادائیگی میرے جذبوں کے اظہار کو طمانیت بخش سکے۔ تمام الفاظ محض عامیانہ اور سطحی سے لگ رہی ہیں۔ بہر حال میں نہ تو خود الجھنا چاہتا ہوں اور نہ ہی آپ کو الجھانا چاہتا ہوں۔ محبت کے رستوں پر سفر کرنے والوں کو زندگی کا ساتھی بن جانا چاہئے یہ میرا خیال ہے کیا آپ اس سے اتفاق کرتی ہیں؟'' فرجاد مسرت جہاں کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا جو سر اٹھائے اس کی بات بہت توجہ سے سن رہی تھیں۔ محبت کو قبول کرنے کا فیصلہ تو سراسر ان کا ذاتی تھا لیکن شریک زندگی چننے کا اختیار ان کے والدین نے انہیں نہیں دیا تھا۔ یہ حق اماں بی اور ابا میاں کا تھا۔

''میں اس بات کا فیصلہ تن تنہا کیسے کر سکتی ہوں۔ میری زندگی کا فیصلہ اماں بی اور ابا میاں کریں گے۔'' وہ پر سوچ انداز میں بولیں۔

''مسرت جہاں! رشتے زندگی کی خوبصورتی ضرور ہیں لیکن انہیں کمزوری نہیں بنانا چاہئے۔ آپ کی زندگی صرف آپ کی ذاتی ہوتی ہے۔ دوسرے جس طرح اپنی اپنی زندگی جی رہے ہوتے ہیں۔ آپ کو بھی اس کا مکمل اختیار ہونا چاہئے۔ میرا نہیں خیال کہ اپنے بارے میں آپ سے بہتر کوئی آپ کے لیے سوچ سکتا ہے۔''

''لیکن ہمارے ماں باپ بھی تو ہمارے لیے برا نہیں سوچتے۔ انہیں زندگی گزارنے کے بعد ایک مستند تجربہ حاصل ہوتا ہے۔ وہ جہاندیدہ ہوتے ہیں۔ پھر وہ ہمیں پال پوس کر بڑا کرتے ہیں محبت، توجہ، سہولتیں فراہم کرتے ہیں۔ کیا ان کا اتنا بھی حق نہیں ہوتا کہ وہ ہماری زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ خود کریں۔''

''مسرت جہاں! شاید اس مسئلے میں میں آپ سے بحث نہ کر سکوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان رشتوں کا مان، اعتبار، محبت میرے دامن میں نہیں ہے۔ میرا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ میں یہ بات آپ کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے نہیں کہہ رہا۔ الحمدللہ مجھے اپنی زندگی میں کبھی ان کمیوں کا احساس بھی نہیں ہوا۔ میں سیلف میڈ انسان ہوں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میری قوت فیصلہ آپ سے کہیں زیادہ ہے۔ رشتوں کی محبتیں انسان کو نہایت بزدل اور کمزور بنا دیتی ہیں۔ انسان ان محبتوں کے کھو جانے کے ڈر سے اپنے آپ کو اذیت میں مبتلاء کیے رکھتا ہے۔ لیکن ان رشتوں کی چھاؤں میں رہنا پسند کرتا ہے۔'' فرجاد ان رشتوں سے ناواقف ضرور تھا لیکن ان سے منسلک جذبوں اور احساسات سے عاری نہیں تھا۔ مسرت جہاں کے سامنے اس نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا سچ بولا تھا کہ وہ سیلف میڈ ہے اس کی زندگی کا کوئی گوشہ کسی اپنے کے زیر بار نہیں ہے۔

''آپ اکیلے ہیں مان لیا لیکن کیا کبھی آپ کو احساس نہیں ہوا کہ اس دنیا میں آپ کے بھی چند اپنے ہوتے۔'' مسرت جہاں کے لہجے میں اس کے لیے عجیب سی نرمی اور مٹھاس در آئی تھی۔

''نہیں.....یقین کیجیے مسرت جہاں کہ میں نے زندگی کو سسکتے دیکھا ہے۔ایک روٹی کی خاطر کتوں کی طرح جھگڑتے انسانیت کے علمبردار دیکھے ہیں۔میرا بچپن فٹ پاتھ کو ماں کی گود سمجھ کر وہیں روتے سوتے جاگتے گزرا۔پتھر کی سل پر سر رکھ کر ماں کی نرم گرم آغوش کا تصور کرنا بھی ایک عیاشی ہے۔لوگوں کے جوتے صاف کرتے ہوئے جھڑکیاں کھاتے ہوئے کبھی ذہن میں یہ خیال نہیں آیا تھا کہ آخر میرا کوئی اپنا کیوں نہیں۔ہاں ذہن میں یہ تصور ابھرتا تھا کہ مجھے بغیر سہارے کے زندگی سمجھ کر جینا ہے۔اور آج دیکھ لیں۔آپ کے سامنے ہوں۔تین کمروں کا فلیٹ میرا ذاتی ہے۔بہت اعلیٰ نہ سہی لیکن زندگی کی ہر سہولت سے آراستہ ہے۔میں نے تعلیم بھی اپنے بل بوتے پر حاصل کی۔اور آج اس قابل ہوں کہ پریکٹیکل لائف میں قدم رکھ سکوں۔'' فرجاد کا لہجہ بہت ٹھہرا ہوا اور کسی جھیل کی سطح کی طرح پرسکون تھا۔ مسرت جہاں دم بخود اس کی داستان حیات سن رہی تھیں۔کچھ دیر پہلے کی بوکھلاہٹ اور گھبراہٹ کہیں اڑنچھو ہو چکی تھی۔

''ہاں لیکن اب.....اب احساس ہوتا ہے کسی بہت بڑی کمی کا۔اب دل چاہتا ہے کہ اتنی بڑی دنیا میں ایک، صرف ایک میرا اپنا ہو۔جسے پانے کے بعد کوئی درد' کوئی محرومی میرے قریب نہ آسکے۔'' فرجاد ملک کی لودیتی آنکھیں مسرت جہاں کو تک رہی تھیں اور پہلی بار انہوں نے اپنے اوپر ناز کیا تھا۔فرجاد ملک جیسی شخصیت' اس جیسا انسان ان کی ہمراہی کے خواب دیکھ رہا تھا۔کیا تھا ان میں ایسا جو اس کی نظروں کو بھا گیا اور وہ اس کے دل میں اتر گئیں۔محض کچھ عرصہ ہی تو ہوا تھا انہیں ایک دوسرے سے ملے اور اتنی جلدی محبت اور پھر محبت کے حصول کی خواہش۔

''مسرت جہاں! آپ تو کچھ بولیں اتنی دیر سے میں ہی بولے جا رہا ہوں۔آپ نے ابھی تک کسی قسم کی رائے نہیں دی۔کوئی تفصیلی بات نہیں کی اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔'' فرجاد ملک کو جیسے احساس ہوا کہ اتنی دیر سے وہ بس خاموشی سے اس کی باتیں سنے جا رہی تھیں۔

''میں اپنے بارے میں کیا بتاؤں۔جس پتھریلی راہ حیات سے گزر کر آپ یہاں اس مقام تک پہنچے ہیں میں اس راستے سے انجان ہوں۔بچپن سے لے کر اب تک محض محبتیں ہی محبتیں دیکھی ہیں میں نے۔پانچ بھائیوں کی اکلوتی بہن ہونے کی وجہ سے گھر بھر نے لاڈ اٹھائے ہیں میرے۔شاید اسی لیے محرومیوں سے ناواقف ہوں۔'' مسرت جہاں کی نرم نرم آواز فرجاد کی سماعت کو سہلا رہی تھی۔یہ آواز کیا ساری زندگی اس کے اردگرد مندر کی گھنٹیوں کی طرح بجے گی۔کیا یہ حسن کی دیوی عشق کے حضور سجدہ ریز ہوگی۔جس نے تمام عمر صرف محبتوں کی رفاقت دیکھی ہو جس کے نرم پیر مخملیں قالینوں پر بھی چھل جاتے ہوں۔جسے کبھی گرم ہوا اس خیال سے نہ چھو پائی ہو کہ کہیں یہ مہکتا پھول مرجھا نہ جائے۔اس کے سنگ پتھریلی زمین پر چل پائے گی۔اتنی محبتوں کی محور و مرکز محض اس کی محبت پر قناعت کر پائے گی۔کہیں اس کا اجلا وجود گدلا نہ ہو جائے۔اس کے مہکتے نقوش حوادث زمانہ سے نہ بگڑ جائیں۔وہ کھو سا گیا۔

''آپ کیا سوچ رہے ہیں.....'' مسرت جہاں بولیں تو جیسے وہ ہوش میں آ گیا۔

''کوئی خاص بات نہیں۔'' بس یونہی ایک خیال آ گیا تھا کہ کیا اتنی سہل زندگی گزارنے والی لڑکی میرے ساتھ گزارا کر پائے گی۔

میں خود ترسی کا شکار نہیں ہوں۔ خود پر بھروسہ ہے مجھے کہ میں زندگی کا ہر سکھ دے سکتا ہوں تمہیں۔ لیکن اس کے لیے کچھ انتظار کرنا پڑے گا۔

''فرجاد ملک اچانک آپ سے تم پر آ گیا اجنبیت کی ایک اور دیوار ریت کی طرح بھربھری ہو کر ڈھے گئی۔

''میں نے کبھی زندگی کو ان مادی چیزوں کی ..... کے پس منظر میں نہیں دیکھا۔ نہ ہی یہ میری کمزوری ہیں۔ میں زندگی کو بہت سادگی سے گزارنے کی قائل ہوں۔'' مسرت جہاں کی بات سن کر فرجاد ملک مسکرا دیا۔ کس خوبصورتی سے انہوں نے اس کے ساتھ کا اقرار کیا تھا۔ کہ انہیں زندگی میں بہت زیادہ کی طلب نہیں ہے۔ وہ مادیت پرست نہیں محبت پرست ہیں۔ اور زندگی گزارنے کی ترجیحات ان کی اپنے ہمعصروں سے مختلف ہیں۔ وہ ٹیبل پر کافی رکھ کر جا چکا تھا۔

''مسرت کافی لے لیں۔'' فرجاد نے ایک کپ ان کے آگے سرکایا اور دوسرا اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔

''میرا خیال ہے بہت دیر ہو گئی ہے اب چلنا چاہئے۔'' مسرت جہاں نے گھڑی کی طرف دیکھا جو ساڑھے بارہ بجا رہی تھی۔ صرف ایک گھنٹہ رہ گیا تھا کالج آف ہونے میں۔ شاکر بھائی کا سوچ کر وہ گھبرا گئیں۔

''کیا بات ہے۔ یوں اچانک.....؟ ابھی کالج آف ہونے میں ایک گھنٹہ باقی ہے آپ فکر مند مت ہوں میں ٹائم پر آپ کو ڈراپ کر دوں گا۔ سکون سے بیٹھ کر کافی پیئیں۔'' فرجاد اطمینان سے بولا۔

''فرجاد! آپ نہیں جانتے کہ.....''

''ایک منٹ.....'' فرجاد نے مسرت جہاں کی بات کاٹ دی۔ ایک بار پھر کہیں پہلی بار آپ کے ہونٹوں سے میرا نام نکلا ہے۔ پلیز ایک بار پھر کہیں۔''

مسرت جہاں فرجاد کے اس طرح کہنے پر کچھ جھینپ سی گئیں۔ چہرے پر پھیلی شفق کی سرخی نے انہیں اور بھی حسین بنا دیا تھا۔ فرجاد بڑی دلچسپی کے ساتھ ان کے چہرے کے خال و خد دیکھ رہا تھا۔

ہر سمندر کا ایک ساحل ہے
ہجر کی رات کا کنارا نہیں
ہو سکے تو نگاہ کر لینا
تم پر کچھ زور تو ہمارا نہیں

گھمبیر لہجے میں خوبصورت لفظ ادا کرنا مسرت جہاں کو وہ بہت اپنا سا لگا۔

کیا یہ محبت..... یہ ہماری محبت روایتوں کی بھینٹ چڑھ جائے گی۔ یہ شخص جس کے دامن میں کچھ بھی نہیں سوائے ان الوہی جذبوں کے۔ کیا یہ جذبے بھی اس سے چھن جائیں گے۔ نہیں ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ ورنہ..... ورنہ یہ بکھر جائے گا۔ مسرت جہاں کچھ بھی ہو جائے اس شخص کو بکھرنا نہیں چاہئے۔

''مسرت! آپ جو کچھ سوچ رہی ہیں ایسا نہیں ہوگا۔ ہر خدشہ ذہن سے نکال دیں۔ فرجاد ملک اکیلا ضرور ہے لیکن کمزور نہیں۔ میرے جذبے بودے نہیں ہیں کہ صابن کی جھاگ کی طرح بیٹھ جائیں گے۔ میں نے آپ کو اپنا کہا ہے تو زندگی کی آخری سانسوں تک میری وفائیں میرے احساسات صرف آپ کے لیے ہی رہیں گے۔'' فرجاد ملک انہیں خاموش بیٹھے دیکھ کر جانے کیا سمجھا۔

''نہیں مجھے آپ کی محبت پر کوئی شک نہیں لیکن میں یہ سوچ رہی ہوں کہ اگر اس معاملے کی بھنک بھی ابا میاں یا میرے بھائیوں کو پڑ گئی تو کس قدر خوفناک اور بھیانک صورتحال پیش آئے گی۔ ایک قیامت آجائیگی۔'' مسرت جہاں جیسے جھرجھری لے کر رک گئیں۔

''مسرت! کیا قیامت آجائے گی ایسی باتیں مت سوچیں۔ جب اس راہ پر چل پڑے ہیں تو ہر تکلیف ہر اذیت مل کر سہیں گے۔ ہر طوفان کا مقابلہ کریں گے اس یقین کے ساتھ کہ بالآخر جیت محبت کی ہوتی ہے۔''

''فرجاد مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ آج سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں اماں بی اور ابا میاں سے اجازت لیے بغیر گھر سے باہر کہیں نکلی ہوں۔''

''اب گھبراہٹ بھول جائیں۔ کبھی کبھی یوں تنہائی میں ملا کریں گے۔ کالج میں تو وقت نہیں ملتا اور چہ مگوئیوں کا بھی نشانہ بننا پڑتا ہے۔''

''لیکن فرجاد میرے لیے روز روز آنا ممکن نہیں۔ ہماری فیملی شہر کی معروف فیملیز میں سے ہے۔ سینکڑوں جاننے والے ہیں اگر کسی نے دیکھ لیا تو بہت برا ہوگا۔'' مسرت جہاں کی سوئی ابھی تک وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

''مسرت! یہ سب ایک نہ ایک دن ہونا ہی ہے۔ آپ کے گھر والوں کو علم نہیں ہوگا تو ہم ایک دوسرے کے کیسے ہو سکیں گے بولیں.....'' فرجاد نے کہا۔ مسرت جہاں کی نظریں ٹیبل کی صاف شفاف سطح پر جمی ہوئی تھیں اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے وہ مخمصے کا شکار دکھائی دے رہی تھیں۔

''مسرت! بھروسہ کیا ہے تو اب یقین بھی رکھیں کہ یہ شخص جو آپ کے سامنے کھڑا ہے کم مایہ سہی کم حیثیت سہی لیکن کمتر نہیں ہے۔ اسے اپنے لفظوں کا پاس رکھنا آتا ہے اور اب میرا خیال ہے چلنا چاہئے۔ دیر ہوگئی تو کہیں آپ کے خدشات پہلے ہی دن حقیقت کا روپ نہ دھار لیں۔'' آخری بات اس نے مسکراتے ہوئے کہی تھی۔ مسرت جہاں بھی مسکرا دیں وہ انہیں کالج کے گیٹ پر ڈراپ کر کے چلا گیا تھا۔ کالج میں داخل ہو کر وہ وزیٹرز لابی میں جا کر بیٹھ گئیں۔ چند منٹ ہی تو رہ گئے تھے کالج آف ہونے میں۔ ان کا دل گھبرایا ہوا تھا۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ جب شاکر حسین آئے تو ان سے نگاہیں نہ ملا پائی تھیں۔ شاکر حسین نے کہا بھی کہ کیا بات ہے بی جمالو! لیکن وہ پھر بھی خاموش رہی تھیں۔ درحقیقت دل عجیب انداز سے دھڑک رہا تھا۔ خوف اور وحشت کے ملے جلتے امتزاج نے ان کے چہرے کو بہت پریشان حال سا بنا دیا تھا۔ اور وہ اپنی کیفیت پر چاہنے کے باوجود قابو نہیں پا سکی تھیں۔ اور گھر آ کر بھی وہ سب سے یونہی کترائی کترائی پھرتی رہیں۔ لیکن گھر میں کسی کی نظر میں آنا اس لیے بھی مشکل تھا کہ وہ پڑھائی کا بہانا کر کے اپنے کمرے میں پناہ گزین ہوگئی تھیں۔

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ آسمان کے صاف وشفاف چہرے پر سورج کی الوداعی کرنوں نے ایک نظر نواز سرخی پھیلا دی تھی۔ پرندوں کے غول کے غول ادھر سے ادھر اڑتے پھر رہے تھے۔ دھوپ اب سادات نگر کی دیواروں پر پہنچ چکی تھی۔ حسب معمول لان میں کرسیاں بچھائے گھر کی تمام خواتین خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔ تمام دن میں یہ وقت ایسا ہوتا تھا جب وزراء خانہ داری گھریلو امور بالکل فارغ ہوتی تھیں۔ اکثر شینا پھپھو چائے کا اہتمام کر لیتی تھیں کیونکہ کوکنگ میں وہ گھر بھر کی استاد تھیں۔ مگر بڑی اماں کے بعد۔ یہ اور بات ہے کہ طویل عرصہ ہوا بڑی اماں نے اس عہدے سے ریٹائرمنٹ لے لی تھی۔

آج بھی شینا پھپھو چائے کے ساتھ قیمہ بھرے سموسے بنا کر لائی ہوئی تھیں روبیہ اور انیقہ بھی اپنی عادت کے برخلاف خواتین کے مجمعہ میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ اور آریان کو بھی ساتھ ہی گھسیٹ لیا تھا۔ موضوع ڈاکٹر فواد کی بہن مہوش کی شادی کا تھا۔ جس کے لیے زاہدہ چچی کے بھائی مسعود علی کے لندن پلٹ بیٹے کا رشتہ آیا ہوا تھا۔ زاہدہ چچی تو بغیر کہے سنے حامی بھر لیتیں اگر بابر چچا کا ڈر نہ ہوتا۔ لیکن انہوں نے فی الحال چپ سادھی ہوئی تھی۔

''اری زاہدہ! وہ تمہارا بھتیجا بھلا لندن میں کیا کرتا ہے۔'' بڑی اماں نے اپنے دائیں جانب بیٹھی زاہدہ چچی کو مخاطب کیا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ حدیقہ چچی اس گھر کے سب افراد کو ناپسند کرنے کے باوجود ان کے ساتھ مل بیٹھتیں تھیں اور اس وقت بھی وہ وہیں موجود تھیں۔

''اماں بی! خیر سے بہت بڑی ڈگری لے رکھی ہے اس نے۔ وہیں لندن میں ہی کسی اچھی نوکری پر لگا ہوا ہے۔ شادی کے بعد اپنی مہوش کو بھی ساتھ لے جانے کا خیال ہے اس کا۔'' زاہدہ چچی کا جواب سن کر حدیقہ چچی کی آنکھوں میں تمسخر سمٹ آیا۔

''یہ تو اور بھی اچھی بات ہے اللہ نصیب اچھے کرے۔'' شینا پھپھو پرخلوص لہجے میں بولیں۔

''بھابھی! خیر سے ہمارے فواد میاں بھی تو جوان ہیں ان کے بارے میں کیا سوچا آپ نے؟'' حدیقہ چچی نے عجیب سی نظروں سے آریان کی طرف دیکھ کر زاہدہ چچی سے سوال کیا۔

''اس کے بارے میں میں نے نہیں سوچا' اُس نے خود سوچنا ہے۔ جب بہتر سمجھے گا کہہ دے گا۔ مسئلہ بیٹیوں کا ہوتا ہے۔ خدا عزت پردے کے ساتھ انہیں اپنے گھر کا کرے۔''

''بالکل! وگرنہ بیٹیاں جب منہ کو آتی ہیں تو خاندان کی عزت خاک میں مل جایا کرتی ہے۔'' حدیقہ چچی کا یہ جملہ ایک لمحے کے لیے ساری محفل کو خاموش کر گیا۔ اماں بی کے ہاتھوں میں تھامی تسبیح کے دانے حرکت کرنا بھول گئے۔ ماحول میں یکدم کشیدگی در آئی تھی۔

''چچی یہ بھی عجیب کہا آپ نے منہ کو آنے سے عزت کیسے خاک میں مل جاتی ہے۔ ویسے روبیہ کہتے ہیں آدمی کے چہرے پر عزت صرف ناک ہوتی ہے۔ یعنی جب لڑکیوں کے منہ میں دانت آ جائیں اور وہ مقابل کو ناک پر کاٹنے لگ جائیں تو عزت تو خاک میں مل ہی گئی ناں۔'' انیقہ کی بے توقع بات نے جیسے سب کی توجہ مبذول کروا دی تھی۔ چچی حدیقہ پیچ و تاب کھا کر رہ گئیں لیکن بولیں کچھ نہیں۔

''انیقہ! بدتمیزی نہیں۔'' شینا پھپھو نے سرزنش کی۔

''اوہو مما اس میں بدتمیزی کی کیا بات بھلا۔ اماں بی دیکھیں مما مجھے ڈانٹ رہی ہیں۔'' انیقہ اماں بی کی پشت سے ان کے گلے کے گرد بازو حائل کر کے اپنا چہرہ ان کے چہرے کے قریب لا کر لاڈ سے بولی۔

''ارے شینا بیٹا! ایک ہی تو چہکتی بلبل ہے ہمارے گھر کی۔ اسکو تو نہ روکا کرو۔ یہ بچیاں گھر میں موجود نہ ہوں تو گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔'' اماں بی بھی سنبھل گئی تھیں۔

''اماں آپ کے لاڈ پیار نے اس لڑکی کو تو شتر بے مہار کر کے رکھ دیا ہے۔ مجال ہے جو کوئی کل سیدھی ہو اس کی۔'' شینا پھپھو بظاہر اس کی شکایت کر رہی تھیں لیکن درحقیقت ان کے ایک ایک لفظ میں محبت کا رچاؤ محسوس کر کے انیقہ مسکرانے لگی۔ اسی پل گیٹ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ سب کی نظریں اس سمت اٹھ گئیں۔ سیاہ کرولا بہت دھیمی رفتار سے پورچ میں آ کر رکی تھی۔

''ہیں فواد اس وقت.....'' زاہدہ چچی نے بلند آواز میں خود کلامی کی۔ باقی سب بھی قدرے حیران ہوئے۔ ڈاکٹر فواد پچھلے تین چار سال سے کلینک چلا رہے تھے۔ لیکن اس وقت وہ اس سے پہلے کبھی نہیں آئے تھے۔ گاڑی کا دروازہ کھلا اور فواد باہر نکلے۔ انہیں دیکھ کر ایک لمحے کو وہاں موجود سب ہی کے دل دھک سے رہ گئے۔ پیشانی پر بینڈیج اور سفید براق شرٹ پر جا بجا خون کے دھبے۔ سب کو لان میں بیٹھا دیکھ کر وہ بھی ان کی طرف آنے لگے۔ زاہدہ چچی آگے بڑھ کر ان سے استفسار کرنا چاہتی تھیں لیکن ان کے چہرے پر پھیلے تاثرات نے انہیں قدم روکنے پر مجبور کر دیا۔ ان کے ہونٹوں پر ایک پتھریلی چپ جیسے گڑ کر رہ گئی تھی۔ چٹانوں جیسی سختی اور بھینچے ہوئے ہونٹوں نے ان کے چہرے کے جاذب نظر نقوش کو بگاڑ دیا تھا۔ ان کی نظروں کا مرکز آریان تھی۔ وہ یک ٹک اس کی طرف دیکھے جا رہے تھے یہ خیال کیے بغیر کہ ان کے اردگرد بہت سے اور افراد بھی موجود ہیں۔ ان کا ناقابل فہم رویہ سب کو ہی کھٹک رہا تھا۔

''کیا بات ہے فہدی! یہ کیا ہوا؟'' زاہدہ چچی کی بے قرار ممتا ٹھہر نہ سکی۔ حالانکہ وہ جانتی تھیں کہ فواد جب اس درجہ شدید کیفیت میں ہوتا ہے تو پھر کسی کی نہیں سنتا۔ عجیب دوہری شخصیت کے مالک تھے وہ انتہائی کول مائینڈڈ محتاط، ریزرو اور سلجھی ہوئی شخصیت تھی ان کی۔ شاذ و نادر ہی انہیں غصہ آتا تھا اور جب انہیں غصہ آتا تھا تو اس کا ردعمل اس قدر شدید ہوتا تھا کہ گھر کے سب ہی افراد تو کیا در و دیوار تک لرز اٹھتے تھے اور ان کی اس وقت کی کہی ہوئی بات کوئی ٹالنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ اب بھی زاہدہ چچی کے پوچھنے کے باوجود نہ تو انہوں نے نظروں کا زاویہ بدلا تھا اور نہ ہی ان کے سوال کا جواب دیا تھا۔ البتہ وہاں موجود سب ہی افراد نے ان کی نظروں کا محور دیکھ لیا تھا۔ آریان اس سچویشن سے گھبرا گئی اور اضطراری انداز میں کرسی سے اٹھ کھڑی ہوگئی۔

''آپ..... آپ ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟'' ہمت کر کے اس نے پوچھ ہی لیا۔ کہ اس وقت اسے اپنی پوزیشن انتہائی آکورڈ محسوس ہو رہی تھی۔ فواد کی آنکھوں میں اپنے لیے نفرت اور گرسنگی محسوس کر کے وہ اپنے اندر جیسے کٹ کر رہ گئی تھی۔ لیکن انہیں تو جیسے احساس تک نہیں تھا کہ اتنا سخت رویہ وہ کتنی بے ضرر سی لڑکی کے ساتھ روا رکھے ہوئے ہیں۔ فواد نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سر جھکائے دونوں

ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے یوں کھڑی تھی جیسے اس سے جانے کتنا بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہو۔ پھر اچانک ایک بھونچال سا آ گیا تھا۔ کوئی سمجھ ہی نہ پایا کہ کیا ہوا۔ فواد نے آگے بڑھ کر آریان کو کلائی سے پکڑا اور تقریباً گھسیٹنے والے انداز میں پھپھو شینا کے پورشن کی طرف بڑھے۔

''ارے، ارے فہدی ایک منٹ ٹھہرو کیا کر رہے ہو.....'' زاہدہ چچی تیزی سے اس کے پیچھے لپکیں۔

''زاہدہ! رک جاؤ۔'' اماں بی واحد ایسی ہستی تھیں جو اس عجیب و غریب سچویشن میں بھی حواس برقرار رکھے ہوئے تھیں۔ شینا پھپھو، تائی مقسوم، روبیہ، انیقہ حتیٰ کہ حدیقہ چچی بھی ہق دق کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھیں۔

''جانتی ہوں کہ غصے کی اس کیفیت اس دورے کے دوران اسے کسی کی تمیز نہیں رہتی۔ بھروسہ رکھو اپنے دودھ پر اور سادات کے خون پر۔ ضرور کچھ غیر معمولی ہوا ہے جو بچہ اتنے سخت رویے سے پیش آیا۔ انتظار کرو ابھی پتا چل جائے گا۔

''اماں بی..... اسے اتنا خیال نہیں آیا یوں سب کے درمیان سے ایک اجنبی لڑکی کو.....'' زاہدہ چچی بات مکمل نہ کر سکیں۔ ان کی آنکھوں میں تذلیل کے احساس سے آنسو آ گئے تھے کہ جس بیٹے کے کردار کی قسمیں کھاتی رہی تھیں آج اس نے بھری محفل میں انہیں شرمندہ کروا دیا تھا۔

''نہیں زاہدہ! کوئی غلط اندازہ مت لگانا۔ کردار کوئی اتنی معمولی چیز نہیں جسے یوں پل بھر میں پرکھ کر فیصلہ صادر کر دیا جائے۔ فہدی میرا خون ہے۔ میرا ایسا بچہ ہے جو بجا طور پر لائق فخر ہے۔'' اماں بی کے چہرے پر اطمینان تھا لیکن وہاں موجود باقی سب خواتین اس غیر متوقع صورتحال سے کسی حد تک برافروختہ ہو رہی تھیں۔

فواد نے کمرے میں داخل ہو کر آریان کو ایک جھٹکے سے سامنے بیڈ کی سمت دھکیلا اور دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھا دی۔ آریان کے لیے ان کا یہ رویہ ناقابل فہم اور کسی حد تک ناقابل برداشت تھا۔ وہ بیڈ پر بیٹھی ان کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ وہ اس کے سامنے یوں تن کے کھڑے تھے جیسے وہ بھاگنے کا ارادہ رکھتی ہو۔

''کون ہو تم.....؟ کس خاندان سے تعلق ہے تمہارا.....؟ بولو..... سچ سچ بتاؤ مجھے! کون ہو تم.....؟'' ایک ایک لفظ چبا چبا کر ادا کرتے ہوئے ان کی وحشت بھری آنکھیں اس کے چہرے کے خال و خد کو ٹٹول رہی تھیں۔

میں..... میں..... نے بتایا تو تھا کہ.....'' بوکھلاہٹ میں وہ بات مکمل نہ کر سکی۔

''دیکھو..... یہ کہانی انہی کے سامنے دہرانا جن کو پہلے تم یہ کہانی سنا چکی ہو اور جنہوں نے تمہاری اس احمقانہ منطق کو تسلیم کر لیا ہے۔ سچ کیا ہے؟ تمہاری اصلیت کیا ہے.....؟ میں جان چکا ہوں لیکن تمہارے منہ سے سننا چاہتا ہوں میرے سامنے اب جھوٹ مت بولنا۔''

''میرا..... یقین کریں کہ.....''

''تمہارا یقین کروں یا ان دونوں حرام کے جنوں کا یقین کروں۔ جو آج میرے کلینک پر آئے تھے۔'' فواد نے اس کی بات

کاٹتے ہوئے سخت ترش لہجے میں کہا۔

؟''کک..... کک..... کیا مطلب.....؟ کون.....؟'' آریان بے جان لہجے میں بولی۔

''وہ تمہارے یار جو تمہیں اپنی ملکیت گردانتے ہیں۔ تم روبیہ کے ساتھ بازار گئی تھی وہاں سے وہ تمہارا پیچھا کرتے ہوئے یہاں..... ہمارے گھر تک آپہنچے۔ اور یہاں سے میرے کلینک کا پتا کر کے آج وہاں جا پہنچے۔ جانتی ہو ان حرام زادوں نے کیا کہا۔ وہ کہتے ہیں کہ تمہیں خاموشی سے ان کے حوالے کر دیا جائے نہیں تو بہت سے مسائل کھڑے ہو جائیں گے ہمارے لیے۔ دھمکیاں دی ہیں انہوں نے مجھے۔ یہ دیکھ رہی ہو۔'' فواد نے اپنی پیشانی کی طرف اشارہ کیا۔

''کلینک میں توڑ پھوڑ کی ہے انہوں نے۔ میرے سٹاف کے سامنے میری عزت دو کوڑی کی کر کے رکھ دی۔ انہوں نے تمہاری قیمت ادا کی ہوئی ہے۔ تو کیسے چھوڑ دیں تمہیں۔ اب بتاؤ کس کا یقین کروں۔ تم نے آج تک اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا لیکن آج تمہیں بتانا ہوگا۔ کون ہو تم.....؟ کیا اصلیت ہے تمہاری؟..... کیا؟..... کیا..... حقیقت کیا ہے تمہاری..... کوئی بکاؤ چیز ہو تم کہ کوئی بھی تمہاری بولی لگاتا پھرے۔ جیسے ان دونوں نے تمہاری قیمت دی ہوئی ہے۔ کیا..... کیا قیمت ہے تمہاری بولو؟''

آریان کسی بت کی طرح ساکت بیٹھی ان کے لہجے کی سنگ بازی اپنی جان ناتواں پر سہہ رہی تھی اس کے حلق میں آنسوؤں کا گولہ پھنسا ہوا تھا اور آنکھیں یکدم شہر خموشاں کی طرح ویران اور بے صدا نظر آنے لگی تھیں۔

''اب خاموش کیوں بیٹھی ہو۔ کیا صفائی نہیں دو گی..... کیا رشتہ ہے تمہارا ان دونوں سے..... کس قسم کے تعلقات رہے ہیں تمہارے ماضی میں ان سے.....؟'' انہوں نے ایک لمحے کا توقف کیا۔ زہر خند نظروں سے اس کی طرف دیکھتے رہے۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔

''اب یوں سر جھکا کر کیا سوچ رہی ہو..... کیا اس طرح تم اپنی پاک دامنی کا اپنی پارسائی کا یقین دلانا چاہتی ہو؟ کیا اس طرح یقین آجائے گا مجھے؟ دیکھو مجھے سب کچھ سچ سچ بتا دو۔'' فواد کے اصرار کے باوجود جواب میں خاموشی ہی رہی۔

''میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں۔ کیا حقیقت ہے تمہاری؟ کون ہیں وہ؟ کس لیے قیمت ادا کی ہے انہوں نے تمہاری؟'' جواب میں پھر خاموشی۔ فواد اس کی مسلسل خاموشی سے بری طرح جھنجلا گئے۔

''دیکھو۔ میں پھر کہہ رہا ہوں کہ بتاؤ مجھے..... اپنی اصلیت بتا دو..... ایسا نہ ہو کہ میں بھول جاؤں کہ تم عورت ہو..... اس سے پہلے کہ تم پر میرا ہاتھ اٹھ جائے۔ سب کچھ بتا دو مجھے۔ میں عورت پر ہاتھ اٹھانا اپنی مردانگی کی تذلیل سمجھتا ہوں۔'' اس بار بھی اس نے نہ سر اٹھا کر دیکھا تھا اور نہ ہی کوئی جواب دیا تھا۔ فواد کا پارہ انتہا درجے کو چھونے لگا۔

''بھونکو..... بکواس کرو اگر اب بھی تم نہ بولیں تو پھر میں ہر لحاظ بھول جاؤں گا۔ میں اپنے گھر میں تمہارا غلیظ وجود برداشت نہیں کر سکتا۔ اس سے پہلے کہ تمہارے وجود کی سیاہی میرے خاندان کے اجلے دامن کو داغدار کر دے میں تمہارا گلا گھونٹ کر تمہیں یہیں دفن کر دوں گا۔'' ڈاکٹر فواد غصے کی انتہائی کیفیت میں تھے ان کی اس بات کے اختتام پر آریان نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ اف خدایا اس

وقت اس کی آنکھوں کا لہولہو رنگ، اس کی بھینچی ہوئی مٹھیاں اور شدت ضبط سے سرخ پڑتا چہرہ۔ وہ تقریباً چیخ پڑی۔

''آؤ..... آگے بڑھو..... گلا گھونٹو میرا..... دیر کس بات کی ہے؟ ..... کس چیز کا انتظار ہے؟ میں بھی تو دیکھوں ایک مرد کے ہاتھوں میں کتنی طاقت ہوتی ہے۔ میری اصلیت پوچھتے ہو..... اپنی اصلیت تو جان لو۔ کتنے چہرے ہیں تم مردوں کے، کتنے روپ ہیں، کتنے پرت ہیں تم مردوں کی ذات کے..... ایک وہ مرد تھا وہ شریف زادہ جس کا گندا خون میری رگوں میں زندگی بن کر دوڑ رہا ہے..... اور وہ بھی مرد ہیں جو کسی بکاؤ چیز کی طرح میری قیمت لگا رہے ہیں مجھے خریدنا چاہتے ہیں..... اور اور تم بھی تو مرد ہو جو میرا گلا گھونٹنے کو تیار کھڑے ہو..... آؤ گھونٹو میرا گلا..... ختم کر دو مجھے..... میں تو خود اس زندگی سے تنگ ہوں..... کب جینا چاہتی ہوں میں تمہارے اس معاشرے میں..... اس گندے معاشرے میں..... غلاظت کے ڈھیر پر زندگی گزارنا گوارا نہیں ہے مجھے۔ خودکشی حرام نہ ہوتی تو میں کب کی زندگی کے اس ناگوار بوجھ سے چھٹکارا پا چکی ہوتی۔ مجبور ہوں زندہ رہنے پر۔ میرے ساتھ ساتھ میری اس مجبوری کا بھی خاتمہ کر دو۔ نجات دلا دو مجھے اس عذاب خانے سے۔'' وہ ہذیانی انداز میں چیخ رہی تھی۔ اس کے چہرے سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ اس کے منہ سے الفاظ نہیں آگ کے انگارے جھڑ رہے تھے۔

''کیا سمجھتے ہو تم مرد لوگ.....؟ کیا عزت، غیرت، انا، خودداری صرف تمہاری ہی میراث ہے؟ کیا سمجھتے ہو عورت کو کیا صرف نفسانی جذبات کی تسکین کے لیے بنایا گیا ایک کھلونا کبھی تم ایک شریف زادے کے روپ میں آتے ہو ایک معصوم اور کچے ذہن کی لڑکی کو ورغلاتے ہو پھر اسے چھوڑ کر جاتے ہو تو پلٹ کر نہیں دیکھتے کہ جسے اکیلا چھوڑ آئے ہو وہ کس حال میں ہے۔ تمہارے ان چند لمحوں کی تسکین کے نتیجے میں مجھ جیسی سیاہ اور بکاؤ چیزیں دنیا میں آتی ہیں۔ پھر تم ایک نقاب اوڑھ کر آتے ہو۔ ایک تاجر ایک خریدار کے روپ میں اور ہماری بولی لگاتے ہو۔ پھر ایک نئے روپ میں آتے ہو ایک سلجھے ہوئے باشعور انسان کے روپ میں پھر کسی بھڑوے کی دو باتیں سن کر پل بھر میں کسی گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ہو اور ہمارا گلا گھونٹنے آجاتے ہو۔ بتاؤ..... پہلے اپنی اصلیت بتاؤ۔ ان میں سے تمہارا اصل روپ کون سا ہے!؟ سن لو سید فواد علی شاہ کان کھول کر سن لو۔ میں کوئی بکاؤ چیز نہیں ہوں میری عزت اتنی سستی نہیں جس کی تم لوگ بولیاں لگاتے پھرو۔ بہت بڑا نام بہت بڑے آدمی ہو تم۔ بہت پیسہ ہے تمہارے پاس مگر یہ اپنے ذہن میں بٹھا لو۔ کہ تم جیسے بیسیوں دولت کے شہنشاہ میری عزت کی بولی لگانے اٹھ کھڑے ہوں تو تمہاری سات پشتیں تک نیلام ہو جائیں گی مگر میری عزت کی بولی نہیں لگا پاؤ گے۔ اپنی اصلیت تو تم جانتے نہیں۔ میں اپنی اصلیت جانتی ہوں تم بتاؤ تم کیا سننا چاہتے ہو۔ کیا بتاؤں تمہیں یہ کہ میری ماں کو محبت کی کیا سزا ملی؟ یا وہ کوٹھے کی زینت کیسے بنی؟ یا یہ کہ میں ایک طوائف زادی ہوں۔ ہاں! میں کوٹھے پہ پیدا ہوئی ہوں..... میں ہوں طوائف زادی..... میں طوائف زادی ہوں..... اپنی عزت بچانے کے لیے وہاں سے بھاگ کر آئی ہوں اور دو کوڑی کی ہو کر رہ گئی ہوں۔ کیوں؟ صرف اس لیے کہ اپنی عزت کو محفوظ رکھنا چاہتی ہوں۔ اگر خود کو نیلام ہو جانے دیا ہوتا۔ خود کو گدھوں کے حوالے کر دیتی تو آؤ مجھے نوچ کھسوٹو تو تم جیسے غیر مند اور عزت بردار میرے تلوے چاٹ رہے ہوتے۔ بات کرتے ہو عزت اور غیرت کی۔ ان لفظوں کے تقدس اور عظمت سے آشنائی بھی

ہے تمہیں۔ فواد علی شاہ! تم ایک مرد ہو مگر زمانے کو میں نے تم سے زیادہ دیکھا ہے۔ حالات کے تھپیڑے اور وقت کی ٹھوکریں تم سے زیادہ کھائی ہیں۔ تم ان لوگوں میں سے ہو جو آنکھوں پر بنیاد پرستی کا چشمہ لگا کر دنیا کو دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ جن کے نزدیک حقیقت اور اصلیت اچھا اور برا وہی کچھ ہے۔ جو ماں باپ کی گھٹی کی طرح تمہارے دماغ میں ڈالا ہے۔ یا اخلاق کی کتابوں میں پڑھا۔ مگر میں نے ..... میں نے دنیا کو ورق ورق پڑھا ہے۔ وقت کو استاد مانا ہے۔ اچھے برے اور صحیح غلط کی تمیز مجھے تم سے زیادہ ہے۔ تم مرد لوگ جو شہروں میں اپنے گلی کوچوں میں شرافت اور عزت کا ڈھنڈورا پیٹتے ہو کوٹھے اور طوائف کے نام پر توبہ توبہ کرتے ہوئے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہو۔ کبھی یہ جاننے یہ سوچنے کی کوشش کی ہے۔ کہ آج تک کوٹھے کیوں آباد ہیں۔ صرف تم لوگوں کی وجہ سے..... کوٹھوں کے در و دیوار تم مردوں کو دعائیں دیتے ہیں جن کے دم قدم سے ان میں رونق رہتی ہے۔ کوٹھوں اور طوائفوں سے اتنی ہی نفرت ہے تو یہ سب ختم کر دینے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ بتاؤ مجھے..... بتاؤ مجھے کسی ایک ایسے مرد کا۔ جس نے کبھی اس نیت سے کسی طوائف کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے بہن کہا ہو۔ کہ میں اسے اس غلاظت کی دلدل سے نکال کر اسے عزت بخشوں۔ کسی کو بیٹی کہا ہو یا بیوی بنا کر عزت کا سانجھا بخشا ہو۔ جب ایسا نہیں ہوگا۔ تمام مرد اپنی ہوس کی بھوک مٹانے کے لیے جائیں گے تو کوٹھے تو سدا آباد رہیں گے۔ کوئی اور مخلوق تو نہیں اترے گی۔ بتاؤ..... سید فواد علی..... دنیا کی کونسی عورت ہے جو شوق سے کوٹھے پر بیٹھنا پسند کرے گی۔ دنیا میں ایسی بے شمار عورتیں ہیں جن کے سر پر باپ کا سایہ نہیں ہوتا جنہیں بھائی کا مان نہیں نصیب ہوتا۔ پیٹ کا ایندھن بھرنے کو انہیں گھر کی چار دیواری سے نکلنا پڑتا ہے۔ ان کی قابلیت کو بعد میں دیکھا جاتا ہے پہلے ان کے جسموں کو دو ہزار کی نوکری دیتے ہوئے جان جاتی ہے مگر ایک رات کے بیس ہزار بھی دینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ ایسی مجبور اور لاچار عورتوں کو تم جیسے عزت دار اور غیر مند کوٹھوں کا رستہ دکھاتے ہیں۔'' آریان بولی تو جیسے صدیوں کے غبار کو باہر نکلنے کا راستہ مل گیا۔ لفظوں کی صورت جیسے زہر اگل رہی تھی۔ اسے خود احساس نہیں تھا کہ وحشت اور جنون کی اس کیفیت میں وہ کیا بولے جا رہی ہے۔ اور ڈاکٹر فواد تو جیسے سن کر رہ گئے تھے۔ انہیں احساس ہو رہا تھا کہ بلا سوچے سمجھے بغیر تصدیق کیے محض دوسروں کے منہ سے چند باتیں سن کر کس قدر ناروا رویہ انہوں نے آریان کے ساتھ اپنایا۔ اور کیسے سخت ترش الفاظ کہہ دیئے تھے۔ وہ اپنی جگہ ساکت و مبہوت کھڑے سن رہے تھے اور آریان بے تکان بولے چلی جا رہی تھی۔

''کوٹھے برے گردانے جاتے ہیں شاہ صاحب! کوٹھے والوں کو بھی کوئی اچھا نہیں سمجھتا۔ مگر ایسے اچھوں سے کوٹھے والے بہت اچھے بہت باعظمت ہوتے ہیں۔ آپ کی دنیا میں اخلاقیات اور آداب کے لیکچر چلتے ہیں مگر ان کی گردان کرنے والوں کو اخلاق و آداب کی تمیز نہیں ہوتی۔ یہ تو کب کے دم توڑ چکے ہیں اخلاق و آداب کی روایات کو صرف کوٹھے زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ کبھی کسی کوٹھے پر جا کر بے عزت بے غیرت بے حیا اور ان اخلاق باختہ لوگوں سے مل کر دیکھئے گا آپ کو پتا چلے گا کہ اخلاق کیا ہوتے ہیں؟ آداب کیا ہوتے ہیں؟ آپ کی دنیا میں بے شمار سفید پوشوں کے ایسے گھرانے ہیں جو کوٹھوں سے بدتر ہیں۔ کوٹھے والوں کے تو پھر بھی کچھ اصول کچھ ضابطے ہوتے ہیں۔ مگر ایسے لوگوں نے تو انسانیت کو مسخ کر کے رکھ دیا۔ رشتوں کے تقدس کو پامال کر کے رکھ دیا ہے۔'' آریان خاموش ہوگئی۔ اس کی

خوبصورت آنکھوں سے آنسو آبشار کی مانند رواں تھے۔ اسے احساس تک نہیں تھا کہ وہ اتنی دیر کیا کچھ بول گئی تھی۔ بے ربط لفظ اس کے اندر سے کیا نکلے تھے جیسے اس کے سینے پر دھرا بوجھ کم ہو گیا تھا۔ وہ حواسوں میں آ گئی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا ڈاکٹر فواد بالکل ساکت کھڑے خاموش نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے اس نے محسوس کیا کہ پچھلے کئی لمحوں سے وہ اسی طرح اس کی بے تکی باتیں خاموشی اور توجہ سے سن رہے تھے۔ ایک دو پل وہ خاموش رہی کہ شاید وہ کچھ بولیں۔ لیکن وہ یونہی چپ رہے۔ اس نے سر جھکا کر اپنی گود میں دھرے ہاتھوں پر نظریں مرکوز کر دیں اور پھر سلسلہ کلام وہیں سے جوڑا جہاں سے ٹوٹا تھا۔

''میں نے جب آنکھ کھولی تو ہر بچے کی طرح میرے کانوں میں اللہ اکبر کی صدائیں گونجی نہیں میری سماعت طبلے کی تھاپ اور گھنگھروں کی جھنکار سے مانوس ہوئی۔ مجھے آپ کی طرح پالنے میں لیٹ کر ماں کی لوری سننے کا سونا نصیب نہیں ہوا۔ طبلے کی آوازیں میرے لیے لوری کا کام کرتی رہیں۔ میں بچپن میں کھلونوں سے نہیں کھیلی۔ کبھی کھلونے نصیب ہی نہیں ہوئے ٹوٹے ہوئے گھنگھروں کے ساتھ کھیلتی تھی میں پھر امی نے مجھے واجبی سی تعلیم خود دی اور پھر کوٹھا قبیلے سے ناراضگی مول لے کر مجھے اسکول میں داخل کروا دیا۔ اس لیے کہ میری ماں کوئی طوائف نہیں تھیں وہ بھی پڑھی لکھی ہوئی خاندانی عورت تھیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ میں اس ماحول میں بس جاؤں سو انہوں نے مجھے پڑھایا لکھایا۔ گھنگھرو بابا نے ہمارا بہت ساتھ دیا۔ ماں مجھ سے مل نہیں سکتی تھی لیکن میرا خیال پھر بھی رکھا جاتا تھا گھنگھرو بابا ہر دس پندرہ دن بعد آتے تو ماں کا خط بھی ان کے ہمراہ ہوتا۔ میری تمام ضرورتوں کا خیال رکھا جاتا تھا۔ ماں کے خط میں میرے لیے تسلی و تشفی ہوتی وہ مجھے ہمیشہ اپنی طرف سے مطمئن کرتی تھیں کہ وہ بالکل ٹھیک ہیں میں ان کی فکر نہ کروں اور خوب توجہ سے دل لگا کر پڑھوں لیکن میں جانتی تھی کہ امی ذہنی طور پر بہت پریشان رہتی ہوں گی۔ پھر بی۔ اے کے پیپر دینے کے بعد ماں کی یاد شدت سے دل میں جاگی تو میں خود کو روک نہ پائی اور ان سے ملنے چلی گئی لیکن اس کے بعد مجھے کالج جانا نصیب نہیں ہوا۔ بڑی نائیکہ نے جو جانے کب سے مجھ پر نگاہ رکھے بیٹھی تھی۔ مجھے کوٹھے کے ماحول اور اس کے رنگ میں رنگنا چاہا۔ مجھے مجبور کیا جانے لگا اس غلیظ دھندے پر جس سے بچانے کی خاطر ماں نے میری جدائی کا بن باس کاٹا تھا۔ ہم دونوں کے انکار نے انہیں مشتعل کر دیا۔ مجھ سے زیادہ تشدد میری ماں نے خود پر سہا۔ کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔ لیکن نائیکہ نے چھپ کر میرا سودا کر دیا۔ میرے ساتھ دو اور لڑکیاں تھیں۔ ہمیں وہاں چھوڑنے کے لیے ان دو آدمیوں کے علاوہ جو آپ سے ملے گھنگھرو بابا بھی ہمارے ساتھ جا رہے تھے اور موقع دیکھ کر انہوں نے مجھے بھگا دیا۔ اس دن میں انہی کے چنگل سے نکل کر بھاگی تھی اور آپ کی گاڑی کے سامنے آ گئی۔ میری بدقسمتی کہ میں بچ گئی کاش مر چکی ہوتی کم سے کم آپ کے لیے تو ذلت کا باعث نہ بنتی اور پھر میرے گھنگھرو بابا۔ میں ان کی طرف سے بھی بہت فکر مند ہوں اگر یہ راز کھل گیا کہ مجھے انہوں نے فرار میں مدد دی ہے تو خدا جانے وہ بھیڑیئے ان کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔'' آریان دھیمے لہجے میں بولی۔ آنسو اب بھی اس کی پلکوں کی حدیں عبور کر کے اس کے رخساروں کو بھگو رہے تھے۔ کمرے کی فضا میں ایک بوجھل سی خاموشی در آئی۔ ایسی بوجھل خاموشی ایسا سکوت جس کے نیچے دھڑکنیں بھی دبی دبی سہمی سہمی سی محسوس ہونے لگیں۔ وہ گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی تھی۔ منتظر..... ڈاکٹر فواد کی طرف سے کسی بات کی منتظر۔

''آریان.....آئی ایم سوری..... مجھے معاف کردیں کہ میں نے بنا سوچے سمجھے آپ کے ساتھ اس قدر تلخ رویہ رکھا۔ آئی ایم ایکسٹریملی ویری سوری۔'' بہت دیر بعد خاموش فضا میں ڈاکٹر فواد کی جھجکتی ہوئی آواز نے ارتعاش پیدا کیا۔ آریانے گھٹنوں پر سے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ کیا کچھ تھا اس کی بے خواب نظروں میں رنج، ملال، شکوے، مان کے ٹوٹ جانے پر کرچی کرچی ہوتا یقین، توقعات کی ناکامی کا کرب۔ بس ایک نظر کے بعد اس نے پھر سر جھکا لیا تھا۔ لیکن وہ ایک نظر ڈاکٹر فواد کو ان کی اپنی نظروں میں شرمندہ کر گئی۔ ان کا دل اپنے گزشتہ رویے پر انہیں بری طرح ملامت کرنے لگا اور آریان! کوئی اس سے پوچھتا کہ کیا محض رسمی سا ایک معذرتی لفظ ان زخموں کا مداوا کرسکتا ہے جو فواد کے کہے لفظوں سے اس کی روح پر نقش ہو گئے تھے۔

''میں جانتا ہوں کہ معذرت اور معافی کا یہ لفظ بہت رسمی اور چھوٹا محسوس ہوتا ہے۔ لیکن میں واقعی شرمندہ ہوں۔ آج تک میں نے جانے انجانے میں کبھی کسی کا دل نہیں دکھایا لیکن آج اس گناہ کا مرتکب ہو گیا ہوں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جس بات سے دل کو دکھ پہنچے انسان اسے کبھی نہیں بھول سکتا لیکن میں آپ سے یہی کہوں گا کہ آپ کی اعلیٰ ظرفی ہوگی اگر میرے کہے الفاظ پر مجھے معاف کردیں۔

''ڈاکٹر فواد سخت شرمندہ تھے۔ کہ بنا سوچ بنا تصدیق کیے انہوں نے اس کو اس حد تک ملامت کیا۔ اس کی نسوانیت کی توہین کردی۔ ان کی باتوں کے جواب میں بھی اس نے سر اٹھا کر نہ دیکھا تھا اور نہ ہی کوئی بات کی تھی کمرے میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی تھی بس آریان کی دھیمی دھیمی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ پھر اسے اپنے پیرو پر نرم گرم لمس محسوس ہوا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو ایک پل کو جیسے اسے زوردار جھٹکا لگا اسے لگا جیسے بجلی کی ننگی تاریں اس کے پیروں سے چھو گئی ہوں۔ ڈاکٹر فواد کے ہاتھ اپنے پیروں پر دیکھ کر ایک جھٹکے سے وہ پیچھے کو سرک گئی تھی۔ آنکھوں میں حیرت تھی اور رویے میں ہچکچاہٹ۔

''یہ..... یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟''

''میں جانتا ہوں آریان کہ میرا جرم بہت بڑا ہے ایک باعصمت اور مریم جیسی پاک دامن باکردار لڑکی کے لیے کس قدر اذیت کا باعث ہے اس کی کردار کشی کی جائے لیکن پھر بھی میں معافی مانگتا ہوں۔ اگر ہو سکے تو میرا یہ جرم معاف کردیں۔''

''نہیں فواد صاحب! آپ نے جو کچھ کہا۔ ٹھیک ہی کہا۔ مجھ جیسی لڑکی کو بھلا عزت دار گھرانے میں رہنے کہاں زیب دیتا ہے۔ میں تو بہت پہلے ہی یہاں سے جانا چاہتی تھی لیکن سب کے محبت بھرے رویے میرے زخمی پیروں کی زنجیر بن گئے۔ حرماں نصیب ہوں ناں۔ ترسی ہوئی ہوں محبت کو۔ سوچا چلو زندگی کے چار دن محبت کے جرع مل رہے ہیں تو پی لو۔ کچھ تشنگی تو دور ہوگی..... کچھ پیاس تو کم ہوگی۔ لیکن اب میرا خیال ہے کہ اس سے پہلے میرا وجود یہاں رہنے والوں کے لیے توہین کا باعث بنے۔ میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔

''آریان ٹوٹے ہوئے لہجے میں گویا ہوئی۔

''دیکھیے آریان! میں پہلے ہی بہت شرمندہ ہوں۔ آپ سے معافی کا خواستگار ہوں۔ پلیز مجھے اور شرمندہ مت کریں۔'' ڈاکٹر فواد کے چہرے پر پشیمانی کی تحریر واضح لکھی نظر آرہی تھی۔

''نہیں ڈاکٹر صاحب! مجھ جیسی لڑکی کے لیے آپ شرمندہ نہ ہوں آپ نے سوری کیا میں نے مان لیا لیکن میں اب یہاں رک نہیں سکتی۔''

''کیوں.....؟'' وہ اتنا ہی کہہ پائے۔

''اس لیے کہ میں مزید اپنی بے عزتی نہیں کروا سکتی۔ اس سے بہتر یہی سمجھتی ہوں کہ چلی جاؤں۔''

''آریان! اس کا مطلب یہ ہے آپ نے دل سے مجھے معاف نہیں کیا۔''

''نہیں ایسی بات نہیں۔''

''تو پھر کیا وجہ ہے جو آپ یہاں سے جانا چاہتی ہیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ آپ یہاں سے مت جائیں۔''

''کیا کوئی اور بات رہ گئی ہے۔ کچھ باقی ہے ابھی۔'' آریان کی بھیگی آنکھوں کا سوال ڈاکٹر فواد کو لاجواب کر گیا۔

''میں یہاں رک کر سب کی نظروں سے گرنا نہیں چاہتی۔ جن آنکھوں میں کل تک میرے لیے پیار تھا۔ احترام تھا۔ ان آنکھوں میں اپنے لیے نفرت نہیں دیکھ پاؤں گی میں۔ میں اب مزید کسی عدالت کے آگے جواب دہ ہونا نہیں چاہتی۔''

''نہیں آریان! اگر میں یہ کہوں کہ آپ کو کسی سوال کا' کسی تحقیر بھری نگاہ کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا تو.....تو کیا تب بھی آپ کا یہی فیصلہ ہوگا جواب ہے؟''

''اتنے افراد کے درمیان سے آپ مجھے گھسیٹ کر لائے ہیں آپ کیا سمجھتے ہیں آپ کی اس حرکت کو وہ محض مذاق سمجھ کر نظر انداز کر دیں گے۔ نہیں فواد صاحب! ایسا نہیں ہوگا ان سب کے ذہنوں میں میرے لیے شکوک وشبہات آپ نے خود پیدا کر دیئے ہیں۔''

''آریان! یہ میرا ہیڈک ہے۔ میں نے معاملے کو الجھایا ہے تو سلجھاؤں گا بھی میں خود ہی اور یہ میرا وعدہ رہا کہ آپ سے نہ تو کوئی کچھ پوچھے گا اور نہ ہی کسی کی نظروں میں آپ کے لیے حقارت یا ناپسندیدگی کا تاثر ابھرے گا لیکن آپ وعدہ کریں کہ آپ یہاں سے نہیں جائیں گی۔ اس لیے کہ جب میں آپ کو اپنے گھر لے کر آیا تھا تو اسی وقت آپ کو ایک گھریلو فرد کی سی حیثیت اور اہمیت حاصل ہو چکی تھی۔ اس گھر سے منسلک ہونے کی وجہ سے آپ اب ہماری ہیں۔ بس یہی وجہ تھی کہ جب ان دونوں نے آپ کے بارے میں سستی باتیں کیں تو مجھ سے برداشت نہ ہو سکا اور میں آپ سے استفسار کرنے چلا آیا۔'' ڈاکٹر فواد بہت دھیمے سلجھے ہوئے انداز میں گویا تھے۔ کچھ دیر پہلے کی وحشت اور کرختگی کا اب نام ونشان بھی نہ تھا۔ آریان کی پلکوں پر اس وقت بھی آنسو ٹکے ہوئے تھے۔

''آپ کی خاموشی کو میں کیا سمجھوں اقرار یا انکار؟''

''فی الحال مجھے سوچنے سمجھنے کا موقع دیں۔ یہ سب گھر کے افراد کے رویوں پر منحصر ہے ممکن ہے میں یہاں رہ جاؤں۔'' اس کے لہجے میں ہلکی سی خود اعتمادی اور فیصلے میں کچھ لچک ہوئی تھی۔ ڈاکٹر فواد مسکرا دیئے۔ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے وہ بیڈ کے قریب چلے آئے۔

''آریان! ایک بات کہوں.....؟''

''جی۔'' آریان نے ان کی طرف نگاہ اٹھائی۔

''اس قدر خوبصورت آنکھوں پر اتنا ظلم اچھا نہیں لگتا۔ یہ آنکھیں تو قدرت نے خواب بننے کو بنائی ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ رکے نہیں تیزی سے کمرے سے نکل گئے۔

آریان کا دل دھک سے رہ گیا۔ ''کیا یہ الفاظ ڈاکٹر فواد جیسے ریزرو بندے کے منہ سے نکلے تھے۔ وہ غیر یقینی سے سوچتی اپنے دل کی بے ہنگم تال پر رقصاں دھڑکنوں کو شمار کرنے لگی۔

لان میں موجود دھیمی دھیمی سرگوشیاں کرتی خواتین نے سر جھکائے اپنی طرف آتے فواد کو بڑے غور سے دیکھا تھا، ان کے چہرے پر موجود گہری شرمندگی کا تاثر بھی سب کی نظروں سے اوجھل نہ رہ سکا۔ بڑی اماں نے گہری سنجیدہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا تھا۔ وہ ان کے قریب آ کر خاموشی سے سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔ سبھی خواتین ان کے اس ناقابل فہم رویے کے متعلق جاننا چاہتی تھیں خاص طور پر انیقہ اور روبیہ کو انتہائی تجسس ہو رہا تھا کہ آخر مسئلہ کیا ہے۔

''فواد! یہ سب کیا تھا؟..... کیا ضرورت تھی یہ؟ آج سے پہلے تم نے جو کچھ کیا کبھی تمہیں روکا ٹوکا نہیں گیا۔ سبھی جانتے ہیں کہ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ تم غصے میں یوں بے قابو ہو جاتے ہو لیکن آج جو کچھ تم نے کیا ہے اس کا کیا جواز ہے؟'' بڑی اماں کے لہجے میں محسوس کی جانے والی سختی تھی۔

''بڑی اماں میں سخت شرمندہ ہوں کہ آج ضرورت سے زیادہ ایگزاسٹ ہو گیا یقیناً میرے اس رویے کی وجہ سے آپ سب کو بھی وقتی طور پر ٹینشن ہوئی ہو گی لیکن میں نے بلا جواز ایسا نہیں کیا۔ دوستوں نے آریان کے ماضی کے بارے میں کچھ باتیں ایسی کیں کہ میں برداشت نہ کر پایا، ان سے بھی میرا جھگڑا ہوا اور یہ چوٹ بھی اسی وجہ سے لگی۔'' فواد نے اپنی پیشانی کی طرف اشارہ کیا۔

''کیسی باتیں..... کیا کہا انہوں نے آریان کے متعلق؟'' بڑی اماں نے پوچھا۔

''میں وہ باتیں دہرانا نہیں چاہتا بس آپ سب کے اطمینان کے لیے اتنا کافی ہے کہ وہ سب بے بنیاد باتیں تھیں، جھوٹ پر مبنی۔ میرے رویے نے اسے سخت کبیدہ خاطر کر دیا ہے۔ اس کے سامنے مجھے بے حد شرمندگی محسوس ہوئی۔ اس لیے آپ سب سے کہہ رہا ہوں کہ اس سے کسی قسم کی باز پرس مت کیجیے گا۔ میری اس حرکت کی وجہ سے وہ آپ سب کا سامنا کرنے سے کترائے گی اگر دوستانہ ماحول ملے گا تو شائد وہ سیٹل ہو جائے۔

ڈاکٹر فواد جیسے سوچ سوچ کر ایک ایک لفظ ادا کر رہے تھے پھر انہوں نے سب خواتین پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی سبھی کی آنکھوں میں یقین روشن تھا۔ فطری سادگی کے باعث سب نے یہ تسلیم کر لیا تھا کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں ٹھیک ہے سوائے حدیقہ چچی کے۔ ان کی آنکھوں میں پھیلتے شکوک و شبہات کے سائے ڈاکٹر فواد کی عمیق نظروں کی گرفت میں آ گئے۔

میں ایک بار پھر بہت پیار سے بہت نرمی سے کہہ رہا ہوں کہ آپ کے کسی رویے سے یہ تاثر نہیں ملنا چاہئے کہ اس گھر کا کوئی ایک

فرد بھی اسے حقیر سمجھتا ہے۔ اسے پہلے کی طرح فریش ماحول ملنا چاہئے اور اگر اس کے برعکس ہوا تو یقیناً آپ سب بھی جانتے ہیں کہ جب میرے کئے کا الٹ ہوتا ہے تو اس کا ردعمل کیسا ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے آپ سمجھ چکے ہوں گے جو میں کہنا چاہتا ہوں۔" یہ باتیں یہیں پر صرف حدیقہ چچی کے لیے تھیں اور حدیقہ چچی فواد کے سامنے بس دانت پیس سکتی تھیں اور کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔ اس وقت بھی ان کے بظاہر نرم لیکن دھمکی آمیز الفاظ پر وہ دانت کچکچا کر رہ گئیں۔

اگر اپنی بہن کی خوشی عزیز نہ ہوتی تو میں دیکھتی کیسے بڑھ بڑھ کر بولتے ہو تو۔ وہ دل ہی دل میں خود سے مخاطب تھیں۔ ان کی بہن ایک طویل عرصے سے ڈاکٹر فواد کے خواب دیکھ رہی تھی اور حدیقہ چچی بھی لاکھ زاہدہ چچی کی مخالف سہی لیکن ڈاکٹر فواد کے روشن اور تابناک مستقبل کو دیکھتے ہوئے انہیں بھی انیقہ کی پسند پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ ڈاکٹر فواد اپنی بات کہہ کر اپنے پورشن کی طرف بڑھ گئے۔ روبیہ اور انیقہ شینا پھپھو کے ہمراہ اس کمرے کی طرف بڑھ گئیں جہاں آریان موجود تھی یقیناً اس وقت ان تینوں کا مطمع نظر بس یہی تھا کہ کسی طرح آریان کے ذہن پر چھایا ہوا اداسی کا کہرا دور کر سکیں کہ وہ جانتی تھیں اس جیسی حساس لڑکی کو ڈاکٹر فواد کے آج کے رویے نے توڑ ڈالا ہوگا۔

❁ ❁ ❁

کالج کی فضاء ان دنوں ان دونوں کے لیے ہی بہت خوشگوار تھی شاید ہر محبت کرنے والا جوڑا ابتدا میں اسی خود فراموشی کی کیفیت سے گزرتا ہے کہ اسے خبر تک نہیں ہوتی کہ گرد و پیش میں کیا کیا ہو رہا ہے۔ مسرت جہاں نے چوٹی میں بل ڈالتے ہوئے سامنے آئینے میں دیکھا۔ صبیح رخساروں کی چمک میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں ستارے سے جل اٹھے تھے۔ ہونٹ آپ ہی آپ مسکرانا، گنگنانا سیکھ گئے تھے۔ یہ گزرے تین ماہ گویا ان کی ساری زندگی پر محیط تھے۔ زندگی بھر خوشیاں ان کے در کی باندی رہی تھیں لیکن جو سرخوشی انہیں اس محبت نے عطا کی تھی اس کے آگے وہ تمام خوشیاں ہیچ لگتی تھیں۔ وہ بہت بدل گئی تھیں، سینے کی اٹھانوں پر دھرا دوپٹہ اکثر بے خیالی میں کندھوں پر جھولنے لگا تھا۔ موقع بے موقع کھلکھلا کر ہنسنا جیسے ان کی عادت بن گیا تھا اور سب سے عجیب بات یہ تھی کہ وقت بے وقت آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر وہ خود کو جس ذوق و شوق سے دیکھتی تھیں اگر اس محویت کو کوئی اور محسوس کر لیتا تو انہیں پہلی فرصت میں پاگل قرار دے دیتا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اتنی بڑی تبدیلی کسی کو محسوس نہیں ہوئی تھی۔ بس چند بار انہیں بنا دوپٹے کے صحن میں گھومتے، گنگناتے دیکھ کر اماں بی نے انہیں ٹوکا تھا کہ وہ یوں سر جھاڑ منہ پہاڑ پھرنے کو بہت برا سمجھتی تھیں۔ مسرت جہاں نے الوداعی نظر آئینے پر ڈالی اور کتابیں ہاتھ میں تھامے باہر آ گئیں۔

"اماں بی! دعا کیجئے گا آج بڑا مشکل ٹیسٹ ہے۔"

"ارے چندا بیٹا! ماں کی دعائیں بھلا اولاد کے سوا کس کے لیے ہوتی ہیں، اپنی تو زندگی گزر گئی اولاد کے لیے سکھ اور شانتی مانگتے، پروردگار تمہیں کامیاب کرے۔"

اماں بی تخت پر بیٹھی قرآن مجید پڑھنے میں مصروف تھیں، انہیں خدا حافظ کہہ کر مسرت جہاں شاکر حسین کے ہمراہ کالج روانہ ہو گئیں۔

اماں بی آج کل مسرت جہاں کے لیے متفکر رہنے لگی تھیں۔ لاڈلی ہونے کے سبب ان کی اٹھان بھی ماشاءاللہ قابل رشک تھی، اپنی عمر سے دو چار سال بڑی ہی لگتی تھیں گو عمر اتنی نہیں تھی پھر سمجھدار بھی بہت تھیں۔ خاندان بھر میں ان کے جیسی لڑکی کوئی نہیں تھی۔ اماں بی کو تو بھرے خاندان، بھری برادری میں ان کے جوڑ کا کوئی لڑکا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ سادات کا یہ بھی مسئلہ ہوتا ہے کہ لڑکیاں خاندان برادری سے باہر بیاہی نہیں جاتیں۔ اسی لیے اماں بی کا تفکر اپنی جگہ بجا تھا۔ یوں بھی ان کا خیال تھا کہ جب لڑکی آئینہ دیکھنے لگ جائے، پھولوں، خوشبوؤں سے پیار کرنے لگے، خود کو سجاتے سنوارتے ہوئے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں گنگنائے تو یہ علامتیں ٹھیک نہیں ہیں۔ لڑکی کو فوراً اس کے گھر کا کر دینا چاہیے۔

مسرت جہاں کو کالج کے گیٹ پر اتار کر شاکر حسین آگے بڑھ گئے۔ فرجاد روزانہ کی طرح انہیں اپنا منتظر ملا۔ اب ان کے قدم ٹھٹکتے نہیں تھے بلکہ عجیب عجلت میں اٹھتے تھے۔

آنکھوں میں شوق کا ایک جہان آباد ہو جاتا تھا۔ انہوں نے دل سے اٹھنے والے ہر سوال کو رد کر دیا تھا۔ دماغ میں بننے والی ہر سوچ پر پہرے بٹھا دیے تھے اب ان کی آنکھیں خواب دیکھتی تھیں تو فرجاد کے، کان اس کی آواز سننے کو ترستے تھے اور دل اس کے قدموں کی آہٹ سننے کو بے چین رہتا تھا۔ وہ سہج سہج قدم اٹھاتی اس کے قریب چلی آئیں۔

''آج پورے تین منٹ لیٹ ہو تم.....'' اضطراری انداز میں فرجاد نے کہا۔

''فرجاد! تھوڑی بہت دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے۔''

''نہیں ہونا چاہیے ایسا..... تم نہیں جانتیں انتظار کی اذیت دنیا کی ہر اذیت سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ امید اور ناامیدی کے درمیان چکراتا انسان کس قدر کرب سے گزرتا ہے تم نہیں جانتیں۔''

''چلیں ٹھیک ہے آئندہ خیال رکھوں گی اور اب کیا یہیں کھڑے رہنے کا ارادہ ہے۔''

''نہیں کینٹین چلتے ہیں، کچھ دیر بیٹھیں گے چائے پئیں گے پھر اپنے اپنے ڈیپارٹمنٹ سدھاریں گے۔'' فرجاد نے کہا پھر وہ دونوں ساتھ ساتھ کینٹین کی طرف چل پڑے، دونوں کے کلاس فیلوز آج کل ان دونوں کی محبت کے برنگ اشو پر ڈسکس کرتے پھر رہے تھے۔ یہ بات بہت سے لوگوں کے علم میں آ چکی تھی لیکن انہیں تو جیسے کوئی خاص پرواہ ہی نہیں تھی، کینٹین میں ٹیبل پر آمنے سامنے بیٹھے وہ راز و نیاز میں لگے ہوئے تھے۔

''فرجاد! انتہائی احتیاط کے باوجود لوگ ہمارے متعلق جاننے لگے ہیں۔''

''تو اچھا ہے بقول شاعر ''بدنام جو ہونگے تو کیا نام نہ ہوگا'' فرجاد نے ان کی بات ہنسی میں اڑا دی۔

''کیا یہ کوئی فکر والی بات نہیں.....'' مسرت جہاں نے پوچھا تو فرجاد مسکراتے ہوئے ان کی طرف دیکھنے لگا۔

''نہیں یہ فکر والی بات ہرگز نہیں..... خوش آئند بات ہے۔ دیکھو وہ جو شاعر نے کہا ہے ناں کہ

مجھ سے پہلے اس گلی تک میرے افسانے گئے

''تو ٹھیک ہے ہماری شہرت اور اس محبت کے چرچے جب تمہارے گھر تک پہنچیں گے تو ہمارا ملنا مشکل نہیں رہے گا وہ خود ہی تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیں گے۔''

''اس کے برعکس بھی ہو سکتا ہے، وہ بدنامی کے باعث ہمیں قابل نفرین سمجھ کر گولیوں سے اڑا بھی سکتے ہیں۔'' مسرت جہاں خوفزدہ لہجے میں بولیں حقیقتاً انہیں اب احساس ہو رہا تھا کہ آگے چل کر کتنی مشکلات ان کے لیے کھڑی ہونے والی تھیں۔

''مسرت! یہ دن، رفاقتوں کے یہ خوبصورت لمحے یوں خوف کی نذر مت کرو۔ دیکھو پہلی بار زندگی میں پہلی بار مجھے یہ احساس ہوا ہے کہ زندگی میں میرے لیے بھی کوئی خوبصورتی' کوئی ایٹریکشن ہے۔ میرا فلیٹ تمہاری یادوں، تمہاری خوشبوؤں سے آباد ہو گیا ہے۔ مجھے اب تنہائی بری نہیں لگتی، اکیلے پن سے وحشت نہیں ہوتی مجھے۔ نیند میری آنکھوں سے دور نہیں بھاگتی۔ پلیز میرے ان محسوسات کو امر ہونے دو۔ میری زیست کے سونے رشتوں میں میری ہم سفر بن جاؤ۔'' فرجاد کا ایک ایک لفظ محبت کے لمس میں گندھا ہوا تھا..... اور مسرت جہاں کو لگا جیسے وہ ہواؤں میں اڑنے لگی ہوں۔ وہ سمندر سے جھوم کر اٹھنے والی گھٹا بن کر برسا تھا اور مسرت جہاں اس کے لہجے سے بھیگ بھیگ گئی تھیں۔

''تم مسرت! تمہیں میں نے خود سے بھی بڑھ کر چاہا ہے مجھے تم پر اپنی ذات سے بھی بڑھ کر یقین ہے اتنا کہ مجھے گمان ہونے لگا ہے اگر کبھی ساری دنیا بھی مل کر مجھے رد کرنے کی کوشش کرے تو تب بھی تم میری پشت پر ہو گی۔ میرے ہونے کی جنگ مجھ سے بھی زیادہ دل سے لڑو گی، تم مجھ سے بھی زیادہ مجھے چاہو گی، بولو؟ چاہو گی ناں!''

اس کا لہجہ شوخ ہو گیا تھا اور وہ شرمگیں احساس تلے مسکرائے جا رہی تھیں۔ یہ اونچا لمبا خوبرو شخص تین چار ماہ میں انہیں کتنا عزیز ہو گیا تھا حالانکہ کبھی کسی کے ساتھ بہت سارا جیون گزار کر بھی ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہم اسے جانتے ہیں لیکن شائد مسرت جہاں اسے اتنا جاننے لگی تھیں جتنا اپنے آپ کو بھی نہیں۔ بہار کی اولین صبح کی طرح وہ ان کے دل میں اترا تھا، ان کا آنگن دل اس کی محبت کی سرمئی دھوپ سے بھر گیا تھا، سائبان جیسا وجود ان پر تن گیا تھا اور محبت جب لفظوں میں سمجھ آنے کا روپ اختیار کرتی تو وہ روپ میں پورا کا پورا آن بہتا۔ محبت کیا ہے؟ صرف وہ!!!

''محبت کو دیکھو تو کیسی لگتی ہے بالکل اس کے چہرے، اس کی آنکھوں جیسی۔ محبت اگر مسکراہٹ ہے تو وہ مسکان صرف اس کے ہونٹوں پر سجتی ہے کہیں محبت روپ رکھتی ہے تو صرف اس کا بھیس ہے، صرف وہ ہے۔'' مسرت جہاں کے لیے وجہ سرخوشی، محبت، اعتماد اور یقین کا سمبل تھا وہ زندگی انہیں بہت خوبصورت لگنے لگی تھی۔

''مسرت..... تم..... تم بھی تو کچھ کہو کوئی ایسا لفظ یا چند ایسے حروف جو محبت کا سکون بن کر میرے اندر اتر جائیں۔'' فرجاد کے لہجے میں تشنگی اتر آئی۔ مسرت جہاں نے ایک نظر اس کے چہرے اور منتظر آنکھوں کو دیکھا پھر سر جھکا کر بولیں۔

''مجھ کو اتنا کہنا ہے

پھول، بارش، خوشبو، چندا

مجھ کو اچھے لگتے تھے

اب تم اچھے لگتے ہو!!"

"شکریہ مسرت! تمہارے یہ لفظ کسی قیمتی متاع کی طرح میرے دل کے نہاں خانوں میں رہیں گے۔ جانتی ہو میں تمہاری آنکھوں کو کیا کہتا ہوں؟"

"کیا.....؟"

"سمندر..... گہرا چپ سمندر اور میں تمہارے اندر سے ایک جذبے ایک پرشور جذبے کی طرح اٹھ کر اس سمندر کی خاموش لہروں میں متلاطم ہو کر بکھر جانا چاہتا ہوں، میں تمہارے دل میں ایک ردھم کی طرح رہنا چاہتا ہوں۔ تمہاری محبت کے خوش گمان احساس کو سانسوں میں بھر لینا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں دنیا میں جب میرا وجود نہ بھی ہو تب بھی لوگوں کو تم میں..... میں دکھائی دوں۔"

"فرجاد! ایسی بات تو مت کریں..... یہ سفر، یہ مسافت آپ کے سنگ کٹ پائے گی وگرنہ میرے حوصلے میری ہمت اتنی مضبوط نہیں ہے۔"

"مسرت! محبت کا وجود اپنی جگہ مسلم سہی لیکن دنیا کی روایات ہمیں یوں ایک ساتھ کبھی نہیں دیکھ پائیں گی۔ اس نازک سی ڈور کو ہمیں کسی مضبوط رشتے کی گرہ سے باندھنا ہوگا۔ مسرت! میں تمہارے بڑوں سے تمہارا ہاتھ مانگنا چاہتا ہوں۔"

"لیکن فرجاد! میرے گھر کا کوئی فرد بھی اس رشتے پر راضی نہیں ہوگا۔"

"کیوں..... کیوں راضی نہیں ہونگے؟ کیا ہمارے جذبے اتنے بے وقعت ہیں..... کیا ہماری رائے کی کوئی اہمیت نہیں؟"

"فرجاد! میرا تعلق نجیب الطرفین سادات گھرانے سے ہے۔ ہمارے ہاں صرف سیدوں میں ہی رشتہ دیا جاتا ہے پھر آپ اکیلے ہیں۔"

"ان سب باتوں میں سے میرے اختیار میں کونسی بات ہے کیا بتا سکتی ہو؟" فرجاد قدرے تلخ لہجے میں بولا۔ "جو کچھ میرے ہاتھ میں ہے اس میں کسی قسم کی خرابی ہو تو مجھے رد کیے جانے کا افسوس نہ ہوگا لیکن جس چیز پر میرا اختیار ہی نہیں اس کی وجہ سے مجھے ریجیکٹ کرنے کا اختیار انہیں نہیں ہوگا۔" اس کے حتمی لہجے میں کہے گئے ایک ایک لفظ نے مسرت جہاں کے سامنے اندیشوں کا پنڈورا بکس کھول دیا تھا۔

ان کی آنکھوں کے سامنے اماں بی، ابا میاں، بھائیوں، بھابھیوں کے چہرے گھوم رہے تھے، شکوہ، اعتماد اور بھروسے کا خون کرنے کا گلہ..... وہ لرز اٹھیں۔

یہ کونسی طلب جاگ اٹھی تھی ان کے دل میں..... کس راہ پر چل پڑی تھیں وہ، عجب دوراہے پر آن پہنچی تھیں نہ آگے جانے کا راستہ مل رہا تھا اور نہ پیچھے پلٹنے کا۔ شوریدہ قدموں نے اتنا غبار اڑا دیا تھا کہ واپسی کا راستہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا آگے جانے کے لیے پھر بھی فرجاد کا سہارا تو تھا اور انہوں نے اس کا کندھا تھام لیا۔

''لیکن فرجاد! یہ روایت ایسی ہے جو آج تک نہیں ٹوٹی، سید گھرانوں میں غیر سید لڑکیاں بیاہ کر آسکتی ہیں لیکن سید لڑکیاں بیاہ کر باہر نہیں جاسکتیں۔''

''کیوں.....؟ کیوں نہیں جاسکتیں۔ یہ سب ہم لوگوں کے اپنے بنائے ہوئے اصول ہیں، پروردگار نے تمام انسانوں کو برابری کی بنیاد پر تخلیق کیا ہے کسی کو کسی پر فوقیت نہیں دی گئی سوائے متقی کے۔ پھر وہ کون ہوتے ہیں جو بظاہر کسی وجہ کے بغیر مجھے ٹھکرا دیں۔''

''فرجاد! ان سب باتوں کے باوجود وہ نہیں مانیں گے میں انہیں جانتی ہوں۔ خاص طور پر ابا میاں کے غصے کا سوچ کر تو ابھی سے میری جان جا رہی ہے۔''

''مسرت! اس طرح میرے حوصلے پست کرنے کی کوشش مت کرو، تم سب کچھ جانتی تھی ناں۔ میرے بارے میں بھی اور اپنے گھرانے کے اقدار کے بارے میں بھی۔''

''ہاں.....جانتی تھی۔''

''میرے جذبوں کو پذیرائی بخشتے وقت تمہارے دماغ نے یہ باریکیاں نہیں سوچیں۔ اس وقت ایک لمحے کو بھی تمہیں خیال نہیں آیا کہ انجام کار کیا ہونا ہے۔''

''میں ہار گئی تھی آپ کے جذبوں کے سامنے۔ دل و دماغ کی ہر سوچ، ہر خیال پر پابندی لگا دی تھی میں نے جو میرے قدم روکنے کو بڑھا۔''

''پھر.....پھر مجھے یہ بتاؤ کہ کیا تم نے میرے جذبوں کی پذیرائی کر کے ٹھیک نہیں کیا؟''

''یہ میں نے کب کہا؟''

''کیا میرے کردار، میری شخصیت میں کسی قسم کی کمی یا جھول دکھائی دیا تمہیں اتنے دنوں میں۔''

''یہ آپ کیسی باتیں کرنے لگے ہیں۔''

''مسرت، میں جو پوچھ رہا ہوں، پلیز اس کا جواب دو۔''

''نہیں.....میں نے کوئی برائی نہیں دیکھی۔'' مسرت جہاں نے جواب دیا۔

مجھے یہ بتاؤ کہ کیا صرف سادات ہی بلند کردار اور اعلیٰ اخلاق کی وارث ہے۔ کیا اچھائی صرف سیدوں تک محدود ہے اگر ایسا ہے تو دنیا میں رہنے والے باقی سب لوگ تو گھٹیا اور حقیر ہوئے۔'' فرجاد کے لہجے میں تلخی آ گئی۔

''فرجاد! آپ کی خوبیاں، آپ کی شخصیت کی اچھائیاں کیا ہیں یہ تو میں جانتی ہوں ناں، انہیں تو اس بات کا علم نہیں اور میں نے دل میں آپ کو کیا مقام دیا ہے اسے لفظوں میں واضح کرنا ممکن نہیں۔''

''تو پھر مسرت! ایک بار مجھے اپنا ہاتھ مانگنے دو، میں تمہارے امی ابا سے خود بات کروں گا، یہ سیدھا راستہ ہے اور اسے اختیار

کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔"

"فرجاد! میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ ان کا جواب انکار میں ہوگا۔ آپ کی کوئی دلیل انہیں قائل نہیں کر سکے گی۔ میرے ابا میاں انتہائی بنیاد پرست انسان ہیں۔ ایک تن تنہا شخص جس کے پاس کوئی رشتہ نہیں یوں ان کے سامنے جا کر ان کی بیٹی کا ہاتھ مانگے وہ اس بات کو اپنی توہین سمجھیں گے۔" مسرت جہاں نے کہا تو فرجاد ایک لمحے کو خاموش ہو گیا۔

"ہوں....." فرجاد نے ہنکارا بھرا۔ "پھر کیا ہوگا؟"

"کیا مطلب؟" اس کے بے موقع سوال پر مسرت جہاں اچنبھے سے بولیں۔

"مطلب یہ کہ ہر طرح سے ان کا جواب انکار میں ہوگا؟"

"ہاں....."

"تو پھر..... پھر کیا ہوگا؟" اس کے سوال کے پیچھے چھپے ہوئے معنی مسرت جہاں کو ایک لمحے کے لیے لاجواب کر گئے۔

"پھر..... پھر یہ ہوگا کہ میری پڑھائی چھڑا دی جائے گی، میرے گھر سے نکلنے پر پابندی لگا دی جائے گی....."

"پھر....."

"پھر جلد سے جلد میری شادی کرنے کی کوشش شروع ہو جائے گی۔"

"ہوں..... اور آپ کسی دوسرے کی ڈولی میں بیٹھ کر رخصت ہو جائیں گی، ستر فیصد فلمی ہیروئنوں کی طرح مجبور ہو کر۔"

"آپ طنز کر رہے ہیں.....؟" مسرت جہاں اس کے لہجہ کی کرختگی سے گھائل ہو کر بولیں۔

"نہیں..... میں حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ تقدیر شروع سے میرے ساتھ یہی کھیل کھیلتی آئی ہے۔ جس چیز کی طلب میں نے کی وہ مجھ سے چھن گئی، رشتوں کا خلوص اور مان تو مجھے شروع سے حاصل ہی نہیں رہا۔ اب..... اب تمہاری طرف قدم بڑھائے تو یہ سوچ کر کہ شائد یہاں میری خرماں نصیبی کا اختتام ہو جائے، چند خوشیاں اور سکون بھرے سانس مجھے بھی نصیب ہو جائیں لیکن یہاں تم مجبور ہو گئیں۔ تمہاری بے بسی تمہارے بڑوں کو ان کے فیصلے سے باز نہیں رکھ سکے گی اور یہ چاند کسی دوسرے آنگن میں روشنی بکھیرے گا۔ میرے آنگن میں کیا رہا، وہی اندھیرے جو ازل سے میرا نصیب ہیں۔" فرجاد کا لہجہ بکھرا ہوا تھا۔

"نہیں..... ایسا نہیں ہوگا..... میں، میں کسی اور کے نام کی مہندی ان ہاتھوں پر نہیں لگا سکتی۔"

"پھر..... پھر کیا کرو گی تم..... کیا بغاوت کرو گی۔"

"نہیں..... میں زہر کھا لوں گی۔"

"واہ..... خوب رہی۔ زہر کھا لو گی۔ دلہن مسماۃ مسرت جہاں کے دروازے پر باراتی کھڑے ہیں اور دلہن صاحبہ نے زہر کھا لیا۔ پھر جانتی ہو کتنی جگ ہنسائی ہوگی تمہاری تمہارے خاندان والوں کی..... تمہارا عزت دار گھرانہ لوگوں کی اٹھتی انگلیوں کا نشانہ بن جائے گا۔"

''تو پھر.....اس سے کیا فرق پڑے گا، میں تو نہیں ہوں گی ناں یہ سب کچھ دیکھنے اور سہنے کو جب ان سب کو میری خوشی کی پرواہ نہیں تو پھر مجھے ان کا خیال کرنے کی کیا ضرورت ہے۔'' مسرت جہاں کے لہجے میں فیصلہ کن سختی محسوس کر کے فرجاد کے لبوں پر ایک دلفریب مسکراہٹ پھیل گئی۔

''یہی تو میں سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اول تو سیدھا راستہ اختیار کریں گے، ہر ممکن کوشش کروں گا کہ وہ مان جائیں لیکن اگر پھر بھی ان کا جواب نفی میں ہوا تو پھر سب کچھ ٹھکرا کر دنیا کے کسی ایسے گوشے میں چلے جائیں گے جہاں ہماری محبت کو گناہ نہ سمجھا جائے۔ جہاں ہماری خوشیاں صرف ہماری ذاتی ہوں گی۔ ایک دوسرے کی مکمل رفاقت کا احساس ہم دونوں کو ایک الوہی سکھ سے ہمکنار کر دے گا۔'' فرجاد کی آنکھیں کل کے روشن خوابوں کی چمک سے خمار آلود ہو گئیں۔ مسرت جہاں خاموش بیٹھی اس کی کہی ان کہی سن رہی تھیں۔ فرجاد جس سرزمین کا ذکر کر رہا تھا وہ تو خوابوں کی خیالوں کی سرزمین تھی، اس کی خوبصورت اس کے حسن سے مسرت جہاں کی آنکھیں چکا چوند ہونے لگیں۔

''آؤ مسرت چلیں.....کافی دیر ہو گئی ہے۔ ہاں ایک بات یاد رکھنا یہاں سے اپنے ساتھ اس یقین کو ہمراہ لے کر چلنا کہ جذبے صادق ہوں تو منزل ضرور مل جایا کرتی ہے۔'' وہ دونوں کینٹین سے نکل کر اپنے اپنے ڈیپارٹمنٹ کی طرف بڑھ گئے تھے۔ وقتی طور پر الگ الگ راہ پر گامزن تھے لیکن دونوں کے دل اس یقین کے ساتھ دھڑک رہے تھے کہ بہت جلد وہ کبھی نہ جدا ہونے والے بندھن میں بندھ جائیں گے۔

❁ ❁ ❁

ویک اینڈ والے دن اس گھر کے افراد کی پھرتیاں دیکھنے والی ہوتی تھیں۔ دوسرے لوگوں کی طرح یہ سب دن چڑھے بستروں پر اینٹھنے کی بجائے صبح سویرے ہی اٹھ جاتے تھے، سب سے اچھی عادت ان میں یہ تھی کہ نوجوان نسل ساری کی ساری بڑی اماں کے انڈر ہونے کی وجہ سے نمازی تھی۔ ہاں تو ذکر ہو رہا تھا ویک اینڈ کا تو ویک اینڈ پر گھر کے سبھی افراد کہیں نہ کہیں سدھار جاتے تھے۔ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا تھا کہ کسی ویک اینڈ پر فوراً بھی گھر پر دکھائی دے جائیں اور جب ایسا ہو جاتا تھا تو پھر پروگرام بھی بدل جاتا یعنی پھر سب گھر کے افراد نہیں بلکہ صرف ینگ پارٹی کہیں نہ کہیں سیر کو نکل جاتی۔ آج فواد گھر پر ہی تھے لیکن دو تین دن پہلے آریان اور گھر والوں کے ساتھ ان کی جس قسم کی ڈسکشن ہوئی تھی اس کی وجہ سے بہت ریزرو سے ہو گئے تھے۔ روبیہ اور انیقہ نے آریان کو بنا کریدے اس کے ساتھ وہی دوستانہ رویہ رکھا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ آریان ایک آدھ دن شرمندگی کے احساس کے باعث سب سے کترائی کترائی سی رہی لیکن جب کسی نے کچھ ظاہر ہی نہ کیا تو پھر وہ بھی دھیرے دھیرے سیٹ ہو گئی۔ صبح صبح نماز پڑھنے کے بعد فواد کے کمرے میں ہنگامی میٹنگ بلائی گئی۔ ہرکارہ خصوصی سیونتھ کلاس کے سٹوڈنٹ اظہر چچا کے برخوردار طاہر تھے جنہوں نے انیقہ صاحبہ کے حکم کے بموجب سب کے دروازے کھٹکھٹا کر انہیں مطلع کیا اور ٹھیک آٹھ بجے میٹنگ کے تمام اراکین فواد کے بیڈروم میں موجود تھے۔ فواد تو اس ہنگامہ خیز جلوس کو دیکھ کر بے چارے حیران و ششدر رہ گئے۔ کوئی رائٹنگ ٹیبل پر چڑھا بیٹھا ہے تو کوئی فلور کشن پر۔ یاسر صاحب جنہیں سب سے چھوٹے ہونے کا اعزاز

حاصل تھا کچھ زیادہ فرینک نیس کا مظاہرہ کرتے ہوئے دروازے کے پردے کے ساتھ جھول رہے تھے۔فواد نے بیڈ پر بڑھتے ہجوم کو دیکھتے ہوئے گھبرا کر اپنی ٹانگیں سمیٹ لیں۔

''یار یہ سب کیا ہے؟ میں رات کو بہت دیر سے سویا تھا اور ابھی میرا موڈ نہیں تھا اٹھنے کا۔'' وہ جیسے جھنجھلائے۔

''دیکھئے جناب! نیند سے زیادہ ضروری بات ہے جو ہم ڈسکس کرنے آئے ہیں۔'' شاذان تکیہ گود میں رکھتے ہوئے بڑے اسٹائل سے بولا۔

''کیوں؟.....کیا کشمیر کی آزادی کے لیے کوئی مجرب نسخہ ہاتھ لگ گیا ہے۔'' فواد نے ان سب کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔

''بھائی شکر پڑیاں چلیں.....'' انا کو شکر پڑیاں بہت پسند تھی۔

''کیوں کیا شوگر کروانی ہے۔'' طاہر نے مضحکہ اڑایا۔

''سب فیصلہ کرلیں کہ کہاں جانا ہے۔''

''چھتر پارک چلیں۔'' انیقہ نے اپنی سجیشن دی۔

''بھئی ہزار بار کی دیکھی ہوئی جگہوں کو پھر دیکھنے کو دل نہیں چاہتا۔ایک تو ہم لوگ بھی بس لکیر کے فقیر ہی ہیں۔'' مہوش بیزاری سے بولی۔وہ فطرتاً کچھ نک چڑھی اور مغرور سی تھی۔

''اگر میں ایک جگہ ڈیسائیڈ کروں تو میرا خیال ہے وہ آپ سب کو ہی پسند آئے گی۔'' فواد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کونسی.....؟'' سبھی بیک وقت بولے۔

''مارگلہ ہلز۔''

''واہ.....یہ ہوئی ناں بات.....'' شاذان چٹکی بجاتے ہوئے بولا۔

''اصل میں پکنک سپاٹس پر بے انتہا رش ہوتا ہے جس سے اکتاہٹ ہونے لگتی ہے۔اس لیے میرا خیال ہے سیر و تفریح کا مزہ وہیں آتا ہے جہاں سکون ہو، خاموشی ہو۔'' فواد نے مارگلہ ہلز کو پسند کرنے کی وجہ بھی بتادی۔

''بس ٹھیک ہے.....ایگزیکٹ نو بجے ہم یہاں سے نکل چلیں گے۔اس وقت آٹھ بج کر بیس منٹ ہیں، صنف نازک آپ کے پاس چالیس منٹ ہیں اس دوران تیار ہو جائیں لیکن ایک اہم بات بتانا میں بھول گیا۔''

''کیا بات.....؟'' وہ سب جو بیرونی دروازے سے نکلنے لگے تھے رک کر ان کی طرف دیکھنے لگے۔

''کہ میں آپ کے ساتھ نہیں جا رہا؟''

''اوہ.....'' سب کے چہرے لٹک گئے۔

''لیکن کیوں؟'' اطہر نے احتجاجاً کہا۔

''اس لیے بیٹا جی! کہ کلینک پر دو انتہائی اہم کیسز ہیں جو میں نے ڈیل کرنے ہیں۔''

''تو بھائی کا شف کیا کلینک نہیں آ رہے؟'' حسنین نے فواد کے کولیگ اور بہت اچھے دوست کا نام لیا جو اکثر ان کی غیر موجودگی میں کلینک کے سارے معاملات کو ہینڈل کرتا تھا۔

''آتا ہے لیکن ان کیسز پر میں کام کر رہا ہوں۔''

''بھائی یہ فاؤل ہے! ہم نے آپ کی ڈیسائیڈ کی ہوئی جگہ ایکسیپٹ کر لی پھر..... پھر آپ کیوں نہیں جا رہے۔ اتنے دنوں بعد آریان آپی بھی ہمارے ساتھ جا رہی تھیں اور آپ نے سارا پروگرام ہی چوپٹ کر کے رکھ دیا۔'' انیقہ منہ پھلائے کہہ رہی تھی۔

فواد نے ایک پل کو خاموش کھڑی آریان پر ایک نگاہ ڈالی اس کی نظریں انہی کو دیکھ رہی تھیں۔ پتہ نہیں انہیں کیوں ایسا لگا جیسے آریان کو ان کے نہ جانے کا سن کر افسوس ہوا تھا۔

''چلو زیادہ منہ مت بسورو کہیں یہ سب ڈر ہی نہ جائیں۔ اتنا اصرار کرتی ہو تو چلے چلتے ہیں۔'' فواد بدستور آریان کی طرف دیکھتے ہوئے انیقہ سے مخاطب ہوئے۔ آریان کے لبوں پر غیر محسوس سا تبسم مچلا تھا جو فواد کے سوا ہر کسی کی نگاہ سے پوشیدہ رہا۔ سبھی ایک بار پھر چہکنے لگے اور جلدی جلدی اپنے اپنے کمروں کی طرف بھاگے۔ مبادا فواد پھر اپنا پروگرام بدل لیں۔ صابرہ کو چالیس منٹ کے شارٹ نوٹس پر لنچ کا مینو بتا کر روبیہ اور انیقہ آریان کے ہمراہ اپنے پورشن میں آ گئیں اور پھر جب وہ سب تیار ہو کر گاڑیوں میں بیٹھ کر سفر پر نکلے تو موسم بھی کچھ شرارتی سا ہونے لگا۔ بادلوں کے ننھے ننھے ٹکڑوں کی اٹھکیلیاں دیکھتے وہ مارگلہ ہلز پہنچ چکے تھے۔

''او بی بی..... یہ بھی کوئی جگہ ہے بھلا پہاڑ ہی پہاڑ، نہ رونق نہ مزہ۔'' صابرہ ان کے ساتھ ہی آئی تھی تاکہ کھانا وانا گرم کرنے، چائے بنانے میں انہیں پریشانی نہ ہو۔

''ارے بدذوق! غور سے دیکھو قدرت کی صناعی، فطرت کے شاہکار، ایسا قدرتی حسن کبھی پہلے دیکھا ہے۔'' انیقہ صابرہ سے مخاطب تھی۔

''رہنے دو بی بی! ہم تو جانیں زندگی رونقوں میں ہے ایسے ویرانوں میں نہیں۔''

''کنوئیں کے مینڈک کو کنواں ہی اچھا لگے گا۔'' انیقہ برا سا منہ بنا کر بولی۔ روبیہ اور مہوش نے اپنے ساتھ لائی ہوئی دری سبزے کے فرش پر بچھائی۔ انہوں نے اپنے لیے نسبتاً خاموش سا گوشہ چنا تھا ارد گرد کسی قسم کی چہل پہل نہیں تھی۔ آریان، مہوش، فواد اور روبیہ دری پر براجمان ہو گئے، شاذان اور انیقہ بچہ پارٹی کو لیکر پارک کی سمت چلے گئے۔

''کتنی عجیب بات ہے آریان کو ہمارے ہاں رہتے ہوئے تقریباً ایک ماہ ہو گیا ہے لیکن میرا اس سے ابھی تک تفصیلی تعارف نہیں ہوا۔'' مہوش نے کہا۔ درحقیقت آریان کو مہوش کچھ نک چڑھی سی لگی تھی اس لیے اس نے خود کو اس کے معاملے میں ریزرو کر لیا تھا جبکہ روبیہ اور انیقہ اس کے ساتھ بہت فرینک تھیں۔

''اصل میں تم اپنی دنیا میں اتنا مگن رہتی ہو کہ گردوپیش کی تمہیں ذرا کم ہی خبر ہوتی ہے۔'' فواد نے اسے احساس دلایا کہ وہ اپنے اردگرد کو خاطر میں ہی کب لاتی ہے کہ اسے کچھ علم ہو کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے۔

''اب ایسا بھی نہیں، میں ملی تو تھی آریان سے لیکن زیادہ گپ شپ نہیں لگائی۔ ویسے فواد بھائی آپ مجھ پر زیادہ طنز مت کیا کریں، میں اتنی بری بھی نہیں۔'' مہوش بھنویں چڑھا کر بولی۔

''ارے میری بہنا میں طنز کب کر رہا ہوں۔ چلو اس ٹاپک کو چھوڑو، کوئی اچھی سی بات کرو۔''

فواد کو لگ رہا تھا کہ مہوش حسب عادت ماحول کو کشیدہ کرنے کی کوشش کر رہی ہے سو موضوع بدل دیا۔ ابھی انہیں تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ انیقہ وغیرہ واپس آ گئے۔

''میں اچھی طرح جانتی تھی کہ بور لوگ خاموش بیٹھے ایک دوسرے کے منہ دیکھ رہے ہوں گے۔ ویسے شاذان یہ جو ہمارے بڑے ہیں انہوں نے کیا سنجیدگی کے سارے ریکارڈ توڑنے کی قسم کھا رکھی ہے۔''

''ہاں لگتا تو کچھ ایسا ہی ہے، دیکھو ناں ایک طرف تم ڈاکٹر کو بٹھا کر چلی گئیں اور دوسری طرف دو عدد ٹیچرز جبکہ تیسری طرف ایل ایل بی کی اسٹوڈنٹ براجمان ہیں، اب خود سوچو جن پر پوری قوم، پورے ملک کی سلامتی و ترقی کا دارومدار ہو وہ کیا میری تمہاری طرح ہنستے پھریں گے۔ نہیں بھئی حکومت پاکستان نے ان جیسے سنجیدہ لوگوں کے لیے ایک قومی چھٹی کا اعلان کیا ہے جس دن ان سب لوگوں کو دیوار قہقہہ کے سائے میں لے جایا جائے گا۔ پورے سال کی ہنسی کسی ڈیوٹی کی طرح یہ اسی دن ہنس لیا کریں گے تاکہ باقی کا پورا سال انہیں ہنسنے کی زحمت گوارا نہ کرنی پڑے۔'' شاذان نان اسٹاپ بولے جا رہا تھا۔ روبیہ اور مہوش کے ساتھ ساتھ فواد اور آریان بھی ہنس دیئے تھے۔ آریان نے بہت دلچسپی سے اس چلبلے سے لڑکے کو دیکھا تھا جو عمر میں انیقہ سے کچھ بڑا ہوگا اور عادت میں اسی کی طرح کا ہنس مکھ اور بذلہ سنج۔

''تمہاری اس اتنی لمبی بکواس کا مطلب کیا ہے؟'' فواد بولے۔

''بھائی لوگو! میں تو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یار چھٹی ہے اسے انجوائے کرو، ہنسو بولو.....''

''تو بول تو رہے تھے.....''

''جی جہاں بالکل.....اقوام متحدہ کی سلامتی کے اراکین کی طرح سنگین سی سنجیدگی چہروں پر طاری کیے آپ چھٹی میں تو انجوائے کر رہے ہیں۔''

''تو پھر کیا کرنا چاہئے.....؟'' فواد اس کی بکواس سے تنگ آ کر بولے۔

''تو پھر یہ کہ کوئی کھیل کھیلا جائے۔ بچے تو پارک میں مصروف ہیں اور میں اظہر میاں کو ان کا باس بنا کر ان کی نگرانی پر چھوڑ آیا ہوں۔ پیچھے رہ گئے ہم تو ہم بھی تو بچے ہی ہیں اس لیے کھیل ہمارا حق ہے۔''

''ہوں.....تو تمہارا کیا خیال ہے آنکھ مچولی کھیلی جائے یا.....''

''اونہوں..... میں گھر سے ایک کھیل کی تیاری کر کے آیا ہوں اگر اجازت ہو تو مابدولت اسے شو کرے۔''

''جلدی کرو..... خواہ مخواہ اتنی دیر سے بوریت پھیلا رکھی ہے۔'' انیقہ نے بے صبری سے کہا۔

فواد، مہوش، آریان اور روبیہ بھی اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

''جی ہاں! تو کھیل ہے قرعہ اندازی، ان پرچیوں پر چند باتیں لکھی ہیں جس کے پاس جو پرچی آئے گی اسے وہ کر کے دکھانا ہوگا۔'' شاذان نے جیکٹ کی جیب سے کاغذ کی تہہ شدہ پرچیاں نکال کر سامنے دری پر ڈھیر کر دیں۔

''بھئی میں تو پہلے ہی اس کھیل سے دستبردار ہوتی ہوں، ہم کیا جانیں ان میں کیا لکھ رکھا ہے۔'' مہوش نے کہا تو شاذان نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔

آپ جیسی سڑیل بہن سے اور توقع بھی کیا کی جا سکتی ہے۔ ان میں کوئی ایسا ناممکن کام بھی نہیں لکھا جو آپ کر نہ سکیں۔'' بہر حال ہم چار افراد ہیں سب سے پہلے بسم اللہ کون کرے گا۔'' شاذان نے کہا۔

''میرا خیال ہے انیقہ سب سے پہلے پرچی اٹھائے گی۔'' روبیہ نے انیقہ کو آگے کر دیا۔

''کیوں مجھے کیا قربانی کا بکرا سمجھ رکھا ہے۔'' انیقہ بدک کر پیچھے ہٹی۔

''ارے تم۔ اس قدر گھبرا کیوں رہی ہو، کھیل ہی تو ہے کوئی محاذ جنگ تو نہیں۔'' شاذان نے کہا۔ ''چلو شاباش ہمت کرو۔''

''ہمت کرو سے کیا مراد ہے تمہاری..... میں سمجھ گئی یقیناً اس میں کچھ ایسا ہے جو ٹھیک نہیں۔''

''یار کیا ہو گیا ہے، انیقہ کم سے کم تم جیسی بہادر لڑکی سے مجھے اتنی بزدلی کی توقع نہیں تھی۔''

''نہیں خیر اب بزدل کہہ کر مابدولت کے جلال کو آواز مت دو۔ ہم اٹھائے لیتے ہیں۔'' انیقہ نے ہاتھ بڑھا کر ایک پرچی اٹھائی اور بغیر کھولے شاذان کی طرف بڑھا دی۔ حاضرین مجلس مکمل طور پر ان دونوں کی طرف متوجہ تھے۔ شاذان نے پرچی کھولی، پڑھی، ایک معنی خیز مسکراہٹ اس کی مونچھوں تلے مچلی۔ مسکراتی نگاہوں سے اس نے انیقہ کی طرف دیکھا۔

''جی ہاں! پہلی پرچی جو مس انیقہ نے اٹھائی ہے اس پر لکھا ہے کوئی سے تین جانوروں کی آواز نکالیں۔''

''یعنی.....؟'' روبیہ نے ایک بار پھر یقین دہانی چاہی۔

''جی ہاں بالکل آپ حاضرین میں سے کوئی بھی ان جانوروں کے نام سلیکٹ کر کے انیقہ کے سامنے اپنی فرمائش رکھ سکتا ہے۔ میرا خیال ہے اس معاملے میں روبیہ کی خدمات حاصل کی جا سکتی ہیں۔'' شاذان کی باتیں سن کر انیقہ دانت کچکچا رہی تھی لیکن بولی کچھ نہیں۔

''ہاں تو روبیہ بتاؤ ان جانوروں کے نام۔'' روبیہ نے ایک نظر انیقہ کے چہرے کی طرف دیکھا جہاں کچھ ہونق پن اور بے بسی نے عجیب سے نقش و نگار بنا رکھے تھے۔

''انیقہ سب سے پہلے بلی کی آواز نکالو۔'' روبیہ کے کہنے پر انیقہ نے بلی کی آواز نکالی۔

''پرفیکٹ..... بالکل ایسے نہیں لگ رہا، بھائی جیسے کوئی جنگلی بلی، چھچھڑے دیکھ کر خوشی سے میاؤں میاؤں کر رہی ہو؟'' شاذان شرارتی لہجے میں بولا۔

فواد ہنس دیے۔

''اب دوسری فرمائش۔'' شاذان نے سلسلہ آگے بڑھایا۔

''اب بکری کی آواز نکالو۔''

''بھئی یہ فاؤل ہے کوئی مشکل آواز بتاؤ۔ بلی اور بکری کی آواز تو بچے بھی نکال سکتے ہیں، اپنی بہن ہے اس لیے ایسی رعایت برتی جا رہی ہے۔'' شاذان احتجاج کرنے لگا۔

''اچھا اگلی بار سہی، اس وقت تو میں نے کہہ دیا ہے اور کھیل کی رو سے اب انیقہ کو ماننا ہوگا۔'' بکری کی آواز نکالنے کے بعد انیقہ کو پیاس لگنے لگ گئی۔

''تم اب فرار حاصل کرنا چاہتی ہو۔ آنجناب تیسری فرمائش پوری کرنے سے پہلے کسی طور اپنی جگہ نہیں چھوڑ سکتیں۔''

''جلدی کہو.....؟'' انیقہ نے کہا۔

''چونکہ مس انیقہ بدتمیزی کی مرتکب ہوئی ہیں اس لیے سزا کے طور پر تیسری آواز گدھے کی نکالیں گی۔''

روبیہ انیقہ کے کوفت بھرے تاثرات دیکھ کر مسکراتے ہوئی بولی۔

''یہ کیا بات ہوئی، یہ کوئی کھیل ہے۔ میں نہیں، کھیلتی ایسا فضول سا کھیل۔'' انیقہ ناراضگی سے بولی۔

''نہیں بھئی! اب گیم میں شامل ہونے کے بعد کوئی قدم پیچھے نہیں ہٹائے گا۔'' فواد کے کہنے پر انیقہ نے غصے سے ان کی طرف دیکھا۔

''تو ٹھیک ہے آپ نکالتے پھریں یہ عجیب و غریب آوازیں، میں تو نہیں نکالوں گی گدھے کی آواز۔''

''ارے انیقہ مذاق ہی تو ہے جسٹ فار انجوائے منٹ۔ چلو شاباش جلدی سے تیسری فرمائش پوری کرو تاکہ ہم دوسرے قربانی کے بکروں کی درگت بنا سکیں۔'' شاذان کے اصرار کرنے پر اس کے ڈھینچوں ڈھینچوں کی ناپسندیدہ آواز نکالتے ہی بنی اور بعد میں وہ منہ پھلا کر بیٹھ گئی۔

''میرا خیال ہے حاضرین کچھ خوفزدہ دکھائی دے رہے ہیں تو آپ سب کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ صرف یہی پرچی قابل اعتراض تھی باقی سب بہت زبردست ہیں۔ اب یہ مس انیقہ کی قسمت کہ یہ پرچی ان کے ہاتھ میں آ گئی حالانکہ ضدی بھائی کے پاس جانی چاہیے تھی۔'' شاذان نے کہا۔

''اب آپ میں سے کون پرچی اٹھائے گا۔''

''اب فہدی بھائی آگے آئیں۔'' مہوش نے کہا۔ خلاف توقع خلاف عادت آج وہ اپنے کزنز اور بھائیوں کی رفاقت کو انجوائے

کر رہی تھی.....فواد نے ڈرنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے ایک پرچی اٹھا کر شاذان کے ہاتھ میں تھما دی اور اس کی طرف یوں دیکھنے لگے جیسے اس کے ہاتھ میں ان کا نامہ اعمال ہو۔

''واہ.....واہ.....'' شاذان پرچی پڑھ کر جھوم اٹھا۔''کہاں غریب مریضوں کی چیر پھاڑ اور کہاں عشق کی واردات۔ واہ.....کیا کمبی نیشن ہے۔ ڈاکٹر فواد علی شاہ اظہار عشق کر کے دکھائیں۔''

''کیا مطلب.....؟''

''یار بھائی! اپنی خیالی محبوبہ سے عشقیہ مکالمے بولیں ہمارے سامنے۔''

''نہیں بھئی یہ اپنے بس کی بات نہیں۔''

''ارے بھائی پریکٹس کر لیں شائد عنقریب ایسا کوئی موقع آ جائے اور آپ بغلیں جھانکنے لگ جائیں ہماری ہونے والی بھابھی کے سامنے۔''

''شاذان یار مشکل کام ہے۔''

''کیا محبت کرنا یا محبت بھرے جملے بولنا۔'' فواد کو چڑا کر شاذان کو مزہ آ رہا تھا۔

''دونوں ہی.....''

''چلیں وقت ضائع ملت کریں۔ جلدی سے خیالی محبوبہ سے اظہار عشق کریں۔ یہ یاد رکھئے گا کہ پہلی بار عشق کا اظہار کرنا ہے۔''

''یعنی سیدھے سیدھے کہہ دوں کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔'' فواد مسکراتے ہوئے بولے۔

''اوہنہ وہی ٹپیکل سڑک چھاپ، فٹ پاتھی عاشقوں والا جملہ۔ او بھائی میرے، کوئی جدت لائیں کوئی نیا پن۔ ہر انسان کے ذہن میں ایک خیالی پیکر ہوتا ہے اور جب وہ پیکر مجسم ہو کر سامنے آ جاتا ہے تو اس وقت اس کے کیا محسوسات ہوں گے۔ ان محسوسات کو زبان دینی ہے، کیا آپ کے ذہن میں کوئی خیالی پیکر نہیں ہے۔''

''اوں.....ہے تو سہی۔'' کنکھیوں سے آریان کی سمت دیکھ کر وہ شرارت سے بولے۔

''ہرے.....تو پھر دیر کس بات کی۔ جلدی سے اس خیالی پیکر کو نگاہوں کے سامنے لائیں اور جلدی سے اظہار عشق کر ڈالیں۔ یہ نہ ہو وقت گزر جائے اور آپ پچھتاتے رہ جائیں۔'' شاذان اپنی ہی ہانکے جا رہا تھا۔ فواد نے نظر اٹھا کر آریان کی طرف دیکھا، وہ انہی کی جانب متوجہ تھی۔ ان کی آنکھوں کا عجیب گہرا سا تاثر دیکھ کر اس نے نگاہیں جھکا لیں، فواد بولنے لگے تو شاذان نے ٹوک دیا۔

''یوں نہیں کھڑے ہو کر۔'' وہ اٹھ کھڑے ہوئے پھر دو تین قدم پرے ہٹ کر سامنے کی سمت رخ کر کے کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے ایک نظر سامنے یوں دیکھا جیسے ان کا تخیل کسی پیکر کے سانچے میں ڈھل کر ان کی نگاہوں کے سامنے آ گیا ہو۔ ان سے بہت قریب۔ دھڑکنیں ایک ردھم سے دھڑکنے لگیں۔ ایک پل کی خاموشی کے بعد وہ گویا ہونے ہی والے تھے کہ شاذان بول اٹھا۔

''ویسے اس خیالی محبوبہ کا کوئی نام بھی تو ہونا چاہئے۔'' روبیہ اور انیقہ نے بھی تائید کی۔

''ربیعہ کیسا رہے گا فواد بھائی.....''

''انتہائی بوگس.....'' فواد شرارت سے آریان کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔ ''دیکھو بھئی چاند کو جس نام سے بھی پکارا جائے، چاند ہی رہے گا، پھول کو کسی نام سے پکاریں تب بھی اس کی خوشبو پر کوئی اثر نہیں پڑتا تو پھر محبوبہ کو بھی جو مرضی نام دیا جائے۔'' فواد نے کہا

''چلیں ٹھیک ہے اب جلدی کریں بے چاری محبوبہ انتظار میں سوکھ رہی ہے۔'' شاذان نے کہا تو فواد نے چہرے پر سنجیدگی طاری کر کے پہلے حاضرین کی طرف دیکھا۔ پھر ان کی آنکھیں ایک مقام پر رک گئیں۔

''ہم کسی کو اپنی مرضی سے چاہ تو سکتے ہیں رباب! لیکن کسی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ نہیں کہہ سکتے کہ تم بھی مجھ سے محبت کرو، محبت نے میرے در دل پر بہت دیر سے دستک دی لیکن تمہارا کہنا ٹھیک نہیں کہ یہ یکطرفہ محبت ہے۔ کسی دل سے کسی دوسرے دل کے لیے محبت کی شعاعیں حصار کھینچتی ہیں تو دل کسی کی طرف مڑتا ہے۔ اس کا ہوتا ہے، محبت کے سمت ہوتی ہے نہ رائیگاں ایک نظم سنو۔'' فواد ایک پل کو رکے۔ سب کے سب بہت غور سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے حتیٰ کہ طاہر جو کسی کام کے لیے ان کی طرف آیا تھا وہ بھی چپ کھڑا سن رہا تھا۔

اتنی بڑی ان دنیاؤں میں
اپنے نام کی تختی والی ایک عمارت
کتنے دکھوں کی اینٹیں چن کر گھر بنتی ہے
پتھر پتھر جوڑ کے دیکھو
میں نے بھی اک گھر ہے بنایا
رنگوں، پھولوں، تصویروں سے اس کو سجایا
دروازے کی لوح پر اپنا نام لکھوایا
لیکن اس کے ہر کمرے میں تم رہتے ہو!

''رباب! تمہیں پتہ ہے دکھوں کی ان اینٹوں کے درمیان تمہاری محبت..... تمہاری محبت کرنے کی لگن، سکون اور تسکین ہے، تم انتہائی پر مسرت خوشی جیسی ہو۔ میں..... اس خوشی سے اپنا دامن بھر لینا چاہتا ہوں.....'' فواد خاموش ہو گئے۔ تالیوں کی آواز پر انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا شائد وہ بہت سنجیدہ اور خود فراموشی کی کیفیت میں چلے گئے تھے۔ آریان کی نظریں ان پر ٹکی ہوئی تھیں۔

یہ لفظ..... یہ دھڑکتے لفظ تو تمہاری میراث تھے اور میں نے انہیں تقسیم کر دیا، تشہیر کر دی، ان پاکیزہ ان جھوٹے جذبوں کی..... جن سے تم خود ابھی آگاہ نہیں ہو۔'' فواد کا دل یکدم ماحول سے اچاٹ سا ہو گیا۔

بھائی..... آپ تو ڈاکٹر کم شاعر زیادہ لگ رہے تھے۔'' شاذان ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔

یہ لوگ، یہ جو میرے اردگرد بیٹھے ہیں شائد ان لفظوں کو سمجھ نہیں پائے۔ مجھے اپنے رویئے سے انہیں کسی قسم کے شک میں مبتلا نہیں کرنا چاہئے۔'' وہ سنبھل گئے۔

''جی ہاں..... ابھی ابھی آپ نے پرانی پاکستانی فلم کا ایک ٹریلر دیکھا۔ نادیدہ صبیحہ کے سامنے سنتوش صاحب کا اظہار عشق۔ تو اب باری ہے مس روبیہ کی کہ وہ بھی اس کارِ خیر میں شریک ہو جائیں۔'' شاذان نے پرچیاں روبیہ کے آگے ڈھیر کر دیں۔ اس نے پہلے سب پر ایک نگاہ ڈالی۔

''میری بھی تو کوئی سن لے..... انا اور باصر لڑ رہے تھے آپس میں۔ اتنی دیر سے کہنے کی کوشش کر رہا تھا کوئی سننے کو تیار ہی نہیں۔'' طاہر تنگ آ کر چیخ پڑا۔

''کمال ہے..... اب بتا رہے ہو۔ شاذان جا کر بلا لاؤ انہیں یہیں۔'' فواد نے شاذان کو اس کے ساتھ بھیج دیا۔ روبیہ نے پرچی اٹھا کر خود ہی پڑھی۔

''اپنے دائیں طرف بیٹھے شخص کو منہ چڑائیں'' روبیہ نے فرمائش پڑھ کر دائیں طرف دیکھا۔ دائیں طرف بیٹھا ہوا تو کوئی نہیں تھا البتہ اس طرف سے شاذان ادھر کو آ رہا تھا بمعہ بچوں کی ننھی فوج لیے۔ روبیہ نے اس کو منہ چڑایا تو وہ وہیں سے مصنوعی غصے سے بولا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے.....''

''تمہاری فرمائش پوری کی جا رہی ہے۔'' روبیہ کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔

''میں نے کب کہا کہ میرا منہ چڑاؤ۔'' شاذان قریب آتے ہوئے بولا۔

''پرچی میں یہی لکھا ہوا تھا۔'' روبیہ نے کہا۔

''اچھا خیر! اب کون رہ گیا ہے؟'' شاذان نے پوچھا۔

''تم اور آریان.....''

''چلیں آریان۔ اٹھائیں پرچی.....''

''نہیں، میں تو نہیں کھیل رہی.....'' اس نے پہلو بچانا چاہا۔

''لیکن یہ آپ کو کھیل شروع کرنے سے پہلے بتانا چاہئے تھا، اب آپ کھیل میں شریک ہیں لہٰذا اصولاً آپ کو ہماری فرمائش پوری کرنی پڑے گی۔''

''پھر پہلے تم نکالو.....'' آریان نے اسے آگے کیا۔

''ٹھیک ہے، میں اٹھانے لگا ہوں لیکن آپ بھی مکریئے گا مت۔'' شاذان نے پرچی اٹھا کر با آواز بلند پڑھی۔

''مینڈک کی طرح کود کر دکھائیں۔'' برا سا منہ بنا کر اس نے سب کی طرف دیکھا۔ سب بچوں نے مل کر تالیاں بجائیں۔

''تم لوگوں کو کس بات کی خوشی ہو رہی ہے۔''

''شانی بھائی! ہم سوچ رہے ہیں آپ مینڈک کی طرح اچھلتے کیسے لگیں گے۔''

''کیوں تمہیں سوچنے کی کیا ضرورت..... کبھی آئینہ نہیں دیکھا تم نے مینڈک کہیں کے۔''

شاذان نے اطہر کو جھاڑا لیکن غصہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا آخر اسے فرمائش پوری کرتے ہی بنی۔ انیقہ اٹھ کر صابرہ کے ساتھ برتن وغیرہ سیٹ کروانے میں لگ گئی۔ لنچ کا ٹائم ہو گیا تھا سو صابرہ نے اسٹوو گاڑی سے نکال کر باہر رکھا اور لنچ والا ہاٹ پاٹ نکال کر کھانا گرم کرنے میں لگ گئی۔

''اب اس کھیل کے آخری کھلاڑی کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ پرچی اٹھائیں اور فرمائش پوری کر کے اس کھیل کو خوشگوار اینڈ سے ہمکنار کریں۔'' شاذان نے خالصتاً کمنٹیٹروں والے انداز میں کہا۔

آریان نے بے بسی سے فواد کی طرف دیکھا انہوں نے کندھے اچکا کر خود کو غیر جانبدار ظاہر کیا پھر اس کی نظریں روبیہ اور انیقہ کی طرف اٹھیں۔

''یہ کیا آپ حمائتیوں کی تلاش میں ادھر ادھر نگاہیں دوڑا رہی ہیں۔ اس وقت ان میں سے کوئی آپ کی ہیلپ نہیں کرے گا۔'' شاذان نے اس کی چوری پکڑ لی۔

''بالکل آریان آپی..... آپ کو بھی اب کچھ نہ کچھ کر کے دکھانا پڑے گا۔'' انیقہ نے شاذان کا ساتھ دیا۔

''میں کیا سرکس سے بھاگی ہوئی لگتی ہوں کچھ نہ کچھ کرتب دکھاؤں۔'' آریان مصنوعی ناراضگی سے بولی۔

''اوہنوں..... کوئی عذر نہیں جلدی سے پرچی اٹھائیں۔'' شاذان کسی طور ٹلنے کو تیار نہ تھا آخر مرتے کیا نہ کرتے کے مصداق اس نے پرچی اٹھا کر شاذان کے ہاتھ میں تھما دی۔ شاذان نے کھول کر پڑھی اور پھر سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

''تم کیوں مراقبے میں پڑ گئے۔ کیا بہت مشکل فرمائش ہے۔'' آریان گھبرا کر بولی۔

''حاضرین و سامعین..... اب آپ کے سامنے تشریف لا رہی ہیں مس آریان نئی ابھرتی ہوئی گلوکارہ جو آپ کو بے حد خوبصورت گیت سنائیں گی۔'' شاذان نے جیسے کوئی اہم فریضہ سرانجام دیا۔

''ہُرّے..... اب مزہ آئے گا۔'' طاہر اور دیگر بچے خوشی سے تالیاں بجانے لگے۔

''تم سب کس خوشی میں اچھل رہے ہو، وہ کیا تمہیں لوری سنانے لگی ہے۔'' روبیہ نے بچوں کو لتاڑا تو وہ بے چارے خاموش ہو گئے۔

''لیکن میں نے کبھی گانا نہیں گایا۔'' آریان نے ڈھکے چھپے لفظوں میں انکار کیا۔

''یہ کہاں لکھا ہے کہ جو کام زندگی میں نہ کیا وہ کبھی کرنا بھی نہیں چاہئے۔'' انیقہ نے اس کا یہ عذر رد کر دیا۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں مجھے شاعری سے تھوڑا بہت لگاؤ ہے لیکن میوزک سے بالکل نہیں ہے۔''

''جسے شاعری پسند ہو وہ کبھی میوزک کو ناپسند کر ہی نہیں سکتا۔ آپ کو ہمیں گیت سنانا پڑے گا۔'' شاذان نے اصرار کیا تو آریان نے بے بسی سے سر جھکا لیا۔

''آریان..... پلیز جلدی سے ہماری سماعت کو سکون بخشئے تا کہ ہم پھر پیٹ پوجا کی تیاری کریں۔ بھوک سے چوہے لکن میٹی کھیلنے لگ گئے ہیں پیٹ میں۔'' شاذان نے باقاعدہ پیٹ پکڑ کر دہرا ہوتے ہوئے کہا۔

''چلیں گیت نہ سہی کوئی غزل ہی سنا دو۔''

مہوش بھی جیسے اصرار کرنے والوں میں شامل ہو گئی۔

''یقین کیجئے آپ سب کی خواہش کو رد کرنا مجھے اچھا نہیں لگ رہا لیکن حقیقت یہی ہے کہ میں نے اپنی ساری عمر میں کبھی کوئی گیت نہیں گایا نہ ہی سنا۔'' آریان بولی۔

''چلیں گیت اور غزل نہ سہی..... بچپن میں آپ کی امی نے آپ کو لوری تو سنائی ہو گی۔ وہ لوری ہی سنا دیں۔'' چھن..... چھن..... چھناک..... وقت کی جھیل میں بڑا بے رحم پتھر گرا تھا۔

اندر کہیں بہت پر شور طوفان اٹھا تھا، کہیں دور گھنگھروؤں کی جھنکار بلند ہوئی۔ طبلے پر تھاپ پڑی اور ہوا کی سسکیاں ردھم کے ساتھ درد بھری لے پر گنگنانے لگیں۔

اور کچھ دیر میں لٹ جائے گا ہر بام پہ چاند
عکس کھو جائیں گے آئینے ترس جائیں گے

عرش کے دیدہ نمناک سے باری باری
سب ستارے سر خاشاک برس جائیں گے

آس کے مارے تھکے ہارے شبستانوں میں
اپنی تنہائی سمیٹے گا بچھائے گا کوئی

بے وفائی کی گھڑی ترک مدارات کا وقت
اس گھڑی اپنے سوا یاد نہ آئے گا کوئی

ترک دنیا کا سماں، قسم ملاقات کا وقت
اس گھڑی اے دل آوارہ کہاں جاؤ گے

اس گھڑی کوئی کسی کا بھی نہیں، رہنے دو
کوئی اس وقت ملے گا ہی نہیں، رہنے دو

اور ملے گا بھی تو اس طور کے پچھتاؤ گے
اس گھڑی اے دل آوارہ کہاں جاؤ گے؟

ہوا کی سسکیاں تھم چکی تھیں، گھنگھروؤں کی صدا اپنے ہونے کا احساس کھو چکی تھیں لیکن اس کے اندر مسلسل کوئی بین کر رہا تھا۔ سمندر جیسی گہری آنکھوں کے ساحل بھیگنے لگے۔ وہ سب تالیاں بجا رہے تھے۔ مسکرا مسکرا کر داد دے رہے تھے لیکن اس کی بھیگی آنکھیں اور ان بھیگتی آنکھوں کے پس پردہ اٹھتے تلاطم صرف فواد کی نگاہیں دیکھ پائی تھیں۔ وہ سنبھل گئی، ہونٹ بھینچ کر سسکیوں کا گلا گھونٹ کر مسکرانے کی کوشش کرتی آریان فواد کی مسند دل پر انتہائی تمکنت سے جلوہ افروز ہو گئی۔

ان نہ بہنے والے آنسوؤں کی پاکیزگی نے فواد کے دل میں اگر کوئی ہلکا سا شک تھا بھی تو دھو ڈالا تھا۔ وہ بھی سب کے ساتھ شامل ہو گئے۔ لنچ کرنے کے بعد بھی وہ کافی دیر وہاں ٹھہرے تھے لیکن آریان کہیں کھو گئی تھی اس کا وجود ان سب کے درمیان تھا وہ ہنس بھی رہی تھی باتیں بھی کر رہی تھی لیکن ذہن کے گمنام گوشوں میں ماضی کے نشتر چبھ کے لگا رہے تھے اور اس کی یہ کیفیت محسوس کر کے فواد نے واپسی کا اعلان کر دیا۔ اس نے تشکر بھری نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔ حقیقتاً وہ اس وقت صرف تنہائی چاہتی تھی، اس کے وجود کے اندر دھواں سا بھر رہا تھا۔ آخر یہ غبار اسے اکیلے تنہائی میں بیٹھ کر ہی نکالنا تھا۔ سب گاڑی میں بیٹھ کر واپسی کی راہ پر عازم سفر ہو گئے لیکن ان سب میں دو راہی ایسے تھے جنہوں نے آگے کا سفر شروع کر دیا تھا باقی سب نے تو چند لمحوں میں منزل پر پہنچ جانا تھا لیکن ان دو راہیوں کی مسافت تو اب شروع ہوئی تھی۔

☆.....☆.....☆

''میں نے پچھلے دنوں بھی آپ کو بتایا تھا کہ سعود بھائی زین کے لیے اپنی مہوش کا رشتہ مانگ رہے ہیں۔ آپ نے کوئی جواب ہی نہیں دیا۔'' اس وقت رات کا کھانا کھا کر سب اپنے اپنے کمروں میں تھے۔ بابر چچا کا موڈ بھی آج بہتر ہی تھا سو زاہدہ چچی کو یہی وقت مناسب لگا کہ وہ بات چھیڑ دیں جو پچھلے کئی دنوں سے بابر چچا کے ساتھ ڈسکس نہ کرنے کی وجہ سے التواء میں پڑی ہوئی تھی۔

''کیا جواب دوں.....'' بابر چچا ہنوز اپنے سامنے موجود کتاب کی طرف متوجہ رہے۔

''یہ بھی اچھی رہی.....بھئی بیٹی کا معاملہ ہے کوئی رائے تو دیں.....''

''کیسی رائے؟'' انہوں نے اب بھی کوئی خصوصی توجہ نہ دی۔

''یہ موئی کتاب ایک طرف رکھ دیں اور میری بات توجہ سے سنیں تو پتا چلے۔'' وہ زچ ہو کر بولیں۔

''یہ لو رکھ دی کتاب.....بولو.....'' انہوں نے کتاب بند کر کے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھی اور ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''میں کہہ رہی تھی کہ زین اچھا لڑکا ہے۔ پڑھا لکھا اچھی نوکری پر لگا ہوا ہے۔ ہماری بچی کو خوش رکھے گا۔'' زاہدہ چچی کے لہجے میں بھتیجے کی محبت محسوس کر کے بابر بھائی مسکرا دیے۔

''تمہیں بھتیجا زیادہ پیارا ہے یا بیٹی۔''

''ہیں۔ بھلا یہ کیا بات ہوئی.....؟''

''میں نے جو پوچھا ہے اس کا جواب دو۔''

''ظاہری بات ہے اپنی بیٹی ہی پیاری ہے۔ پر بھتیجا بھی تو پھپھی کا لاڈلا ہوتا ہے۔''

''لیکن تمہیں کس نے بتا دیا کہ تمہارا وہ لاڈلا اچھا لڑکا ہے۔'' بابر چچا بولے تو چچی کو تو جیسے مرچیں لگ گئیں۔

''ناں مطلب کیا ہے اس بات کا.....کیا برائی دیکھ لی اس میں؟''

''دیکھو زاہدہ! تم اس کی جس چیز سے متاثر ہو۔ کم سے کم متاثر ہونے کے لیے میرے نزدیک وہ کوئی خاص چیز نہیں ہے۔ تم نے اس کی دولت دیکھی ہے یا پھر اس کے اکلوتے ہونے کا خیال ہو گا تمہیں۔''

''ہاں تو اور کیا ہونا چاہیے، ماشاءاللہ تین تین گاڑیاں کھڑی ہیں ان کے گھر میں۔ گھر کو دیکھ کر کسی محل کا گمان ہوتا ہے پھر مہوش کو لندن دیکھنے کا شوق بھی بہت ہے۔''

''زاہدہ تم فیصلہ کر چکی ہو یا مجھ سے پوچھ کر کرنا چاہتی ہے۔'' بابر چچا ٹھنڈے لہجے میں بولے۔

''کمال ہے آپ کے بغیر تنہا میں کیسے فیصلہ کر سکتی ہوں۔''

''تو پھر میری مان لو کہ مہوش کو اپنے اور اس کے شوق کی بھینٹ مت چڑھاؤ۔ خوشیوں کے لیے صرف دولت اور اسٹیٹس کافی نہیں ہوتا۔''

''لیکن آخر زین میں برائی کیا ہے.....'' زاہدہ چچی بابر چچا کے سرد لہجے پر جیسے کڑھ کر بولیں۔

''تم نے محض وہ سنا یا دیکھا ہے جو تمہیں دکھایا اور سنایا گیا ہے جبکہ میں اس کے متعلق وہ کچھ جانتا ہوں جو شائد اس کے اپنے ماں باپ نہیں جانتے۔''

''مثلاً.....''

''وہاں لندن میں بہت سی انگریز عورتوں کے ساتھ فرینڈ شپ ہے اس کی۔ دو شادیاں کر چکا ہے وہ۔ ان میں سے ایک عورت اس کے بچے کی ماں بھی ہے۔ پھر تم خود بتاؤ سب کچھ جانتے بوجھتے مہوش کو کنویں میں کیسے دھکیل دوں۔''

''یہ سب کس نے بتایا آپ کو..... کیا ثبوت ہے آپ کے پاس؟'' زاہدہ چچی تو آگ بگولا ہو گئیں اپنے بھتیجے کے کرتوت سن کر۔

''احسن میرے دوست کو شائد تم جانتی ہو اسی شہر اس اسٹیٹ میں رہائش پذیر ہے وہ جہاں تمہارا بھتیجا رہتا ہے جب تم نے پہلی بار مہوش اور زین کے رشتے کی بات کی تھی میں نے تب ہی احسن سے اس کی بارے میں ساری معلومات لے لی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ پھر میں نے اس رشتے پر غور نہیں کیا۔'' بابر چچا رسان سے بولے۔

''تو اس کا کیا ہوا، کیا حدیث ہو گیا؟ وہ غلط بھڑکا بھی سکتا ہے۔''

''کیوں اس کی کیا دشمنی زین سے۔'' بابر چچا کا دل چچی کی عقل پر ماتم کرنے کو چاہا۔

''ہو سکتا ہے وہ اپنی بیٹی کا رشتہ دینا چاہتا ہو بہر حال یہ تو ماننے والی بات نہیں البتہ دوستی کی جہاں تک بات ہے تو وہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں۔'' چچی نے ان کا اعتراض سرے سے ہی مسترد کر دیا۔

''بھتیجے کی محبت کی پٹی آنکھوں سے اتار کر دیکھو..... بالفرض محال ایسا ہے بھی جیسا تم کہہ رہی ہو تب بھی رنگ رنگ کی عورتوں سے دوستی کرنے والے شخص کا کیا اعتبار کل کو اسے کوئی زیادہ پسند آ جائے اور وہ اسے اپنے گھر لے آئے پھر مہوش کا کیا بنے گا؟''

''کوئی بھی نہیں ایسا، رنگ رنگ کی عورتوں کو مرد گھر سے باہر ہی رکھتا ہے، گھر والی کا رتبہ ہر ایک کو نہیں دیا جاتا۔''

''زاہدہ..... بحث مت کیا کرو۔ مہوش میری بیٹی ہے اور اس کی زندگی کا فیصلہ میں سوچ سمجھ کر کروں گا، میں کسی آوارہ، بدقماش شخص سے اپنی بیٹی کا رشتہ طے نہیں کروں گا۔'' بابر چچا چچی کی بحث سے تنگ آ کر ذرا بلند آواز میں بولے۔

''بابر! آپ ناراض کیوں ہو رہے ہیں۔ مہوش آپ کی بیٹی ہے تو کیا میری کچھ نہیں لگتی۔ میں ماں ہوں اس کی، اس کے مستقبل کے بارے میں غلط فیصلہ کیسے کر سکتی ہوں۔'' چچی رسانیت سے بولیں۔

''لیکن یہاں تمہارا فیصلہ ٹھیک نہیں ہے اسی لیے میں بول پڑا ہوں..... آج تک اس گھر میں ہونے والے ہر فیصلے کی خود مختاری تمہیں دی ہوئی تھی کہ یقین تھا گھر اور گرہستی کو سمجھنے والی عورت ہو لیکن یہاں مجھے مداخلت کرنی پڑے گی کیونکہ یہ مہوش کی ساری زندگی کا معاملہ ہے۔'' بابر چچا ضبط اور تحمل کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

''آخر خرابی کیا ہے زین میں.....؟'' زاہدہ چچی کی فطری ہٹ دھرمی عود آئی تھی۔ جب وہ کوئی فیصلہ کر کے اس پر قائم ہو جاتی تھیں تو پھر مدمقابل کو زیر کرنے کی خاطر بحث و تکرار تک بات پہنچ جاتی ہے۔

''ابھی بتایا نہیں تمہیں..... طوائفوں جیسی عورتوں کے ساتھ دوستیاں ہیں اس کی جن لوگوں میں اس کا اٹھنا بیٹھنا ہے وہ اچھے لوگ نہیں۔''

''تو یہ کوئی اتنی قابل اعتراض بات بھی نہیں..... جوانی میں سبھی ایسی حرکتیں کرتے ہیں بعد میں خود ہی سدھ جاتے ہیں۔'' چچی کی لاپرواہی دیدنی تھی۔ بابر چچا کا تو خون ہی کھول اٹھا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا..... یعنی اس میں کوئی قابل اعتراض بات ہی نہیں۔ زاہدہ بیگم ایک آوارہ مزاج شخص کو اپنی بیٹی کا رشتہ دے دینا تمہارے لیے لائق داد و تحسین ہوگا لیکن میرے لیے نہیں۔''

''لیکن میں مہوش کی شادی وہیں کرنے کا ارادہ کر چکی ہوں۔''

''جب تم فیصلہ کر چکی ہو تو میرا مشورہ میری رائے کس لیے مانگ رہی ہو۔ زاہدہ بیگم اولاد کوئی کھلونے نہیں ہوتے جنہیں جہاں جی چاہے اٹھا کر رکھ دو، ان کی زندگیوں کے فیصلے بہت سوچ سمجھ کر کرنے ہوتے ہیں جبکہ تم تو مجھے آنکھوں دیکھی مکھی نگلنے کو کہہ رہی ہے۔''

''بابر! میں نے کہہ دیا مہوش کی شادی وہیں ہوگی۔'' چچی کے حتمی لہجے کو محسوس کر کے بابر چچا بھڑک اٹھے۔

''تمہاری عقل پر تو پتھر پڑ گئے ہیں زاہدہ بیگم..... بھتیجے کی محبت میں بیٹی کی زندگی تباہ کرنے پر تل گئی ہو تم..... لیکن میرے حواس ابھی سلامت ہیں۔ میں یہ رشتہ ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔'' وہ دونوں ایک دوسرے کے مخالف ڈٹے ہوئے تھے۔ لہجوں کی تلخی آواز کے

http://kitaabghar.com

آنکھیں کسی نکتے پر مرکوز جیسے ساکت تھیں اور چہرے کا رنگ متغیر تھا۔ چچی نے ان کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو جیسے سن ہو کر رہ گئیں، دروازے کے فریم میں سجے تینوں چہرے نوزائیدگی سے لے کر جوانی تک ان کے وجود سے ایک ایک قطرہ خوشی کشید کرتے رہے تھے لیکن اس وقت ان کی نظروں میں ایسی بے یقینی اور بے اعتباری تھی کہ ایک پل کو زاہدہ چچی جیسے اپنے اندر کٹ کر رہ گئیں۔

''یہ کیا ہو گیا..... جس راز کو برسہا برس اپنے سینے میں چھپانے کیلئے سسرال کے دوراہوں پر میں آبلہ پا چلتی رہی لیکن کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہوئی کہ کونسا درد سینے میں سنبھالے پھرتی ہوں۔ آج وہ راز بے دھیانی میں لبوں پر کس وقت آ گیا، جوان اولاد کے سامنے کتنا نامعتبر کر دیا میں نے اپنے شریک زندگی کو۔

یہ ایک حقیقت تھی کہ شادی کے دو تین سال بعد وہ زمرد کے عشق میں گرفتار ہو گئے تھے لیکن ان کا یہ عشق چھ سات سال سے زیادہ نہ چلا۔ وجہ وہ پھول تھے جو ان کے آنگن میں کھل چکے تھے۔ ان پھولوں کی آبیاری ان کی ساری توجہ اور محبت کی طلبگار تھی اور انہوں نے ان پھولوں کو حوادث زمانہ کی خزاں سے بچانے کے لیے اپنی جان لڑا دی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ آج ان کے تینوں بچے تعلیمی قابلیت، کردار، اخلاق کسی چیز میں بھی کسی سے کم نہ تھے لیکن زاہدہ چچی نے ان کی ریاضت ضائع کر دی تھی۔

وہ تو اسی لمحے ٹوٹ گئے جب انہوں نے اپنے بچوں کی آنکھوں میں اپنے لیے بے یقینی اور اعتماد کے مجروح آئینے کی کرچیاں دیکھیں۔ کمرے میں پانچ نفوس تھے لیکن ہر ایک اپنی اپنی سوچ میں گم، فواد، مہوش اور شاذان کے قدم جہاں تھے وہیں رکے ہوئے تھے۔ زاہدہ چچی پچھتاوؤں کے بوجھ تلے دبی سہمی دھڑکنیں شمار کر رہی تھیں اور بابر چچا کنفیس باکس کے اندر اعتراف گناہ کر چکنے والے مجرم کی طرح سر جھکائے بیٹھے تھے۔ کچھ دیر کی جان لیوا خاموشی کے بعد بابر چچا اپنی جگہ سے اٹھے اور کمرے سے باہر نکل گئے۔ انہوں نے کسی کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھا تھا یا شائد وہ خود میں اتنی ہمت نہیں پا رہے تھے کہ اپنے ماضی کا وہ تاریک گوشہ جو انہوں نے ہر ایک سے چھپا کر رکھا یوں ان کی اولاد کے سامنے بے نقاب ہوا کہ لمحوں میں وہ اپنے مقام سے بہت نیچے آ گئے۔ نظروں سے گرنا انہیں برداشت نہیں ہو رہا تھا، وہ اندر کے شور سے گھبرا کر گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ ماحول میں قدرے خنکی سی تھی، وہ پیدل چلتے گئے، باہر کے سناٹے نے اندر موجود شور کو جیسے اور شوریدہ سر بنا دیا تھا۔ جانے ان کے قدموں نے کتنی مسافت طے کی، گھر کہیں بہت پیچھے رہ گیا جو کبھی ان کے لیے جائے پناہ، جائے اماں تھا لیکن آج عدالت کے کٹہرے کی طرح بے حس واقعہ ہوا تھا وہ گھر اس گھر کے مکین بہت دور رہ گئے تھے۔ چلتے چلتے انہیں محسوس ہوا جیسے پیروں میں سکت نہ رہی ہو شاید آبلے بن چکے تھے یا پیروں کے تلوے چھل گئے تھے۔

ٹانگوں میں جان نہ رہی تھی۔ انہوں نے سر اٹھا کر ارد گرد دیکھا، بالکل خاموش فضاء وہ شہر سے غالباً باہر نکل آئے تھے، دور تک جاتی خاموش سڑک اور اس کے ارد گرد لگے بلند و بالا درخت۔ اندھیرا بہت گہرا ہو چکا تھا شائد رات کا پہلا پہر اختتام پذیر تھا۔ وہ جیسے تھکن کے آگے ہتھیار ڈالتے ہوئے سڑک کے کنارے لگے درخت سے ٹیک لگا کر نیچے گھاس پر بیٹھ گئے۔ جیب سے سگریٹ کی ڈبی نکالی ایک سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبائی اور سلگا کر گہرے گہرے دو تین کش لیے۔

''کیا محض چند جملوں سے زندگی کی تمام محنت رائیگاں جا سکتی ہے کیا لفظوں میں اتنی طاقت ہوتی ہے جو یوں ریاضت کو بے ثمر کر کے رکھ دے۔ زمرد..... تمہاری محبت کو ٹھکرانے کی سزا مجھے اور کس کس صورت میں ملے گی۔'' بابر چچا اپنے دل کے نہاں گوشوں میں جھانکنے لگے جہاں ایک چہرہ وقت کی دھول سے دھندلایا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اپنے ہونے کا ماتم کرتا ہوا ''یہ گرد تو بابر شاہ تم نے خود اس معصوم چہرے کا مقدر کی ہے پھر اب کیوں شرمندہ ہو۔'' بابر چچا نے اس گدلے آئینے میں عکس کی طرح جھلملاتے اس دھندلے کو دیتے ہوئے چہرے کو دیکھتے ہوئے خود کلامی کی۔ آنکھوں کے آگے سیاہ چادر حائل ہو گئی پھر اس چادر پر روشنی جھلملانے لگی اور اس روشنی میں کچھ سائے سے متحرک ہو گئے۔

''زمرد..... محفل اپنے پورے جوبن پر ہے گھنگھرو باندھ لو۔'' بڑی آپا گاؤ تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے بولیں۔

''آپا چند منٹ ٹھہریئے.....'' زمرد کی بے چین نگاہیں بیرونی دروازے پر ٹکی ہوئی تھیں۔

''ارے کاہے چھمک چھلو..... کس کا انتجار ہے ری۔'' پان چباتا ہوا کوئی سیٹھ نشے میں ڈوبی آواز میں بولا۔

''کچھ نہیں سیٹھ صاحب! بس محفل شروع کیے دیتے ہیں۔'' بڑی آپا عاجزی سے بولیں۔ غالباً کوئی موٹی آسامی تھا وہ شخص۔

''زمرد..... مجرا شروع کرو..... طوائفوں کو انتظار راس نہیں آتا۔ کوٹھے میں رہتی ہو تو یہاں کے اصول بھی سمجھو.....'' بڑی آپا کے لہجے میں محسوس کی جانے والی سختی سے مجبور ہو کر زمرد نے گھنگھرو باندھ لیے۔

جلنے لگیں یادوں کی چتائیں
آؤ کوئی بیت بنائیں
جن کی رہ تکتے جگ بیتے
چاہے وہ آئیں یا نہیں آئیں
آنکھیں موند کے نت پل دیکھیں
آنکھوں میں ان کی پرچھائیں

وہ آنکھیں بند کیے خود فراموشی کی کیفیت میں رقص کر رہی تھی۔ تماش بینوں پر جیسے سکتہ سا طاری ہو گیا تھا۔ گیت کے بول تھے یا اس کے دل کی آواز۔ جذبوں کی تمام تر شدتیں ایک محور پر جمع ہو کر پکار اٹھی تھیں اور گوہر مقصود نے در پر قدم رکھا۔ بابر شاہ اپنی بھرپور شان و شوکت کے ساتھ دروازے سے اندر داخل ہوئے تھے۔ بڑی آپا خوشی سے ان کے استقبال کو اٹھنے لگیں لیکن انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں اٹھنے سے روک دیا۔ ان کے ہمراہ ان کا دوست فیاض بھی اکثر یہاں آتا تھا اس وقت بھی وہ ان کے ساتھ ہی تھا۔

انہوں نے اس کے ہاتھ سے بریف کیس لے کر کھولا۔ سو سو کے نوٹوں کی گڈیاں نکالیں اور زمرد پر نچھاور کر دیں۔ کڑکڑاتے ہوئے نوٹوں کی چمک سے جہاں بڑی آپا کی آنکھوں میں مسرت سرائی تھی وہیں زمرد کی بند پلکیں ایک جھٹکے سے کھلی تھیں۔ انتظار کا نتیجہ اس

قدر سرور انگیز ہوتا ہے۔ طمانیت خمار بن کر اس کے پورے وجود پر چھا گئی۔ طبلے کی تھاپ نے لے بدلی۔ گھنگھرو ایک پل کو رکے۔ زمرد کی خمار آلود نگاہوں نے جھک کر بابر شاہ کی قدم بوسی کی اور پھر نئی تال پر رقص شروع ہو گیا۔

اپنے دردوں کا ٹکٹ پہن کر
بے دردوں کے سامنے جائیں
جب رونا آئے مسکائیں
جب دل ٹوٹے دیپ جلائیں
پریم کتھا کا انت نہ کوئی
کتنی بار اسے دہرائیں
پریت کی ریت انوکھی ساجن
کچھ نہ مانگیں، سب کچھ پائیں
فیض ان سے کیا بات چھپی ہے
ہم کچھ کہہ کر کیوں پچھتائیں

رقص ہوتا رہا، گیت گائے جاتے رہے، رات بھیگتی رہی۔ سازوں کے تھمتے ہی تماش بین اٹھ اٹھ کر جانے لگے۔ کچھ روشن شبستانوں میں تاریکیوں کی آغوش میں سمٹتے چلے گئے۔ وسیع و عریض کمرے کے فرش پر پھول کی پتیوں اور نوٹوں کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا۔ بے ترتیب گاؤ تکیوں اور شکن آلود چادروں نے کمرے کی ہیئت ہی بگاڑ دی تھی۔ زمرد نے گھنگھرو اتار کر ایک طرف رکھے اور سہج سہج قدم اٹھاتی بابر شاہ کے قریب آ گئی۔ اس کی آنکھوں کے لودیتے جذبوں کے آگے بابر شاہ نے ہمیشہ خود کو بے بس سمجھا تھا۔ فیاض کو بریف کیس تھما کر انہوں نے اسے باہر گاڑی میں بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ چلا گیا۔

''شاہ صاحب! آپ نے ابھی بیٹھنا ہے۔'' بڑی آپا انہیں ہنوز براجمان دیکھ کر بولیں۔

''جی نہیں..... بس زمرد سے چند باتیں کرنی ہیں۔''

''سوبار کریں..... میں تو اس لیے پوچھ رہی تھی کہ اگر ابھی بیٹھنا ہے تو اندر کمرے میں چلے جائیے..... یہ کمرہ اس وقت آپ کے شایان شان نہیں ہے۔'' وہ ضرورت سے زیادہ مکھن لگانے کی عادی معلوم ہو رہی تھیں۔

''آپا آپ کہاں جا رہی ہیں.....'' بڑی آپا کو اٹھتے دیکھ کر زمرد نے پوچھا۔

''بھئی میں تو سونے جا رہی ہوں..... آدھی سے زیادہ رات بیت چکی ہے تم شاہ صاحب کی کوئی خدمت کرو، کوئی مشروب چائے پانی پوچھو انہیں۔ اچھا شاہ صاحب مجھے تو آپ اجازت دیجئے، یہ زمرد ہے آپ کے پاس جب تک آپ کا دل چاہے بیٹھیں اسے اپنا ہی

دولت خانہ سمجھیں۔"

بابر شاہ ایک ایک لفظ میں چھپے معانی اور افریں جاننے والوں میں سے تھے، نوٹوں کی چمک بہت غیر معمولی ہوتی ہے اور طوائف تو ہوتی ہی دولت کی رشتہ دار ہے۔ بابر شاہ زمرد کو پسند کرتے تھے اسی لیے ابا میاں، زاہدہ بیگم اور گھر والوں کی پرواہ کیے بغیر اس سے ملنے چلے آتے تھے۔ یہ سوچے بغیر کہ جب گھر والوں کو علم ہوگا تو کیا نتیجہ نکلے گا؟

بڑی آپا بیرونی دروازہ بند کر کے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

"شاہ جی! آج آپ نے بہت دیر کر دی! آپ کیا جانیں انتظار کی کتنی اذیت سہی میں نے۔" زمرد اٹھلا کر بولی، جانتی تھی بابر شاہ کی دھڑکنوں پر اس کا نام لکھا ہے پھر وہ خود پر کیوں نہ ناز کرتی۔

"زمرد! ہماری زندگی تقسیم شدہ ہے، ہمارے وقت میں بہت سے سانجھے دار ہیں اور تم اچھی طرح جانتی ہو کہ ہم خیانت کرنے والوں میں سے نہیں ہیں، تمہاری محبت جب بھی اپنا حق مانگتی ہے ہم تمہارے پاس چلے آتے ہیں۔" بابر شاہ نے کہا۔

"شاہ جی! اس محبت کے آگے ہارنے لگی ہوں میں..... میرا اب اس ماحول اس فضا میں دم گھٹتا ہے۔ خدارا مجھے یہاں سے لے چلیے۔"

"یہ ناممکن ہے زمرد! تم جانتی ہو ہم شادی شدہ ہیں، ہماری بیوی ہے، بچے ہیں، وہ تمہیں قبول نہیں کرینگے۔" بابر شاہ اپنی فطری سنجیدگی سے بولے۔

"شاہ جی! آپ ایک بار مجھے یہاں سے لے جائیں یقین کریں تمام عمر میں آپ کی بیوی اور بچوں کی کنیز بن کر رہوں گی..... ساری زندگی آپ سے کوئی حق نہیں مانگوں گی، یہ تک نہیں کہوں گی کہ میری طرف نگاہ اٹھا کر دیکھیں۔ بس..... مجھے اپنا نام دے دیں۔ اپنی پہچان دے دیں۔ میں اس سے زیادہ کی طلبگار نہیں۔" زمرد کے لہجے میں درد تھا، سوز تھا..... تڑپ تھی۔ بابر شاہ کے دل میں اس کا دکھ بہت خاموشی سے در آیا۔

"ہم جانتے ہیں زمرد! تم بہت اچھی ہو..... بہت پاکیزہ۔ تمہاری محبت پا کر یقیناً ہمیں خود پر فخر محسوس ہو رہا ہے لیکن تمہارے ساتھ کوئی زیادتی کریں یہ ہمارا ضمیر کبھی گوارا نہیں کرے گا، ہم صرف اپنی شریک زندگی کی وجہ سے انکار نہیں کر رہے بلکہ ہمارے بچے ہماری ساری محبت کے حقدار ہیں، ہم ان کی شخصیت میں کسی قسم کی کمی نہیں دیکھنا چاہتے۔ اسی لیے زمرد آج ہم تم سے اجازت لیتے ہیں آج کے بعد ہم تمہارے پاس نہیں آئیں گے۔

گزشتہ سالوں کی رفاقت ایک حسین یاد بن کر ہمارے دل میں رہے گی، ہم تمہیں ٹھکرا نہیں رہے بخدا تم ایسا کچھ مت سمجھنا۔" بابر شاہ نے آنسوؤں سے جھلملاتی آنکھوں میں ڈولتا اپنا عکس دیکھا۔ کتنی ناتمام آرزوئیں حسرت بن کر اس کے چہرے پر رقم ہو گئی تھیں۔ بابر شاہ نے رخصت ہونے سے پہلے بہت غور سے زمرد کے چہرے کے ایک ایک نقش کو دیکھا تھا، اپنے اندرونی جذبات سے مغلوب ہو کر

انہوں نے زمرد کی صبیح پیشانی چومی تھی اور وہاں سے رخصت ہو گئے۔ سات سالوں میں یہ محبت کا پہلا لمس تھا جس سے وہ دونوں آشنا ہوئے تھے لیکن اس کے بعد ان کے راستے جدا تھے۔ ایک آبلہ پائی کا طویل سفر زمرد کا مقدر کر کے انہوں نے پھر پلٹ کر اس کی طرف دیکھا تک نہ تھا کہ وہ بیمار وفا جیتی بھی ہے یا مر گئی۔ انگلیوں پر جلن کا احساس ہوا تو وہ جیسے چونک گئے۔ سگریٹ سلگ سلگ کر ختم ہو چکا تھا بالکل ان کی محبت، ان کی زمرد کی طرح۔ انہوں نے فلٹر پھینک دیا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

کتنے ماہ و سال چند لمحوں میں سمٹ کر آ گئے۔ تمہارا دل ٹوٹ گیا تو بچا میرے پاس بھی کچھ نہیں۔ تمہیں بیچ رستے پر چھوڑ کر تمہارا شاہ جی بھی کب منزل پر پہنچ سکا۔ تم جیتے جی مر گئیں زمرد اور میں..... میں مر مر کر جیتا رہا۔ کتنا بوجھ تھا میرے دل پر تمہاری وفاؤں کا مگر میں نے وہ بوجھ کسی مردہ لاش کی طرح دل میں دفنا دیا اور جس شریک زندگی کی خاطر میں نے تمہارے پندار وفا کا تھیس پہنچائی میں اس کا بھی کب بن سکا۔ جن بچوں کے لیے میں خود کو منقسم ہونے سے بچاتا رہا۔ میرے حصے میں ان کی بے اعتباری آئی۔ میں تو بے گناہ ہی دار پر چڑھا دیا گیا۔ زمرد آج..... آج سوچتا ہوں سب کچھ چھوڑ دیتا۔ بس تمہارا دامن محبت میرے ہاتھ میں ہوتا تو..... تو شائد آج میں یوں لٹا ہوا خالی دامن خالی ہاتھ نہ ہوتا۔ میری زندگی جنت ہوتی۔ تم، تمہاری وفائیں مجھے میرے ہونے کا احساس دلاتی تھیں اور اب..... ان لمحوں میں جب..... جب میں ہونے اور نہ ہونے کے بیچ مصلوب ہوں تو تم کہاں ہو؟ کیا تمہارا دامن محبت بھر سے میرے لیے وسیع نہیں ہو سکتا؟ کیا اب بھی تمہاری وفائیں میرے نام نہیں ہو سکتیں؟'' وہ سر جھکائے کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح اپنے ہی نقش قدم پر پاؤں دھرتے واپسی کے راستے پر ہو لیے تھے۔ زندگی کے اس جوئے میں وقت نے آخری پتہ شو کر دیا تھا اور ان کے حصے میں ہار آئی تھی۔ وہ واپس پلٹ رہے تھے اس ہار سمیت کہ جو لوگ شکست کھا کر ٹوٹ جاتے ہیں۔ زندگی ان کے لیے صرف جہنم بن کر رہ جاتی ہے اور وہ شکست کھا کر ٹوٹنے والوں میں سے نہیں تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو تیروں کے مقابل اپنا جگر آزماتے ہیں اور وقت نے ابھی ان کے لیے اپنے ترکش میں کچھ تیر بچا کر رکھے ہوئے تھے۔

❁ ❁ ❁

آج کالج کی چھٹی تھی سو مسرت جہاں شینا بھابھی کے ساتھ کچن میں مصروف تھیں۔ صبح صبح انہوں نے صابرہ کے ہمراہ پورے گھر کی خوب اچھی طرح جھاڑ پونچھ اور صفائی کی تھی۔ دن کے کھانے سے کچھ دیر پہلے ابا میاں اور بابر بھائی بھی واپس آ گئے تھے۔ گاڑی کا کافی نقصان ہوا تھا لیکن شبیر حسین شاہ مالی نقصانات کو کم ہی خاطر میں لاتے تھے۔ مسرت جہاں نے رسٹ واچ پر نگاہ دوڑائی۔ ایک بجنے والا تھا، ان کی منتظر نگاہیں کچن کی کھڑکی کے اس پار گیٹ کی طرف اٹھیں اور واپس پلٹ آئیں۔

''کیا بات ہے کسی نے آنا ہے.....'' شینا بھابھی نے ان کی نظروں کی چوری پکڑ لی۔

''نہیں تو..... آنا کس نے ہے؟'' مسرت جہاں جلدی سے بولیں۔

''میں نے سوچا شائد تمہاری کسی دوست نے آنا ہے۔ صبح سے تمہاری ان گھریلو مصروفیات سے میں نے اندازہ لگایا۔'' شینا

ہیں۔ کیا ماں باپ ایسے ہوتے ہیں جنہیں اولاد کی خوشی سے کوئی سروکار ہی نہ ہو۔ جنہیں اپنی ذات، صرف اپنی خوشی عزیز ہو اور بس کیا بھائی ایسے ہوتے ہیں جنہیں، بہنوں کا مان توڑتے ہوئے ایک پل کو بھی احساس نہ ہو۔

انسان ہیں یہ جو اپنے سوا ہر ایک کو حقیر سمجھتے ہیں۔ کیا یہ انسان کہلانے کے لائق ہیں، ایسی کونسی بڑی غلطی کر دی تھی اس نے محض رشتہ ہی تو مانگا تھا۔ کیا یہ اتنی بڑی خطاء ہے جس کی سزا موت ہو۔ مسرت جہاں جوں جوں سوچ رہی تھیں ویسے ہی ان کے دل میں اپنے گھر کے افراد کے لیے نفرت پیدا ہو رہی تھی، انہیں اپنے بھائی انسان نما حیوان دکھائی دے رہے تھے جو ان کی محبت کو قتل کرنے کے درپے تھے جنہیں ایک انسان کی زندگی سے صرف اس لیے بیر ہو گیا تھا کہ اس کے ہونٹوں پر ان کی بہن کا نام آ گیا تھا، ان کے دماغ میں سوچوں کا لاوا سا پکنے لگا۔ رات کا پہلا پہر تھا لیکن کسی نے ان کے دروازے پر آ کر ان سے کسی قسم کی بات کرنا گوارا نہیں سمجھی تھی۔ کسی ناسور کی طرح کاٹ کر انہیں پھینک دیا گیا تھا اور جب وہ جسم سے الگ ہو چکی تھیں تو پھر اس جسم کا دکھ اس کا درد بھی انہیں محسوس نہیں ہو رہا تھا وہ یونہی سوچوں میں گم بیٹھی تھیں جب ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ انہوں نے دیوار گیر گھڑی پر نگاہ ڈالی، ساڑھے گیارہ بجے رہے تھے، دوسری گھنٹی پر انہوں نے ریسیور اٹھا لیا۔

''ہیلو.....''

''ہیلو مسرت..... مسرت یہ تم ہو ناں''..... بے قرار لہجے میں سوال کیا گیا۔ مسرت جہاں کی سماعت کو یقین ہی نہ آیا۔

''فر..... فرجاد آپ.....'' وہ بس اتنا ہی کہہ سکیں۔ ''ہاں مسرت..... میں ہی ہوں..... تم..... تم ٹھیک تو ہو ناں۔''

''یہ سوال تو مجھے آپ سے پوچھنا چاہئے..... مجھے کیا ہونا ہے ٹھیک ہوں میں.....''

''مسرت! تمہارے ابا میاں کے سامنے دامن سوال دراز کرنے کی جرأت بہت مہنگی پڑی مجھے.....'' اس کا آزردہ لہجہ مسرت جہاں کو بھی دکھی کر گیا۔

''میں بہت کم حیثیت سہی مسرت جہاں لیکن اتنی حیثیت ضرور رکھتا ہوں کہ تمہیں زندگی کی ہر خوشی دے سکوں۔''

''فرجاد! یہ آپ مجھ سے کیوں کہہ رہے ہیں۔ میں نے کب تقاضا کیا ہے خوشیوں کا۔ میں تو صرف آپ کی محبت پا کر ہی بہت خوش تھی۔'' مسرت جہاں دھیمے لہجے میں بولیں۔

''لیکن تمہارے ابا میاں کو تمہارے لیے اعلیٰ نسب، خاندانی اور دولت مند شخص کا رشتہ چاہئے اور یہ تینوں چیزیں میرے پاس نہیں..... انہوں نے بہت حقیر سمجھا مجھے..... شائد دولت ہی ان کے نزدیک واحد معیار ہے انسان کو پرکھنے کا۔'' فرجاد کا لہجہ بکھرا ہوا تھا یقیناً جو سلوک اس کے ساتھ کیا گیا تھا وہ کم از کم اس کا مستحق نہیں تھا۔

''اب..... اب کیا سوچا ہے آپ نے؟'' مسرت جہاں بے چینی سے بولیں۔

''مسرت! تمہاری محبت سے دستبردار ہونا میرے لیے موت سے بھی بدتر ہے، مجھے ایسی زندگی نہیں چاہئے جس میں تمہاری

ڈائریکٹ اس سے اس کی آمد کی بابت پوچھا۔

''جی میرا نام فرجاد ملک ہے اور میں گورنمنٹ کالج میں فورتھ ایئر کا سٹوڈنٹ ہوں۔'' فرجاد ایک پل کو رک گیا۔ شبیر حسین شاہ کی پرسکوت سمندر کی طرح ٹھہری آنکھیں اس کے چہرے پر ٹک گئیں۔

''پھر.....'' اس لفظ ''پھر'' میں کیا کچھ پوشیدہ تھا۔ فرجاد کے لیے سمجھنا دشوار نہیں تھا۔

''سر مجھے آپ سے کچھ ضروری بات کرنی ہے؟''

''برخوردار جہاں تک میرا خیال ہے ہم تم سے پہلی بار مل رہے ہیں۔ تم کون ہو آج سے پہلے تک ہم نہیں جانتے تھے اور ہم کیا ہیں یہ شاید تم اچھی طرح نہیں جانتے۔ بہرحال کیا کسی قسم کی مالی معاونت چاہئے ہم سے۔'' اجنبیت کا بھرپور تاثر شبیر حسین شاہ کے ادا کیے ایک ایک لفظ سے مترشح تھا۔

''جی نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں۔''

''تو پھر کیا بات ہے!''

''میرا خیال ہے شاہ صاحب کہ اپنا مدعا بیان کرنے سے پہلے میں اپنا تھوڑا سا تعارف کروا دوں تو شائد میری بات سمجھنے میں آپ کو زیادہ آسانی ہو۔''

''بولو..... ہم سن رہے ہیں۔'' شبیر شاہ صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

''شاہ صاحب! میرے نام سے آپ کو آگاہی ہو چکی ہے اور یہ بھی آپ جان چکے ہیں کہ میں کیا کرتا ہوں۔ میرا تعارف بس اتنا سا ہے کہ میری زندگی اوپر والے کی رحمت کے پیش نظر ہے، بچپن سے ہی والدین کی شفقت سے محروم ہوں، زندگی میں جو کچھ کیا..... جو کچھ پایا..... اللہ کے بعد صرف اپنی ذاتی کوششوں سے پایا..... اور آج کسی قسم کی کمی نہیں ہے مجھے۔''

''تو برخوردار یہ سب تم ہمیں کیوں بتا رہے ہو۔'' ان کے سوال پر وہ ایک لحظہ کو خاموش ہو گیا۔ کچھ جھجک، کچھ ہچکچاہٹ نے چند ساعت اس کی زبان پر پہرہ بٹھا دیا پھر وہ بہت دھیمے لہجے میں گویا ہوا۔

''اس لیے شاہ صاحب! کہ میں ضروری سمجھتا ہوں کہ دامن سوال دراز کرنے سے پہلے آپ کو اپنے بارے میں آگاہ کروں۔ میں بہت اہم اور ضروری بات کرنے والا ہوں یقیناً آپ کے سامنے اس طرح بات کرنا مجھے زیب تو نہیں دیتا لیکن میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ میرے والدین حیات نہیں ہیں جو آ کر آپ سے بات کرتے۔ ممکن ہے آپ کو میری بات سن کر غصہ آ جائے لیکن شاہ صاحب! میں جو کچھ آپ سے کہنا چاہتا ہوں وہ ایسا غیر اخلاقی، غیر مہذب بھی نہیں جسے سن کر آپ بھڑک اٹھیں کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ آپ اس وقت جس مقام پر ہیں یہاں انسان عمر کے ہر حصے سے تجربات کشید کر چکا ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے آپ میری بات توجہ اور ٹھنڈے دل و دماغ سے سنیں گے۔ وہ بہت شائستگی سے اپنے ماضی الضمیر کو بیان کر رہا تھا۔

شبیر حسین شاہ کی جہاندیدہ نگاہیں اس کے چہرے پر لگی ہوئی تھیں۔

''دیکھو برخوردار! لفظ جب تک زبان پر نہیں آتے باحرمت ہوتے ہیں۔ جب ہونٹوں سے ادا ہو جائیں، بے وقعت اور حقیر ہو جاتے ہیں لہٰذا بولنے سے پہلے یہ سوچ لینا کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ تم کون ہو اور کس سے مخاطب ہو؟''

ان کی آنکھوں میں سکوت در آیا اور لہجے میں غضب کا ٹھہراؤ۔ چند لمحے سر جھکا کر خاموش بیٹھے رہنے کے بعد وہ جھجک آمیز لہجے میں بولا۔

''شاہ صاحب! میں..... میں آپ کی بیٹی مسر.....''

''بس'.....' انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ اس کی بات ادھوری ہی رہ گئی۔ شبیر حسین شاہ کا چہرہ شدت غیض و غضب سے سرخ ہو رہا تھا یقیناً ان کے اندر ایک جوار بھاٹا اٹھ رہا تھا۔

''تمہاری زبان پر ہماری بیٹی کا نام ایک بار بھی آئے ہم برداشت نہیں کرینگے۔'' ان کے لہجے میں سانپ جیسی پھنکار تھی۔

''شاہ صاحب! آپ میری پوری بات تو سنیں۔'' فرجاد نے مزید بولنا چاہا۔

''بس! جو سن لیا وہ کافی ہے۔ ہم ناسمجھ، نادان نہیں۔ تمہاری بات سننے سے پہلے ہی سمجھ چکے تھے کہ کیا کہنا چاہتے ہو تم..... اسے بھی بہت جانو جو تمہیں اتنا بولنے کی اجازت دے دی، گھر آئے ہوئے دشمن کو بھی ہم مہمان سمجھتے ہیں اور مہمانوں کے ساتھ بدسلوکی کرنا ہماری روایت نہیں۔'' شبیر شاہ نے اپنے غصے پر قابو پانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''شاہ صاحب! میری.....''

''بس میاں بس..... تمہاری بات ختم ہو گئی۔ ہمیں مجبور نہ کرو کہ ہم تمہارے ساتھ وہ سلوک کریں کہ تم اپنی ٹانگوں پر واپس نہ جا سکو.....'' وہ اس کی طرف سے رخ پھیر کر کھڑے ہو گئے اور ہاتھ کے اشارے سے اسے چلے جانے کو کہا۔ فرجاد ان سے محض دو قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔

''شاہ صاحب! میں نے صرف مسرت جہاں کا ہاتھ مانگا.....'' چٹاخ کی بھرپور آواز آئی اور لفظ جیسے اس کے حلق میں ہی اٹک کر رہ گئے۔ اس قدر بھرپور تھپڑ تھا کہ فرجاد دو تین قدم پیچھے کو لڑکھڑا گیا۔

''اوقات کیا ہے تمہاری..... نسب کیا ہے تمہارا..... اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو تمہیں تو یہ تک نہیں معلوم کہ تمہارا باپ کون تھا..... تمہاری ماں کون تھی۔''

''بس شاہ صاحب بس..... بہت سن لیا میں نے..... میں یتیم سہی..... کم حیثیت سہی..... آپ بلند نسب سہی لیکن دوسروں کو حقیر سمجھنے کا حق نہیں ہے آپ کے پاس۔'' فرجاد کو ان کے لہجے کا طنز کسی بھالے کی طرح دل میں کھبتا محسوس ہوا۔

''جب تم کسی کے دروازے پر جا کر سوال کرو گے تو اسے حق حاصل ہوگا کہ وہ تم سے پوچھے تو سہی کہ آخر تم ہو کیا.....؟ برخوردار

آئندہ جب کسی دروازے پر اس نیت سے سوال کے لیے جاؤ تو اپنی اوقات ضرور دیکھ لینا۔'' شبیر حسین شاہ کے لہجے کی حقارت اسے کسی تازیانے کی طرح لگی۔

''شاہ صاحب! آپ بہت بلندی پر ہیں..... مان لیا کہ اللہ نے آپ کو بہت اونچا مقام دیا ہے شائد اسی لیے اتنی بلندی سے میں آپ کو بہت چھوٹا اور حقیر دکھائی دے رہا ہوں لیکن اگر آج یہی سب کچھ میرے پاس ہوتا..... میں حیثیت میں آپ کے برابر ہوتا تو شائد آپ کا یہ اونچا قد میرے سامنے دب جاتا یا پھر آپ اتنی بلندی کی بجائے وہاں ہوتے جہاں میں کھڑا ہوں تو یقیناً آپ کو اتنا چھوٹا ہرگز دکھائی نہ دیتا۔''

''بکواس بند کرو اور دفع ہو جاؤ..... ہمارے ضبط کا اور امتحان مت لو۔'' انہوں نے غصے سے دھاڑتے ہوئے فرجاد کو بیرونی دروازے کی طرف دھکیلا تھا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا دروازے سے ٹکرایا اور سنبھلتے سنبھلتے بھی ایک دو قدم مزید پیچھے کو ہو گیا۔ دروازے کی دہلیز اب اس سے دو قدم کے فاصلے پر تھی۔ اس نے دونوں بازو دروازے کے پٹوں پر رکھتے ہوئے شبیر حسین شاہ کی طرف دیکھا۔

''شاہ صاحب! میں جو بات کہنے آیا ہوں وہ مکمل کر کے جاؤں گا۔'' ان کا سخت رویہ اس کی ضد کو اور پختہ کر رہا تھا۔

''تمہارا ایک لفظ بھی سننا ہمیں گوارا نہیں..... تم جیسے بے حیثیت اوقات سے گرے دو ٹکے کے شخص سے بات کرنا ہم اپنی توہین سمجھتے ہیں۔'' شبیر شاہ اس کے قریب چلے آئے۔

''نکلو یہاں سے..... اور آئندہ سادات نگر کی بلند و بالا دیواروں کی طرف نگاہ اٹھانے سے پہلے اپنے گریبان میں ضرور جھانک لینا۔'' انہوں نے دروازے کے پٹ پر دھرا اس کا ہاتھ نیچے کو جھٹکا۔

''شاہ صاحب! میں نے کہا ناں کہ میں بات پوری کیے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا۔''

''میں کہتا ہوں کیسے نہیں جاتے۔'' انہوں نے آگے بڑھ کر اسے دھکا دیا۔ اس بار وہ تقریباً گرتے گرتے بچا تھا۔ برآمدے کی دیواروں کے ساتھ ترتیب سے لگی کرسیوں سے ٹکرا کر وہ بمشکل خود کو گرنے سے بچا سکا۔ تھوڑے فاصلے پر وہیں برآمدے میں پانچوں کڑیل جوان بیٹھے ہوئے تھے۔ بوڑھے شیر کے دھاڑنے کی آواز بخوبی ان کی سماعت تک پہنچی تھی لیکن انہوں نے کوئی مداخلت نہیں کی۔ اب ڈرائنگ روم کے دروازے سے برآمد ہونے والے اجنبی کو بھی انہوں نے بہت غور سے دیکھا تھا اور شبیر حسین شاہ کا غضب سے بھرپور چہرہ بھی ان کے چہرے کے عضلات تن کر نقوش کو بگاڑ رہے تھے۔ آنکھوں میں نفرت کے انگارے دہک رہے تھے۔

''یہاں کتوں کا بھونکنا برداشت نہیں کیا جاتا۔ سادات نگر کا ایک اصول ہے کہ جو آنکھ اس گھر کی عزت کی طرف اٹھے نکال دو۔ اور تم..... تم ہماری عزت کے درپے ہو۔ ہم کیسے برداشت کر سکتے ہیں۔'' ان کے لہجے سے آگ بھڑک رہی تھی۔ اظہر، بابر، عارب، شاکر، شفقت پانچوں معاملے کی سنگینی کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن کسی میں اتنی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ آگے بڑھ کر ابا میاں سے پوچھ لے۔

''شاہ صاحب! کبھی کبھی اندھیر کوٹھڑیوں میں بھی روزن کھل جایا کرتے ہیں۔ بعض جذبوں میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ بلند

دیواریں بھی ان کی راہ میں حائل نہیں ہوسکتیں۔اجازت دیجئے۔'' وہ اپنی بات کہہ کر رکا نہیں تیزی سے بیرونی گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔شبیر حسین شاہ چوٹ کھائے ہوئے سانپ کی طرح بل کھا رہے تھے۔ پشت پر ہاتھ باندھے طویل برآمدے کے چکنے فرش کو بے رحمی سے روندتے ادھر سے ادھر ٹہلنے لگے۔

''زہرا خاتون.....مسرت جہاں.....'' ان کی آواز میں غضب کا اشتعال تھا جیسے آج ان کے سامنے جو چیز آئے گی وہ تہس نہس ہوکر رہ جائے گی۔ان کی بلند آہنگ آواز کسی آنے والے طوفان بلاخیز کا پتہ دے رہی تھی۔مسرت جہاں اور اماں بی، اپنی جگہ لرز کر رہ گئیں۔ دونوں نے ایک نظر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔مسرت جہاں کے دل کا چور انہیں سر جھکانے پر مجبور کر گیا۔اماں بی کی جہاندیدہ نظروں سے خود کو چراتی سمیٹتی وہ اٹھ کر برآمدے میں آگئیں۔شینا بھابھی اور معصوم بھابھی ابا میاں کے ڈر سے وہاں آنے کی بجائے کچن کے دروازے میں خاموش تماشائی بنی کھڑی سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔شبیر حسین شاہ نے مسرت جہاں کے چہرے پر نگاہیں گاڑ دیں۔ان آنکھوں میں شکوہ، ملامت، مان کی ٹوٹی کرچیاں، اعتماد اور بھروسے کی موت کا کرب کیا کچھ نہ تھا۔مسرت جہاں نے ایک نظر ان کے پرجلال چہرے کی طرف دیکھا اور پھر ان کی نگاہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے آنکھیں جھکا لیں۔

''بیٹھئے مسرت جہاں.....زہرا خاتون آپ بھی بیٹھیں۔'' شبیر حسین بدستور ٹہلتے ہوئے گویا ہوئے۔اماں بی کو تو ابھی تک ان کے اس ناقابل فہم رویئے کی سمجھ نہیں آئی تھی بہرحال وہ دونوں بیٹھ گئیں۔شبیر حسین شاہ کسی کو مخاطب کرنے کی بجائے عجیب کاٹ دار انداز میں مسرت جہاں کو گھورے جا رہے تھے۔

''ابا میاں آخر بات کیا ہے؟ آپ بتاتے کیوں نہیں۔'' شاکر حسین اپنی فطری عجلت پسندی کے باعث زیادہ دیر صبر نہ کر سکے۔

''اگر بات کہیں تو محض چند الفاظ ہیں لیکن ان کا پس منظر کس قدر تاریک ہے یہ شائد ہمارے سوا کوئی سمجھ نہ پائے، ہم مسرت جہاں سے تفصیلی بات کرنا چاہتے ہیں۔'' انہوں نے روئے سخن شاکر حسین سے مسرت کی طرف موڑ دیا۔مسرت جہاں کی آنکھیں ضرور جھکی ہوئی تھیں لیکن ابا میاں کے چہرے کے تاثرات کا انہیں اچھی طرح اندازہ ہو رہا تھا۔

''مسرت جہاں.....ہمارے منہ سے نکلے الفاظ آپ کی نظر میں کتنے معتبر ہیں۔''

''جی ابا میاں.....میں سمجھی نہیں.....''

''آپ اتنی نادان تو نہیں کہ سمجھ ہی نہ پائیں، ہم نے کیا کہا ہے.....ہم نے آپ سے یہ پوچھا ہے کہ ہمارے کہے الفاظ آپ کے نزدیک کیا حیثیت رکھتے ہیں۔'' ان کے لہجے میں سکوت تھا لیکن ایسا سکوت جو کسی آنے والے طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔

''ابا میاں! ہم نے ہمیشہ آپ کے کہے الفاظ کی حرمت کا پاس کیا ہے۔'' مسرت جہاں نے سر جھکائے جھکائے ہی جواب دیا۔

''آپ غلط کہہ رہی ہیں مسرت جہاں! ہمارے کہے لفظوں کو نامعتبر کیا ہے آپ نے.....کیا آپ بھول گئیں ہم نے کہا تھا مسرت جہاں! جس اجلے لباس میں آپ ملبوس ہیں ہم اس پر ذلت کا ایک چھینٹا بھی برداشت نہیں کرینگے۔کہا تھا ناں ہم نے۔'' شبیر حسین شاہ

مسرت جہاں سے مخاطب تھے لیکن ان کی کہی باتیں کسی حد تک ان کے بیٹوں نے سمجھ لی تھیں۔

''جج..... جی ابا میاں.....'' مسرت جہاں ہکلا سی گئیں۔ شبیر حسین شاہ کے منہ سے یہ بات سن کر اماں بی کا دل بھی سینے کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب کر ابھرا۔ ان کی نظریں مسرت جہاں کے چہرے پر ٹک گئیں۔

''ہوں..... اس کا مطلب یہ ہوا کہ سب کچھ جانتے بوجھتے آپ نے اپنے پاکیزہ دامن کو داغدار کیا۔ کیا آپ نے اس وقت سوچا نہیں کہ آپ کے دامن کی یہ سیاہی آپ کے بھائیوں اور باپ کی ناموس پر ایک طمانچہ ثابت ہوگی، ہم نے ایک ہلکے سے چھینٹے کی بات کی تھی اور آپ ذلت گھر میں ہی اٹھا لائیں۔''

''ابا میاں..... آخر یہ سب کیا ہے..... مجھ سے اب برداشت نہیں ہو رہا، صاف صاف بتائیں کیا مسئلہ ہے..... کیا ہوا ہے۔'' عارب بھائی کا ضبط جواب دے گیا۔

''دھیرج..... ہمیں پہلے مسرت جہاں سے پوچھنے دو۔ کیا یہی وہ تعلیم تھی جس کی خاطر انہوں نے احتجاج کیا تھا۔ زہرا خاتون نے حمایت کی تھی اور گھر کے سب افراد نے خوشی منائی تھی۔ مسرت جہاں کیا اپنے بعد آنے والوں کے لیے یہ زینہ چنا ہے آپ نے؟'' شبیر حسین شاہ انتہائی سخت مزاج سہی لیکن جوان اولاد خصوصاً بیٹی کے ساتھ کیا سلوک روا رکھنا چاہئے اس سے وہ اچھی طرح واقف تھے۔ اسی لیے ابھی تک ضبط سے کام لے رہے تھے حالانکہ یہ معاملہ ایسا تھا کہ جس پر ضبط کرنا ان کے لیے کسی کڑے امتحان سے کم نہ تھا۔

''ہم نے آپ سے کچھ پوچھا ہے مسرت جہاں! کیا سوچ کر آپ نے ایک کم ذات شخص کو اتنا حوصلہ دیا کہ وہ ہمارے مقابل آن کھڑا ہوا.....''

''ابا میاں..... ہم نے کچھ نہیں کیا..... ہمارا یقین کیجئے ہم نے ایسا کچھ نہیں کیا جس سے آپ کی یا ہماری عزت پر کوئی حرف آتا ہو۔'' مسرت جہاں بہت آہستگی سے صفائی دینے والے انداز میں بولیں۔

''ہم نے سوال کچھ اور کیا ہے مسرت جہاں! آپ سے پوچھے بغیر آپ کی مرضی کے بغیر وہ شخص اتنی جرأت نہیں کر سکتا کہ سادات نگر کی دہلیز پر پاؤں بھی رکھ سکے۔ کجا کہ آپ کا نام لینا..... خود سوچئے مسرت جہاں کسی اجنبی کی زبان پر آپ کا نام آئے، ہماری غیرت اسے زندہ زمین میں نہ گاڑ دے گی۔''

''بس ابا میاں! اب میری برداشت سے باہر ہو گیا ہے، میں سب سمجھ گیا ہوں۔ اب آپ کچھ نہ کہیں مجھ پر چھوڑ دیں۔ قسم سید کی اگر اب وہ کل کا سورج بھی دیکھ پایا تو۔'' عارب بھائی مارے طیش کے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''ٹھہرو.....'' شبیر حسین شاہ نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں رکنے کو کہا۔

''ابا میاں! اس نے کونسی قابل اعتراض حرکت کی..... محض رشتہ ہی تو مانگا ہے۔'' مسرت جہاں عارب بھائی کی بات سن کر برافروختہ ہوتے ہوئے بولیں۔

''اب بات جب زبان پر آ ہی گئی ہے تو میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ..... کہ میں بھی فرجاد سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔'' لفظ نہیں تھے کوئی بم تھا جو سادات نگر کے در و دیوار کو منہدم کرتا چلا گیا۔ ابا میاں مسرت جہاں کے چہرے پر نظریں ٹکائے عجیب انداز سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ بے یقینی اور بے اعتبار سے شائد انہیں توقع نہیں تھی کہ مسرت جہاں کے منہ سے ایسے الفاظ نکل سکتے ہیں۔

''بے حیا..... بے غیرت..... کیا بک رہی ہے۔'' اماں بی غصے کی شدت سے کانپتے لہجے میں بولیں لیکن مسرت جہاں نے جیسے یہ الفاظ ادا کر کے اپنے دل کا بوجھ اتار پھینکا تھا یہ سوچے بغیر کہ ان کا یہ بوجھ اس گھر کے مکینوں کی روحوں کو کس کرب سے ہمکنار کر گیا تھا۔ پانچوں بھائی مشتعل ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے، شدت غیض و غضب سے شائد ان کی زبانیں گنگ ہو کر رہ گئی تھیں۔ غیرت کسی لاوے کی طرح ان کے جسموں میں پکنے لگی، ان کے قدم اٹھے تو ماحول کا سکوت ٹوٹ گیا۔ وہ سب اپنے اپنے کمروں کی طرف گئے تھے اور جب واپس پلٹے تو پانچوں کے ہاتھوں میں آتشیں اسلحہ موجود تھا۔ مسرت جہاں، اماں بی، بھابھیاں اپنی اپنی جگہ لرز کر رہ گئیں۔ اس سے پہلے مسرت جہاں نے اپنے لیے کبھی کسی کی آنکھ میں نفرت یا غصہ نہیں دیکھا تھا لیکن اس وقت ہر دیکھنے والی آنکھ انہیں یوں گھور رہی تھی جیسے وہ کوئی بہت حقیر اور اپنے مقام سے گری ہوئی چیز ہوں۔

''ابا میاں..... ہم اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے..... اس کی زندگی یہیں تک تھی۔'' عارب بھائی نے کہا۔

''آپ ایسا ہرگز نہیں کرینگے.....'' مسرت جہاں نے جیسے تہیہ کر لیا تھا کہ آج باپ اور بھائیوں کے ضبط کی انتہا دیکھ کر دم لیں گی۔

''بکواس بند کرو تم اپنی..... تمہاری شہ پر وہ یہاں تک آیا۔ تم نے کیا سمجھا تھا ہم سب مرے ہوئے ہیں یا ہم نے ہاتھوں میں چوڑیاں پہن رکھی ہیں۔'' اظہر بھائی مشتعل لہجے میں بولے۔

''اظہر..... عارب..... بابر اندر رکھ آؤ یہ پستول اور بندوقیں..... ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔''

''ابا میاں! اس کے بعد کونسے وقت کے منتظر ہیں آپ..... اس شخص کی ہر آتی جاتی سانس اب ہم پر بار ہے۔'' بابر بھائی جیسے سرد مزاج شخص کا اشتعال بھی دیدنی تھا۔ شبیر حسین شاہ کے روکنے پر بھی وہ نہیں رک رہے تھے۔

''ابا میاں غلطی میری ہے تو سزا بھی مجھے ہی ملنی چاہئے۔'' مسرت جہاں نے کہا۔

''ٹھیک کہا تم نے..... ذلت کا بیج تو تم نے بویا ہے..... تمہیں، پہلے کاٹ کر پھینکنا چاہئے۔'' عارب بھائی نے ریوالور اس پر تان لیا۔ اماں بی کی سانسیں حلق میں اٹک گئیں۔

''یا الٰہی..... یہ میری آنکھیں کیا دیکھ رہی ہیں..... میری روح میں اتنی سکت نہیں ہے میرے مولا جو اس طوفان کا سامنا کر سکے تو معاف کر دے ہمیں اللہ! ہم اس آزمائش کے قابل تو نہیں ہیں۔'' ان کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

''عارب! کیا کر رہے ہو.....'' بابر نے عارب بھائی کا پستول والا ہاتھ نیچے کیا۔

''پہلے اس کی سانسوں کی ڈور کٹنی چاہئے جس نے ہماری عزت کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا۔'' وہ پانچوں ہتھیار لے کر گھر سے

باہر جانے لگے۔ مسرت جہاں اچھی طرح جانتی تھیں کہ اگر اس عالم میں وہ ان کے ہاتھ لگ گیا تو یقیناً اس دن کا ڈوبتا سورج اسے بھی اپنے ساتھ اندھیروں میں لے جائے گا۔ انہوں نے اپنا دوپٹہ اتار کر بھائیوں کے پیروں میں رکھ دیا۔ اماں بی کی روح لرز گئی۔

''بھائی! رک جائیں آپ سب..... معاف کر دیں اسے..... آئندہ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔''

''آئندہ کی کس نے دیکھی ہے..... آئندہ ایسا تب ہی ہوگا ناں جب تم اس گھر کی دہلیز سے باہر پاؤں رکھو گی۔'' سرد لہجے میں کہہ کر عارب بھائی آگے بڑھے۔ سفید براق دوپٹے پر پانچوں بھائیوں کے نقش قدم ثبت ہو گئے۔ شبیر حسین شاہ نے دوبارہ انہیں رکنے کو کہا لیکن وہ پانچوں سنی ان سنی کر کے آگے بڑھ گئے۔ مسرت جہاں نے جھک کر مٹی میں لتھڑا ہوا آنچل اٹھایا اور کسی قیمتی صحیفے کی طرح اپنے سینے سے لگا لیا۔

کسی کی طرف دیکھے بغیر وہ بہت خاموشی سے جا کر اپنے کمرے میں بند ہو گئیں۔ شبیر حسین شاہ نے اماں بی کے متفکر چہرے کو ایک نظر دیکھا اور بوجھل قدم اٹھاتے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

آج پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ ان کے بیٹوں نے ان کا کہا نہیں مانا تھا، ان کے روکنے پر وہ رکے نہیں تھے۔ غیرت و ناموس پر آنچ آ جائے تو انسان ضبط نہیں کر سکتا۔ وہ پانچوں بھی اسی جوش میں گھر سے نکلے تھے کہ فرجاد کو موت کی نیند سلا دیں جس کی وجہ سے پہلی بار ان کی بہن نے سر اٹھا کر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ابا میاں سے اور بھائیوں سے بات کی تھی۔ اعتراف کیا تھا کہ یہ سب کچھ اسی کی ایماء پر ہوا ہے پھر وہ اسے کس طرح چھوڑ دیتے۔

شبیر حسین شاہ ان کے جانے کے بعد سے اپنے کمرے میں بند تھے۔ اماں بی کے بار بار دروازہ بجانے پر بھی انہوں نے دروازہ نہیں کھولا تھا۔ گھر بھر پر سکوت مرگ طاری تھا جیسے اتنی وسیع و عریض حویلی ویران اور آسیب زدہ ہو، کوئی کھٹکا، کوئی صدا نہیں تھی، رات کا کھانا تیار تھا لیکن کسی نے روٹی کو ہاتھ تک نہ لگایا۔

اماں بی دوسرے کمرے میں سر جھکائے خاموش بیٹھی تھیں۔ ماضی کا ورق ورق ان کے سامنے تھا، کہیں کوئی کوتاہی ہی نہیں کی تھی انہوں نے۔ کسی معاملے میں بھی کوئی کچی ان سے سرزد نہیں ہوئی تھی پھر..... پھر مسرت جہاں کی تربیت میں ان سے کہاں غلطی ہوئی؟ کہاں کمی ہوئی.....؟ وہ سمجھنے سے قاصر تھیں، انہیں شبیر شاہ کی طرف سے بھی فکر لاحق تھی، رات ہو چکی تھی اور انہوں نے دروازہ نہیں کھولا تھا۔

ادھر مسرت جہاں سامنے بیڈ پر دوپٹہ پھیلائے اس پر بنے جوتوں کے نشان دیکھ رہی تھیں۔

''آج سے پہلے تک بڑا یقین تھا انہیں کہ وہ اپنے ماں باپ کی آنکھوں کا تارہ ہیں۔ بھائیوں کی لاڈلی ہیں لیکن جس طرح ان کے دوپٹے کو پیروں تلے روند کر ان کے بھائیوں نے ان کے مان کو کرچی کرچی کیا تھا اس سے ان کا دل بھر آیا تھا۔ ذہن میں اپنے گھر کے مکینوں کے خلاف سوچیں ابھرنے لگیں۔

یہ محبت بھرے چہرے کس قدر منافق ہیں، زندگی بھر کا ڈھونگ رچاتے رہتے ہیں اور آخر کار سود سمیت یہ محبت واپس لے لیتے

بھابھی چکن کڑاہی کا مصالحہ چکھتے ہوئے بولیں۔

''بریانی تمہارے ذمے ہے اماں بی کے طریقے سے بنانا..... ورنہ ہم سب تو مارے مروت کے کھا ہی لیں گے۔ شاکر نے ریکارڈ لگا دینا ہے تمہارا۔''

''اب ایسی بھی نکمی نہیں ہوں مانا کہ آپ جیسی بھابھیوں کی نندیں عموماً کوری رہ جاتی ہیں لیکن اماں بی نے سب کچھ سکھایا ہے مجھے۔'' مسرت جہاں دیگچی چولہے پر رکھتے ہوئے بولیں۔ ایک گھنٹہ مزید گزر گیا۔ کھانا تیار تھا سو ٹیبل پر لگا دیا گیا۔ گھر کے سبھی افراد کھانے پر جمع تھے۔ آپس کی باتوں کے دوران کھانا کھانے کے بعد ابا میاں نے قہوے کی فرمائش کر دی۔ صابرہ نے برتن اٹھا لیے اور قہوہ تیار کرنے کچن سدھار گئی۔

''بڑے شاہ جی! باہر کوئی آدمی آپ سے ملنے آیا ہے۔'' مالی فضل الٰہی نے ڈائننگ روم میں جھانک کر کہا۔ مسرت جہاں نے چونک کر سر اٹھایا۔

''کون ہے..... نام نہیں پوچھا اس کا؟'' شبیر حسین شاہ بولے۔

''پوچھا تھا جی پر..... مشکل سا نام تھا ذہن سے لے (اتر) گیا ہے؟'' مالی فضل نے شرمندگی سے سر جھکا کر کہا۔ شبیر حسین شاہ مسکرائے۔

''تمہارا بھی کوئی جواب نہیں فضل الٰہی..... شکر ہے تمہیں اپنا نام یاد رہتا ہے بہر حال اسے ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ ہم آتے ہیں۔'' ان کی بات سن کر فضل الٰہی باہر نکل گیا۔

''ابا میاں! کون ہو سکتا ہے؟'' اظہر چچا نے سوال کیا۔

''کوئی بھی ہو..... ملیں گے دیکھیں گے تو پتہ چلے گا کون ہے بہر حال تم لوگ آپس میں گپ شپ کرو ہم ذرا جا کر ملتے ہیں۔'' شبیر حسین شاہ اٹھ کر ڈرائنگ روم کی طرف چلے گئے۔

دروازے پر ہونے والے کھٹکے سے چونک کر اس نے سر اٹھا کر سامنے دیکھا اور صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ روشن چہرے پر سجی داڑھی، کنپٹیوں کے سفید بالوں نے انہیں بے حد بارعب اور پر تمکنت بنا دیا تھا، اونچے قد اور قد سے وزنی جثے کے مالک شبیر حسین شاہ اس عمر میں بھی قابل رشک صحت و وجاہت کے مالک تھے۔ ڈرائنگ روم کی پر شکوہ سجاوٹ اور نفاست، حویلی کی بلند و بالا دیواریں اسے کسی چیز نے متاثر نہیں کیا تھا لیکن پہلی بار شبیر حسین شاہ کو دیکھ کر جیسے ایک لمحے کو اس کے اندر کہیں کچھ ہوا تھا۔

''اسلام وعلیکم.....'' اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو انہوں نے رسمی سے انداز میں ہاتھ ملایا۔

''وعلیکم السلام۔'' ساتھ ہی اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی اس کے مقابل صوفے پر بیٹھ گئے۔

''جی برخوردار..... آپ کون ہیں اور کس سلسلے میں مجھ سے ملنا چاہتے تھے؟'' شبیر شاہ نے تمہید کو غیر ضروری سمجھتے ہوئے

محبت، تمہارا ساتھ نہ ہو، زندگی نے ہر بار مجھ سے دھوکا کیا، ہر بار خوشی میرے دروازے پر دستک دے کر لوٹ گئی۔ کیا میرا دل صرف دستکیں سننے کے لیے ہے کیا مجھے خوشیوں کی آرزو نہیں..... اور اس بار..... اس بار میں نے سوچ لیا ہے اس خوشی کو واپس پلٹنے نہیں دوں گا۔ تمہیں مجھ سے جدا کرنے کے لیے تقدیر کو بھی دانتوں، پسینے آ جائیں گے۔'' فرجاد کے لہجے میں جذبوں کی سچائی اور مسرت جہاں کو پانے کی تڑپ تھی اور وہ تو جیسے پگھل رہی تھیں، جذبوں کی تیز آنچ ان کے وجود کو جلا کر خاکستر کر رہی تھی، اس ٹوٹے ہوئے بکھرے ہوئے شخص کی محبت اتنی طاقتور ہو گئی کہ خون کے رشتوں کی صداقت پر غالب آ گئی۔

''فرجاد میں..... میں بھی آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی، آپ جو کہیں گے میں ویسا ہی کروں گی۔ بس، مجھ سے جدا مت ہوئیے گا۔ مجھے یوں راستے میں مت چھوڑیئے گا۔''

''مسرت! سو عیب ہوں گے مجھ میں..... مگر یہ ہرگز نہ سوچنا کہ کبھی تمہیں راہ میں چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ مجھے تمہارا ساتھ چاہیے زندگی بھر کے لیے..... تم..... تم ملی ہو تو زندگی مجھے زندگی لگنے لگی ہے۔ وگرنہ صرف سانس لیتا تھا۔ میں زندگی نہیں جیتا تھا..... ہر آنے جانے والی سانس دل کو اذیت دیتی تھی لیکن اب..... اب مجھے جینا اچھا لگتا ہے۔ تمہارے سنگ، تمہارے لیے۔''

لفظوں کی ٹھنڈی پھوہار مسرت جہاں کے محبت بھرے دل کو بھگو رہی تھی، انہیں ہر ذہنی اذیت و کوفت بھول گئی، ایک طمانیت رگ و پے میں دوڑ گئی۔

جب ایک محبت کرنے والا اپنی محبت کی تمام تر شدتیں ان پر لٹا رہا تھا ان کے بغیر جو ایک پل جینے کا روادار نہیں تھا تو پھر انہیں اور کیا چاہیے تھا ان کی آنکھوں کے سبزے پر خوابوں کی شبنم گرنے لگی۔

''مسرت! سیدھا راستہ اپنا کر تمہارے گھر والوں کے سامنے دامن سوال دراز کیا تھا لیکن بدلے میں سوائے تحقیر کے اور کچھ نہ ملا..... اگر کوئی امید ہوتی تو..... تو شائد میں بار بار تمہارے در پر دستک دیتا لیکن وہاں کے در و دیوار پتھر کے ہیں۔ میری صدا بس صدا بہ صحرا ہی ثابت ہو گی۔ اگر..... اگر تم ساتھ دو تو شائد ہماری محبت کو منزل نصیب ہو جائے۔''

''آپ جو کہیں گے اسی طرح کروں گی، بولیں مجھے کیا کرنا ہے!''

''مسرت! تمہیں اپنا گھر والدین اپنے خون کے رشتے ہر آرام ہر آسائش کو چھوڑ کر میرے ساتھ چلنا ہو گا، دنیا کے اس گوشے میں جہاں تمہارے سامنے صرف میری ذات ہو گی اور میرے لیے صرف تم..... جہاں محبتیں تقسیم ہونے کی بجائے صرف ہم دونوں کے بیچ رہیں گی اس گوشے کو ہم اپنے خوابوں اپنی آرزوؤں سے سجائیں گے۔ بولو مسرت ساتھ دو گی ناں میرا۔'' فرجاد محبت کی تمام تر شدت اپنے لہجے میں سموتے ہوئے بولا۔

مسرت جہاں تو پہلے ہی اس سرزمین اس گوشے کے سپنے دیکھ رہی تھیں۔

''ہاں..... میں ساتھ دوں گی آپ کا.....''

''سوچ لو مسرت! تمہیں ان سب محبتوں سے دستبردار ہونا پڑے گا صرف میری محبت کے لیے.....''

''فرجاد! مجھے بے غرض محبت چاہیے..... منافقت نہیں۔ ان رشتوں کے نزدیک میری خوشی کی کوئی اہمیت نہیں اور جب ان کے نزدیک میری ذات کی کوئی حیثیت نہیں تو پھر میں ان رشتوں کو اپنی محبت اپنی خوشی کی بھینٹ کیوں دوں۔ کس کی خاطر زندگی کو اپنے لیے آزاد بنالوں۔ ان لوگوں کی خاطر جنہوں نے میری محبت کو تحقیر و تذلیل کا نشانہ بنایا۔'' مسرت جہاں جذباتی لہجے میں بولیں۔

''ٹھیک ہے مسرت..... میں دو دن بعد فون کروں گا۔ تم ان اڑتالیس گھنٹوں میں خوب سوچ لو ایسا نہ ہو کہ بعد میں تمہیں یہ محبتیں رلائیں۔ تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکوں گا میں..... مجھے تمہاری خوشی عزیز تر ہے اور تمہارا ہر فیصلہ دل و جان سے قبول۔ اگر قدم روک لوگی تب بھی تمہیں مورد الزام نہیں ٹھہراؤں گا اور اگر ساتھ چل پڑوں گی تو اس یقین کو تمہارے ہمراہ کر دوں گا کہ منزل پر پہنچ کر تمہیں کبھی اپنی مسافت کے رائیگاں جانے کا افسوس یا پچھتاوا نہ ہوگا۔'' فرجاد پر یقین لہجے میں بولا۔

''اور ہاں یہ بتاؤ کل کالج آ رہی ہو.....''

''نہیں..... کالج آنے پر پابندی لگ گئی ہے۔ میں اپنے گھر کی دہلیز سے باہر پاؤں نہیں رکھ سکتی۔'' ان کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

''وہی روایتی رشتے، وہی روایتی رویے۔ وہ زہر خند لہجے میں بولا۔

''تم پریشان مت ہونا مسرت..... اپنا خیال رکھنا یہ سوچ کر تم میری امانت ہو..... دو دن بعد فون پر بات کروں گا۔''

''ایک منٹ فرجاد! آپ کل کالج مت جائیے گا۔'' مسرت جہاں کو جیسے کچھ یاد آ گیا۔

''کیوں.....؟''

''بھائی بہت غصے میں ہیں، آپ کے پیچھے نکلے تھے گھر سے مسلح ہو کر..... شکر ہے آپ ملے نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ وہ سکون سے نہیں بیٹھیں گے۔ آپ کی تلاش میں کالج ضرور جائیں گے۔''

''تو پھر.....؟''

''تو پھر یہ کہ اس اشتعال کی کیفیت میں آپ کا اور ان کا سامنا کچھ ٹھیک نہیں ہوگا۔''

''یعنی تمہارا خیال ہے کہ تمہارے وہ گھبرو جوان بھائی مجھے قتل کر دینگے۔'' فرجاد طنزیہ لہجے میں بولا۔

''مسرت جہاں اشتعال میرے اندر بھی ہے لیکن میں ہمیشہ سوچ سمجھ کر قدم اٹھاتا ہوں، میں کالج ضرور جاؤں گا، دیکھوں تو سہی کتنا دم ہے ان میں۔''

''نہیں فرجاد! ضد مت کریں آپ کو اپنی محبت کی قسم آپ کالج نہیں جائیں گے۔'' وہ ملتجی انداز میں بولیں کہ جانتی تھیں نازک دھاگے کے دونوں سروں کو طاقت سے کھینچنے کا نتیجہ ہمیشہ دھاگے کا ٹوٹنا ہوتا ہے۔ نقصان بھائیوں کا ہوتا یا فرجاد کا۔ اس کے لیے تو دونوں ہی کی اہمیت تھی۔ بے شک وہ ان سب کو چھوڑنے کا فیصلہ کر چکی تھیں لیکن ان کی جان تو نہیں لینا چاہتی تھیں۔ وہ سب زندہ رہیں۔ بس وہ ان

کے درمیان سے نکل کر اپنی الگ دنیا بسانا چاہتی تھیں۔

''مسرت! پہلے قدم پر ہی محبت کی بیڑیاں ڈال دیں تم نے میرے پیروں میں..... چلو ٹھیک ہے نہیں جاؤں گا.....'' فرجاد نے مسرت جہاں کی بات مان لی۔ پھر چند منٹ باتیں کر کے انہوں نے فون بند کر دیا۔

یہ شخص انہیں اتنا عزیز ہو گیا تھا کہ انہوں سے دوری کا سوچ کر بھی انہیں زیادہ ملال نہیں ہوتا تھا۔ البتہ اس کی باتوں سے اپنی مرضی کے معانی کشید کر کے وہ بہت پرسکون اور مطمئن ہو گئی تھیں۔ دو دن بعد جب وہ دوبارہ انہیں فون کرے گا تو کس قدر خوش ہو گا جب وہ اسے یہ بتائیں گی کہ وہ اپنے گذشتہ فیصلے پر قائم ہیں۔ وہ اس کے گھر کی چاندنی بننے کو تیار ہیں۔ اور تصور میں خوشیوں سے بھرا اس کا روشن چہرہ دیکھ کر وہ بھی مسکرا دیں۔

❁❁❁

آریان پکنک سے واپسی کے بعد سے کچھ خاموش ہو گئی تھی۔ پہلے اسے یہ خدشہ رہتا تھا کہ اگر اصلیت کا پتا اس گھر کے مکینوں کو لگ گیا تو وہ اس کا وجود ایک پل کو بھی برداشت نہیں کریں گے لیکن اب اسے ایک مضبوط سپورٹ مل چکی تھی۔ فواد شاہ اس گھر کے معتبر ناموں میں سے ایک نام تھا۔ وہ اس کے بارے میں سب کچھ جان چکے تھے۔ اور حیرت کی بات یہ کہ سب کچھ جاننے کے بعد ان کا رویہ اس کے ساتھ پہلے سے کہیں زیادہ نرم ہو گیا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ اس کا خیال رکھنے لگے تھے۔ لیکن اب اس کی سوچیں ہر لمحہ ایک خوف ایک ڈر کے زیر اثر رہنے لگی تھیں۔ ستارہ بیگم کے ہاتھوں کی پہنچ اس کی گردن تک ہو گئی تھی۔ اور کسی بھی لمحے وہ دوبارہ ان پتھروں کے بیچ محبوس ہو سکتی تھی جن سے بچانے کی خاطر اس کی ماں اور گھنگھرو بابا نے بہت تکلیف سہی تھی اور اب تک ہو رہے تھے۔ ''کیا فواد اسے ان لوگوں سے بچا سکتے ہیں۔ کیا ان کے گھر کے در و دیوار اتنے مضبوط ہیں کہ وہ درندوں سے چھپ کر یہاں پناہ لے سکے۔ وہ خود سے سوچتی اور الجھتی رہتی۔ اس میں ہمت نہیں تھی کہ وہ اس جگہ واپس جاتی جہاں سے وہ آئی تھی۔ ستارہ بیگم سے بھی وہ اچھی طرح واقف تھی۔ بڑے بڑے عہدیداروں، پولیس والوں کو اس نے ستارہ بیگم کے چرنوں میں ماتھا ٹیکتے دیکھا تھا۔ اسے گر آتا تھا مخالف ہواؤں کو اپنے حق میں کرنیکا۔ اور اس بار جو زخم اسے آریان کے فرار نے لگایا تھا وہ چوٹ کھائی ہوئی ناگن کی طرح غیض و غضب میں ہو گی اس کی سوچیں بہک کر ماں پر جا ٹکتی تھیں۔ لاکھ دامن بچانے کے باوجود کوئی نہ کوئی بات اسے اس کا ماضی یاد دلا دیتی تھی۔ وہ دوسرے بچوں پر ممتا لٹاتی ماؤں کو دیکھ کر نگاہوں کا زاویہ بدل لیتی کہ مبادا اس کی حرماں نصیبی کا سایہ ان پر نہ پڑ جائے۔

اس کی خاموشی اور دادرسی دور کرنے کو انیقہ اور روبیہ سوجتن کرتی رہتیں۔ وہ ان کے خلوص اور محبت کے زیر بار تھی اور ان کی تسلی کی خاطر ہنستی مسکراتی رہتی تھی۔ لیکن دل کا خوف جوں کا توں تھا۔ گھر کے سب ہی لوگ کسی دعوت میں شریک تھے۔ آریان اصرار کے باوجود نہیں گئی تھی کہ گیدرنگز سے اس کا دل گھبراتا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ اسے اپنی شخصیت کے بارے میں یا اپنے ماضی کے متعلق کوئی احساس کمتری تھا۔ وہ باشعور لڑکی تھی اور اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کا ماضی جو بھی تھا اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ جس پر اسے شرمسار ہونا پڑتا لیکن

بہت سارے لوگوں کے بیچ جانا اسے پسند نہیں تھا۔ پتا نہیں کیوں اسے یہ ہی لگتا تھا جیسے یہ لوگ تماش بین ہیں ایک دوسرے کے دکھوں، ایک دوسرے کے ڈھکے چھپے عیبوں کا اشتہار لگانے والے تماش بین۔

صابرہ اس کے لیے کھانا تیار کر کے اپنے کوارٹر میں چلی گئی تھی۔ مالی فضل اتنے بڑھاپے میں بھی قابل رشک حد تک تندرست تھا اور چاک و چوبند اپنے کام میں لگا ہوا تھا۔ آریان لاؤنج میں بیٹھی سوچوں میں گم تھی۔ انیقہ کی باتیں یاد کر کے آپ ہی آپ مسکراہٹ اس کے لبوں پر در آئی۔ انیقہ اور روبیہ کی دوستی نے کافی حد تک اس کے اندر کا کرب کم کر دیا تھا۔

کس قدر حاضر جواب اور فریش لڑکی ہے..... ہر وقت ہنستی مسکراتی۔ دوسروں کو ہنساتی۔" وہ انیقہ کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ اچانک فون کی بیل بجنے پر سوچوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ یونہی فریش موڈ کے ساتھ اس نے ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو....." سوچوں کا ہلکا سا خوشگوار شائبہ اس کے لہجے میں بھی در آیا تھا۔

"بہت چہک رہی ہو..... لگتا ہے خوب دل لگ گیا ہے تمہارا۔" کرخت طنزیہ آواز سن کر آریان جیسے سن ہو کر رہ گئی۔

"کک..... کون.....؟" بمشکل تمام اس کے حلق سے آواز نکلی۔ خوف کسی عفریت کی طرح اسے نگلنے کو بے چین ہونے لگا۔

"ارے رانی! ایسا بھی کیا انجان بننا..... نیا آشیانہ بن جائے تو پرانے ٹھکانے بھول جایا کرتے ہیں کیا۔" لہجہ اب بھی طنزیہ اور کسی حد تک تمسخرانہ تھا۔

"تت..... تم....." وہ خاموش ہو گئی۔

"بالکل ٹھیک پہچانا..... ہم وہی ہیں جنہیں پچھلے دنوں دیکھ کر تم بازار سے چھپ کر بھاگ نکلی تھی۔ لیکن دیکھوں ہمارے لمبے ہاتھ..... تمہارے یار کے گریبان تک پہنچ گئے۔ ویسے مرغا بڑا اکھڑا اکھڑا سا ہے تم نے..... پر رانی جی! ہم بھی کچھ ایسے گئے گزرے نہیں آزما کر تو دیکھتی۔"

"تم..... تم بکواس بند کرو اپنی....."

"واہ..... تڑی دینے لگ گئی ہو..... ہاں بھئی دیوار چین پر بیٹھ کر تو کوا بھی خود کو عظیم سمجھتا ہے۔ تمہارے اردگرد شرافت کی بڑی مضبوط دیواریں ہیں۔ لیکن شاید تم جانتی نہیں ہو کہ یہی دیواریں بدنامی کا ہلکا سا دھکا بھی نہیں سہہ سکیں گی اور ریت کی دیواروں کی طرح ڈھے جائیں گی۔"

"دیکھو..... تمہاری دشمنی مجھ سے ہے۔ ان لوگوں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟" آریان روہانسی ہو چلی تھی۔ خود کو جس قدر بھی مضبوط سمجھ لیتی تھی تو وہ ایک کمزور اور بے سہارا لڑکی۔ حالات کی کڑی تمازت میں تنہا جھلسنا اس کا مقدر تھا۔

"نہ نہ..... رانی..... رونا مت..... ہمارے دل کو تکلیف ہوتی ہے۔ تم سے ہماری دشمنی کہاں ہے ارے ہم تو دل ہارے بیٹھے ہیں تم پر....." وہ کمینگی پر اتر آیا تھا۔ آریان جیسے خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔

''وہ ڈاکٹر..... بڑا بھلا سا نام ہے اس کا..... بڑی تڑیاں لگا رہا تھا ہمیں۔ کہ خبردار جو آریان کا نام بھی تمہاری گندی زبانوں پر آیا۔ ایک تو یہ بہت بری بات ہے یہ شریف زادے غصے میں بڑی جلدی آجاتے ہیں۔ مجبوراً ہمیں اس پر ہاتھ اٹھانا پڑا۔ بہرحال اگر تم ہمارا ساتھ دو گی اور جس طرح ہم کہیں گے اسی طرح کرو گی تو تم تمہارے ارگرد رہنے والے افراد کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائیں گے۔''

''اور..... اور اگر میں ایسا نہ کروں تو.....؟'' آریان ہر قسم کے امکان پر غور کرنا چاہتی تھی۔

''تو..... دوسری جانب چند ثانیے خاموشی رہی پھر وہ گویا ہوا۔

''تو رانی جی! اس گھر کی چار دیواری میں آپ کے علاوہ دو اور لعل بھی ہم نے چمکتے دیکھے ہیں۔ ستارہ بیگم کے کوٹھے پر انگوٹھی میں نگینے کی طرح فٹ ہو جائیں گے۔ ہمارا کیا ہے۔ تین تین کے دام کھرے کر لیں گے اور کیا.....''

''نہیں..... نہیں..... تم..... تم ایسا نہیں کرو گے۔ دیکھو تم ایسا مت کرنا ہم سیاہ نصیبوں کی تو قسمت میں ہی یہ زندگی لکھی ہے ان اجلے لوگوں کو میلی نظر سے بھی مت دیکھنا..... ٹھیک ہے میں دو دن بعد تمہیں بتاؤں گی۔ لیکن وعدہ کرو تم ایسا کچھ نہیں کرو گے جس سے ان لوگوں کی عزت پر کوئی حرف آئے۔''

''ارے رانی! بڑا پیار پال لیا چند دنوں میں..... خیر ہمیں تو تم چاہئے ہو ہر قیمت پر۔ تم ہماری مان لو..... ہم تمہاری مان لیں گے۔ دوسری طرف سے کہہ کر فون بند کر دیا گیا۔ آریان نے ریسیور کو کان سے ہٹا کر یوں گھورا جیسے سامنے وہی شخص کھڑا ہو۔ ہلکا سا کھٹکا ہوا تو وہ تیزی سے ریسیور رکھ کر پلٹی۔ لاؤنج کے دروازے سے فواد اندر آرہے تھے۔ آریان کا دل دھک سے رہ گیا کہ کہیں خدانخواستہ انہوں نے اس کی بات نہ سن لی ہو۔ لیکن ان کے سپاٹ چہرے سے اسے کسی قسم کا اندازہ نہیں ہوا۔

''آریان..... آپ نہیں گئیں دعوت پر.....'' انہوں نے اپنے کمرے میں جانے کی بجائے لاؤنج میں ہی صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس سے پوچھا۔ جو دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں چٹخاتی مضطرب سی دکھائی دے رہی تھی۔ فواد نے بڑے غور سے اس کے چہرے کو دیکھا۔

''ابھی بہت معصوم ہو تم..... اندر کے احساسات چھپانے نہیں آتے تمہیں..... پھر کیوں خود پر جبر کرتی ہو..... کھل کر کر بات کہہ کر مطمئن کیوں نہیں ہو جاتی۔'' فواد سوچ رہے تھے لیکن انہوں نے اس سے کچھ نہیں کہا۔

''وہ دراصل مکس گیدرنگ مجھے پسند نہیں۔'' اس نے جیسے رٹا رٹایا جملہ دھرا دیا۔

''ہوں..... ان کی آنکھیں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور وہ اندر ہی اندر جز بز ہو رہی تھی۔

''آپ کچھ پریشان لگ رہی ہیں.....؟''

''نن..... نہیں تو.....'' ان کے جملے پوچھنے پر وہ گھبرا گئی۔

''آریان! میرا خیال ہے گذشتہ چند دنوں میں کم سے کم ہمارے درمیان اتنی دوستی ضرور ہو چکی ہے کہ آپ اپنی پریشانی اپنی کوئی تکلیف بلا جھجک مجھ سے شیئر کر سکیں۔''

''جج.....جی.....'' وہ سر جھکا کر بولی۔

''تو پھر وہ بات بتا دیجئے جو آپ کو پریشان کر رہی ہے۔ آپ کی اضطراری کیفیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ بات معمولی نہیں ہے۔

''فواد اسے دھیرے دھیرے اپنے ٹریک پر لا رہے تھے۔

''آپ.....آپ یوں ہی پریشان ہو رہے ہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ بس امی یاد آ جاتی ہیں۔''

''آریان! آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ اپنے چہرے کے تاثرات نہیں چھپا سکتیں۔ امی کے یاد آنے پر آپ اداس ہو سکتی ہیں پریشان اور خوف زدہ نہیں۔''

''یا الٰہی.....یہ شخص کیا تاثرات کا پوسٹ مارٹم کرنے لگ جاتا ہے۔ آنکھیں ہیں یا ایکسرے مشین بندہ کچھ چھپا نہیں سکتا۔ وہ جھنجھلا کر رہ گئی۔

''ٹھیک ہے.....آپ نہیں بتانا چاہتیں تو آپ کی مرضی.....'' وہ اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگے۔

''ایک منٹ ٹھہریئے پلیز.....'' آریان کم سے کم ان جیسا ہمدرد کھونا نہیں چاہتی تھی۔

''ابھی ابھی ستارہ بیگم کے ایک آدمی کا فون آیا تھا.....وہ اب مجھے دھمکیاں دے رہے ہیں کہ میں خاموشی کے ساتھ ان کا کہنا مان لوں اور اسی غلاظت کی دلدل میں واپس چلی جاؤں۔ جہاں سے اپنا آپ بچا کر اتنی اذیتیں کاٹ کر میں یہاں تک پہنچی ہوں۔'' وہ سر جھکا کر بولی۔

''مثلاً کیا دھمکیاں دے رہے ہیں وہ.....'' فواد گہری سنجیدگی سے بولے۔

''وہ.....وہ اس گھر کے مکینوں کو کسی بھی قسم کا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ وہ لوگ بہت طاقتور ہیں بہت وسائل ہیں ان کے پاس.....''

''پھر.....آپ نے کیا سوچا؟'' فواد بھرپور توجہ سے اس کی بات سننے کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے کو بھی بغور دیکھ رہے تھے۔

''مم.....میں.....میں نے ابھی کچھ نہیں سوچا۔'' آریان یہ نہ کہہ سکی کہ اس نے ان کے ہمراہ جانے کا فیصلہ کر لیا ہے اس لیے کہ اس خاندان کی عزت اور شرافت پر اس کی وجہ سے کوئی حرف آئے یہ وہ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

''آریان! ایک بات تو طے ہے کہ اب آپ وہاں نہیں جائیں گی۔ اس گھر میں آنے کے بعد آپ ہماری عزت ہیں اور ہم اتنی جرأت رکھتے ہیں کہ اپنی عزت کی طرف ٹیڑھی آنکھ سے دیکھنے والے کو اس حال کو پہنچا سکیں کہ دوبارہ وہ کسی کی طرف دیکھنے کے قابل ہی نہ رہے۔ سو یہ خوف اپنے ذہن سے نکال دیں۔ باقی رہا یہ سوال کہ وہ بہت طاقتور ہیں اور اس گھر کے مکینوں کو وہ کسی قسم کا کوئی نقصان پہنچائیں گے.....تو یہ بات بھی میں آپ پر واضح کر دوں کہ وہ ایسا کر کے دیکھ لیں انجام ان کے حق میں کس قدر بھیانک ثابت ہو سکتا ہے یہ وہ سوچ بھی نہیں سکتے۔'' فواد کا ٹھہرا ہوا لہجہ اور مطمئن انداز کسی حد تک آریان کو بھی طمانیت بخش گیا اس کا خوف کہیں دور جا سویا۔

''آریان! اپنی سوچوں پر خوف کو مسلط نہ ہونے دیں۔ خوف انسان کی شخصیت کو مسخ کر کے رکھ دیتا ہے اس کے اعتماد کو ختم کر دیتا ہے۔ اور میں آپ کی شخصیت کو اس کے تمام تر حسن سمیت دیکھنا چاہتا ہوں۔'' فواد دھیمے لہجے میں کہہ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ اور آریان ان کے کہے لفظوں پر غور کرنے لگی۔

''اس شخص کے حوالے سے خواب دیکھنا اب آنکھوں کو بہت اچھا لگنے لگا تھا۔

وہ عامیانہ اور فضول گفتگو نہیں کرتے تھے۔ لیکن چند لفظوں کا چناؤ بھی آریان کو بہت جامع محسوس ہو رہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا اس کے اردگرد فواد کی محبت کا نادیدہ لیکن اتنا مضبوط حصار تن چکا ہے کہ بیرونی حوارث جسے چھو تو سکتے ہیں لیکن توڑ کر اس تک پہنچ نہیں سکتے۔ وہ اس کے لیے۔

؎ کبھی نہ ٹوٹنے والا حصار بن جاؤں
وہ میری ذات میں رہنے کا فیصلہ تو کرے

کی مکمل تفسیر بن چکے تھے اور آریان نے ان کی ذات میں رہنے کا فیصلہ دل سے کر لیا تھا۔

❁ ❁ ❁

سادات گھر خزاؤں کی زد میں آ چکا تھا نہ جانے کس کی نظر ہنستے مسکراتے چہروں کی تازگی چھین کر لے گئی تھی۔ ابا میاں مکمل طور پر ساری دنیا سے لاتعلق ہو کر گوشہ نشین ہو چکے تھے۔ اماں بی بھی زیادہ تر اپنے کمرے میں ہی خاموش پڑی رہتیں۔ شینا بھابھی، مقسوم بھابھی بھی لگے بندھے روٹین کے کام نمٹا کر اپنے اپنے پورشن میں چلی جاتیں۔ زاہدہ چچی بچوں سمیت میکے میں تھیں اسی لیے سادات نگر پر ٹوٹنے والی مصیبت کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھیں۔ صرف مسرت جہاں تھیں جو اپنے کمرے میں بیٹھی جانے کیا کیا سوچتی رہتی تھیں۔ پچھلے دو دنوں سے اپنے ساتھ پیش آنے والے رویے نے انہیں اور بھی اس گھر اور اس کے مکینوں سے بددل کر دیا تھا۔ ان کے بھائی فرجاد کو تلاش کرتے رہنے کے بعد اب مایوس ہو گئے تھے لیکن مسرت جہاں کے ساتھ انہوں نے کوئی بھی بات کرنا گوارا نہیں کی تھی۔ اور وہ جو ہر ایک سے لاڈ اٹھواتی تھیں۔ اپنے ساتھ یہ سلوک ان سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ رات کو جب فرجاد ملک کا فون آیا تو وہ جیسے بھری ہوئی تھیں اپنے گھر والوں کے خلاف۔ انہوں نے فرجاد کی بات تسلیم کر لی۔ جن اپنوں نے انہیں یوں بے اعتمائی اور بے اتفاقی کے پتھروں سے سنگسار کرنا شروع کیا ہوا تھا۔ ان کے لیے اپنی محبت کی قربانی دینا ان کے نزدیک ایسے ہی تھا کہ کسی اجنبی کی خاطر دامن میں انگارے بھر لیں۔ اس وقت ان کی سوچیں بغاوت کی آخری حدوں کو چھو رہی تھیں۔ انہوں نے سادات نگر کی دہلیز پار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ فرجاد ملک نے دو تین بار ان سے پوچھا تا کہ زندگی کے کسی موڑ پر وہ اسے موردِ الزام نہ ٹھہرائیں۔ لیکن ہر بار مسرت جہاں کا جواب اثبات میں تھا۔ فرجاد نے ان سے چند دن کی مہلت مانگی۔ کچھ کام تھے جو اسے نمٹانے تھے۔ کچھ قرض تھے اس کی جان پر جو اسے ادا کرنے تھے۔ وہ مسرت جہاں کے ہمراہ یہاں سے جاتے ہوئے کوئی بوجھ اپنے سینے پر لیکر نہیں جانا چاہتا تھا۔ سو اپنا کام مکمل کرنے کے لیے اسے چند دن چاہئے

تھے۔ مسرت جہاں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔

تین دن گزر گئے..... چوتھے دن کا سورج طلوع ہوا تو مسرت جہاں کا انتظار شروع ہو گیا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ ساتھ ان کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ جو کچھ وہ کرنے جا رہی تھیں آج تک ان کے پورے خاندان میں ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ شاید سادات گھرانوں کی لڑکیوں کو گھٹی میں گھول کر یہی پلایا جاتا ہے کہ خود پر جبر کیے جاؤ..... جبر کرتی رہو اور ایک ایک سانس اذیت کے پل صراط پر پنجوں کے بل کھڑے ہو کر گزار دو۔ مسرت جہاں نے اپنا آپ آج ان لڑکیوں سے الگ کر دیا تھا۔ انہوں نے جبر کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے تھے۔ بلکہ اس کے خلاف تن گئی تھیں۔ اپنی خوشیوں کی سربلندی کی خاطر اپنے بات اور بھائیوں کی جھکی ہوئی گردنیں بھی انہیں دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ بس خوابوں کی ایک سرزمین ہے جہاں کا ہر رنگ جدا ہے جہاں آرزوؤں کے خوش نما پھول ہیں اور جذبوں کے جل ترنگ بجاتے آبشار اور چشمے۔ مسرت جہاں کی آنکھوں کے انتظار کے دیپ روشن تھے۔ پانچواں پھر چھٹا اور پھر ساتواں دن بھی گزر گیا۔ ان کا دل پسلیوں کی کمزور دیواروں کے بیچ سر ٹکرانے لگا۔

''فرجاد! ایسا کونسا کام ہے جس میں مصروف ہو کر آپ بھول گئے۔ اس کو جسے انتظار کی سولی پر لٹکا رکھا ہے۔'' ان کے پاس فرجاد کا کانٹیکٹ نمبر نہیں تھا۔ کہ اس سے بات کر کے وہ کچھ تسلی کر لیتیں اس لیے بھی وہ زیادہ پریشان تھیں۔

''محبت کا رشتہ بہت مضبوط ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی باریک دھاگے کی طرح نازک بھی جس کے ٹوٹنے کا پتا بھی نہیں چلتا..... ایک محبت کی خاطر میں نے اپنے پاس موجود ساری محبتیں سارا مان کھو دیا ہے۔ اور۔ اور اگر اب وہ محبت بھی مجھ سے منہ موڑے تو.....'' اس سے آگے سوچنا ان کے لیے سوہان روح تھا۔ محبت کا لمس کتنا حیات آفریں ہوتا ہے یہ احساس کہ اس دنیا میں آپ کسی کے لیے اتنے اہم ہیں کہ اگر اس کی زندگی میں آپ نہ ہوں تو زندگی اس کے لیے بیکار اور بے مصرف ہو کر رہ جائے گی۔

مسرت جہاں کو بھی فرجاد کی محبت کچھ ایسی ہی لگی تھی۔ انہیں فرجاد نے یہ احساس دلایا تھا کہ اس کی زندگی کی واحد خوشی اور ضرورت مسرت جہاں ہیں اور بس محبت کے اسی یقین نے انہیں سر اٹھانے کی ہمت عطاء کی تھی۔ اسی مان کے سہارے وہ اتنا بڑا قدم اٹھانے کو تیار ہو گئیں۔ جو سادات نگر کے باسیوں کے لیے ذلت و رسوائی کا پیامبر ثابت ہونے والا تھا۔ لیکن اب انتظار کرتے کرتے ان کی آنکھیں تھکنے لگی تھیں۔ آٹھ دن بیت چکے تھے اور فرجاد کا کہیں کوئی پتا نہیں تھا۔ نواں دن گزرا اور پھر دسواں دن آ گیا۔

''کیا وہ پیچھے ہٹ گیا..... محبت نبھانے کا حوصلہ نہیں تھا اس میں؟'' مسرت جہاں اپنے دل سے سوال کر رہی تھیں۔

''نہیں فرجاد ایسا شخص نہیں جو ڈر جائے..... کوئی اور مسئلہ بن گیا ہوگا..... کسی الجھن میں پھنس گیا ہوگا۔ وہ میری محبت سے کبھی دستبردار نہیں ہو سکتا۔'' یقین نے دل میں سر اٹھایا۔ لیکن وہ آنکھوں کی دکھن اور تھکن کا کیا کرتیں جو انتظار کی چوکھٹ پر دھرے دھرے اب نیم جاں ہو چکی تھیں۔ کس قدر اذیت تھی اس انتظار میں..... کتنا کرب تھا ان لمحوں میں جو وہ امید اور ناامیدی کے درمیان مصلوب ہو کر گزار رہی تھیں۔ دل میں اٹھتے ہزاروں وسوسے اور وہم ان کی امیدوں کو توڑنے کی کوشش میں لگے رہتے۔ لیکن وہیں کہیں موجود محبت کی

سچائیاں اس ادھ موئی امید کو پھر سے زندہ کر لیتیں۔ مسرت جہاں گھر سے بالکل تعلق ہو چکی تھیں۔ اور شاید خود سے بھی۔ ان کا مطمع نظر صرف فرجاد کا انتظار تھا اور بس۔ فقط شینا بھابھی گھر میں واحد ہستی تھیں جو ان کی دل جوئی کرنے کی کوشش کرتیں۔ ان کے کھانے پینے کا خیال رکھتیں۔ لیکن عارب بھائی سے چھپ کر..... کیونکہ جب سے مسرت جہاں نے بھائیوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر فرجاد سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ اس دن سے وہ عارب شاہ کے دل سے اتر گئی تھیں۔ اس لیے وہ خود ان کا ذکر کرنا یا سننا پسند کرتے تھے اور نہ ہی شینا بھابھی کو اجازت تھی کہ مسرت جہاں سے ہم کلام ہوں۔ لیکن وہ عارب شاہ کی عدم موجودگی میں مسرت جہاں کا خصوصی خیال رکھتی تھیں۔ شاید وہ اپنی فطری نیک دلی اور حساسیت سے مجبور تھیں۔ اور یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ گھر والے سارے ہی مسرت جہاں کے خلاف تھے لیکن شینا بھابھی کا خیال یہی تھا کہ مسرت جہاں کی زندگی کا فیصلہ کرتے ہوئے ان کی خوشی کا خیال رکھنا گھر کے بڑوں کی ذمہ داری ہے۔ لیکن ان کے خیال کو کس نے کیا اہمیت دینی تھی۔ بہر حال مسرت جہاں کے ساتھ گھر میں صرف شینا بھابھی کا تھوڑا بہت رابطہ رہتا تھا۔ دسواں دن ڈھل گیا رات کی سیاہی نے آسمان پر چاروں اور اپنے پنکھ پھیلا لیے تھے مسرت جہاں بستر پر گھٹنوں میں منہ دیئے بیٹھی تھیں۔ بنا کمبل لیے اتنی شدید سردی میں وہ یوں بیٹھی ہوئی تھیں جیسے ان پر موسم کی شدتیں اثر ہی نہ کر رہی ہوں۔ وہ ذہنی، قلبی، روحانی اور جسمانی ہر اعتبار سے توڑ پھوڑ کا شکار تھیں۔ انتظار کی انتہا ہو چکی تھی دل اور دماغ کی جنگ کے بیچ وہ نڈھال ہونے لگے تھیں۔

"فرجاد..... بس ہمقدم ساتھ چل کر تھک گئے..... اتنی ہی ہمت تھی آپ میں۔ ارے میں تو آپ کے ساتھ خار زاروں اور پتھریلے راستوں کی ہم سفر بننے کو بھی تیار تھی پھر کیا سوچ کر آپ نے قدم پیچھے ہٹا لیے۔ کیا سوچ کر مجھے یوں تنہا چھوڑ دیا۔ میں نے سب کی نظروں میں گر کر جینا گوارا کر لیا لیکن آپ سے دور ہو کر جینا..... نہیں..... مجھے ایسی زندگی نہیں چاہیے۔ وہ دل ہی دل میں خود سے ہم کلام تھیں۔ جب کمرے کی خاموش فضا میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ انہوں نے کوئی توجہ نہ دی۔ سوچوں کے خاروں میں الجھتے ہوئے ان کے حواس بالکل ہی نیم مردہ سے ہو چکے تھے۔ تیسری بیل پر انہوں نے طوعاً و کرہاً ریسور اٹھا لیا۔

"ہیلو....." اکتاہٹ آمیز لہجے میں گویا ہوئیں۔

"مسرت..... میں..... میں فرجاد....." دوسری طرف سے حیات آفریں آواز ان کی سماعت میں اتر کر جیسے ان کی روح کو زندہ کر گئی۔

"فر..... فرجاد..... آپ..... آپ بہت سنگدل ہیں..... اتنے دل آپ کو میرا خیال تک نہ آیا..... یہ بھی نہ سوچا کہ میں کس قدر اذیت میں دن گزار رہی ہوں گی۔" مسرت جہاں جیسے پھٹ پڑی۔

"مسرت..... آئی ایم ریئلی سوری..... لیکن میں نے تمہیں بتایا تو تھا کہ چند دن لگ جائیں گے۔"

"لیکن ان چند دنوں میں اپنی خیریت بتانے کے لیے میرا احوال پوچھنے لیے آپ کم سے کم فون تو کر سکتے تھے۔"

ہاں یہ غلطی ضرور مجھ سے سرزد ہوئی۔ بہر حال اس وقت کیا کر رہی ہو تم۔"

''آپ کے فون کی ہی منتظر تھی.....فرجاد.....زندگی میں میں نے کبھی کسی کا انتظار نہیں کیا.....لیکن ان دس دنوں میں انتظار کے جب کرب سے میں گزری ہوں میں چاہوں بھی تو نہیں بیان کر سکتی۔'' مسرت جہاں بھیگے لہجے میں بولیں۔''

''میں جانتا ہوں۔ انتظار کی اذیت کو مجھ سے زیادہ کون جان سکتا ہے۔ زندگی بھر انتظار ہی تو کیا ہے۔ خوشیوں کا، سکون کا، آسودگی کا اور.....اور تمہارا۔ لیکن اب یہ انتظار ختم ہو جائے گا۔ تم جب میری زندگی میں آجاؤ گی ناں تو سب کچھ مل جائے گا مجھے، تمہارا ساتھ خوشیاں بھی، سکون اور آسودگی بھی۔'' فرجاد ترنگ میں بولتا چلا گیا۔ مسرت جہاں اس کے لفظوں کے زیر و بم میں الجھ کر اس سے مزید شکوہ نہ کر سکیں۔ وگرنہ ان دس دنوں کی ساری کوفت سارا کرب اس پر انڈیل دیتیں۔

''فرجاد.....'' مسرت جہاں نے اسے پکارا۔

''ہوں.....'' وہ جیسے کسی سوچ میں گم تھا۔

''ہم یہاں سے کہاں جائیں گے۔'' عجیب بچوں جیسے اشتیاق بھرے لہجے میں انہوں نے پوچھا۔

''اتنی بڑی زمین پر، کہیں نہ کہیں تو ہوگا وہ گوشہ جہاں ہم نے اپنی دنیا بسانی ہے۔ اتنے دن تمہیں بے وجہ انتظار نہیں کروا تا رہا میں.....اپنا فلیٹ بیچ کر میں نے دوسری جگہ ایک چھوٹا سا مکان خریدا ہے۔ اس کی خرید و فروخت اور سیٹنگ میں کچھ وقت لگ گیا۔ بنک اکاؤنٹ ٹرانسفر کروا دیا ہے۔ ظاہری بات ہے اتنا بڑا قدم اٹھا کر ہم اس شہر میں تو نہیں رہ سکیں گے۔

مجھے تمہارے بھائیوں کا تو کوئی خوف نہیں لیکن تمہارا خیال ہے.....اس لیے ہم یہاں نہیں رہیں گے۔'' فرجاد نے اس دنوں کے دوران اپنی ساری مصروفیت کا جواز مسرت جہاں کے گوش گزار کیا۔ مسرت جہاں بھی کچھ مطمئن ہو گئیں۔

''اس وقت دس بج رہے ہیں ٹھیک ایک بجے میں تمہارے گھر کی عقبی دیوار کے قریب تمہارا انتظار کروں گا۔ بہت خیال اور دھیان سے محتاط ہو کر.....یہ سوچ لینا کہ اگر اس قدم کی بھنک بھی کسی کو پڑ گئی تو پھر شاید ہم زندگی بھر نہ مل سکیں۔'' فرجاد نے کہا۔

''ٹھیک ہے.....میں ایک بجے پہنچ جاؤں گی۔'' مسرت جہاں نے کہا تو فرجاد نے فون بند کر دیا۔ یقیناً اسے تیاری میں کچھ وقت درکار ہوگا۔ مسرت جہاں بستر سے اٹھ گئیں۔ اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے پہلے انہوں نے اٹیچ باتھ میں جا کر وضو کیا اور پھر کمرے میں جا کر جائے نماز بچھالی۔ نوافل ادا کر کے اپنے پالنے والے سے ہم کلام ہوئیں۔

''اے مالک.....تو دلوں کے حال جانتا ہے.....تیری اس دنیا میں ہماری کوئی حیثیت کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اس لیے ہم نے ایک فیصلہ کیا جو یقیناً میرا بھی فیصلہ ہے کہ سب جانتے ہیں تیرے حکم کے بغیر ایک پتا بھی حرکت نہیں کر سکتا۔ کجا انسان ایک سے دوسرا قدم اٹھائے۔ تو نے ہر انسان کو حق اور اختیار دیا ہے کہ اپنی مرضی سے جئے جیسے چاہے جئے۔ ہم اسی حق کو استعمال کر رہے ہیں پروردگار تو ہماری مدد فرما.....اس نئی مسافت کو ہمارے لیے سہل کر دے۔'' دعا مانگ کر جب وہ اٹھیں تو ان کا ذہن پہلے سے پرسکون تھا۔ پہلے اگر کوئی ملال کوئی خلش کوئی دکھ تھا بھی تو اب اس کا ہلکا سا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ مطمئن انداز میں وارڈ روب کھول کر اپنے کپڑے نکالنے لگیں۔ چند

زیورات اور پہننے کے کپڑے نکال کر بمعہ رسی کرتے انہوں نے ایک بیگ میں رکھے۔ اور وقت گزرنے کا انتظار کرنے لگیں۔ لیکن جیسے گھڑی کی سوئیوں کو بھی علم ہو گیا تھا کہ وہ کیا کرنے جا رہی ہیں۔ سو وہ بھی جیسے رک رک سہم سہم کر چل رہی تھیں۔ ساڑھے بارہ بجے مسرت جہاں نے اپنے دروازے سے باہر جھانکا۔ ابا میاں کے کمرے کی لائٹ جل رہی تھی باقی سادات نگر تقریباً اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ دروازے سے نکلنے لگی تھیں جب ابا میاں کے کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ باہر نکل آئے۔ مسرت جہاں نے دروازہ دھیرے سے بند کرتے ہوئے ہلکی سے جھری چھوڑ دی اور اس میں سے باہر جھانکنے لگیں۔ ابا میاں عجب بے چینی کے عالم میں صحن میں ٹہل رہے تھے۔

''یہ کیا.....؟'' وہ دھک سے رہ گئی۔

''کہیں ابا میاں کو پتا تو نہیں چل گیا کہ میں کیا قدم اٹھانے لگی ہوں۔'' انہوں نے سوچا اور آگے بڑھ کر کمرے کی لائٹ آف کر دی۔ گویا دوسروں کو باور کرانے کے لیے کہ وہ سو چکی ہیں۔ ابا میاں بدستور صحن میں ٹہل رہے تھے۔ مسرت جہاں مسلسل کھڑے رہنے کی وجہ سے تھک گئی تھیں۔ ٹانگیں اور پیر جیسے شل ہو گئے تھے۔ لیکن خدا معلوم ابا میاں کو کیا بے سکونی، بے چینی اور اضطرا تھا جو وہ صحن میں ٹہلے جا رہے تھے۔ ایک بجنے میں صرف پانچ منٹ باقی تھے۔ مسرت جہاں کی بے چینی اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی۔ انہوں نے ہاتھ میں پکڑی چادر اچھی طرح اپنے وجود کے گرد لپیٹ لی۔ حجاب سے چہرے کو چھپا لیا اور ایک ہاتھ میں بیگ تھام لیا۔ ابا میاں بیرونی دروازے کی طرف جا رہے تھے۔ مسرت جہاں پریشان ہو اٹھیں۔ لیکن یہی موقع تھا ان کے پاس۔ انہوں نے فرجاد سے کہا تھا کہ وہ چھت کی طرف سے آئیں گی۔ سو ابا میاں کے بیرون دروازے سے نکلتے ہی وہ بلی کی طرح بے آواز قدموں سے تیزی کے ساتھ برآمدے سے ہوتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف بھاگیں۔ دل یوں دھڑک رہا تھا جیسے سینہ پھاڑ کر باہر آ جائے گا۔ وہ سادات نگر کے چاروں طرف بھرپور نگاہ دوڑاتے ہوئے وہ بہت تیزی سے سیڑھیاں چڑھ گئیں۔ آخری سیڑھی چڑھ کر دبے پاؤں تھوڑا آگے جا کر انہوں نے دھونکنی کی طرح چلتے سانسوں کو ہموار کرنے کی کوشش کی۔ بیرونی دروازے کے بند ہونے کی آواز آئی تو وہ چونک اٹھیں۔

''ایسا نہ ہو کہ ابا میاں میرے کمرے میں جھانکیں اور مجھے نہ پا کر گھر بھر کو میری تلاش میں سرگرداں کر دیں۔ پتا نہیں میں اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے آئی تھی یا جلدی میں کھلا ہی چھوڑ کر آ گئی۔'' وہ خود سے ہم کلام تھیں۔ ایک طرف اپنوں کے جاگ جانے کا خوف اور دوسری طرف یہ خوف کہ پتا نہیں فرجاد آیا بھی ہو گا یا نہیں۔'' انہوں نے بہت آرام سے قدم آگے بڑھائے۔ اور حویلی کی پشتی سمت چھت کے آخری کنارے پر آ کر نیچے جھانکا۔ حویلی کی دوار کے ساتھ پچھلی طرف ایک وسیع و عریض پلاٹ یونہی بیکار پڑا ہوا تھا۔ مسرت جہاں کو وہاں نیم تاریکی میں ایک گاڑی اور اس کے ساتھ ٹیک لگائے باتوں میں مصروف دو انسانی ہیولے دکھائی دیئے۔ ایک پل کو وہ گھبرا کر پلٹیں۔ یقیناً رات کے اس پہر ان کی وہاں موجودگی بے سبب نہیں تھی۔ اور وہ کم سے کم ان کی نظروں میں نہیں آنا چاہتی تھیں۔ لیکن ان کے پیچھے ہٹنے سے پہلے ہی ان میں سے ایک ہیولا تیزی سے قدرے روشنی میں آیا..... وہ فرجاد تھا انہوں نے قدرے سکون کا سانس لیا۔ فرجاد نے بہت دھیمی آواز میں پوچھا۔

''نیچے کیسے آؤ گی۔'' مسرت جہاں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے ایک منٹ رکنے کو کہا۔ بیگ کی زپ کھول کر رسی نکالی۔ یہ وہی رسی تھی جس سے انہوں نے اپنے گھر کے سب سے بڑے درخت کی ڈال پر جھولا ڈال رکھا تھا۔ جس جھولے پر ساون میں وہ جھولتے ہوئے گیت گنگنایا کرتی تھیں۔ جوان کے خوابوں، ان کی سوچوں میں شراکت دار تھا۔ آج وہ آنگن، سکھیاں، گڑیا سبھی کچھ چھوڑ کر جا رہی تھیں تب بھی اس جھولنے نے اپنے ہونے کا حق ادا کر دیا تھا۔ وہ یہاں بھی ان کی خوشیوں کو حاصل کرنے میں مددگار ثابت ہوا تھا۔ انہوں نے زپ بند کر کے بیگ اوپر سے پھینک دیا جسے فرجاد نے کیچ کر کے ایک طرف رکھ دیا۔ فرجاد بہت غور سے ان کی ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ لیکن زیادہ بولنے سے گریز کر رہا تھا کہ کہیں اس کی آواز کسی اور کے کانوں میں نہ پہنچ جائے۔ یوں رسی سے لٹک کر نیچے اترنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اس لیے اس نے مسرت جہاں کو کہا کہ وہ اچھی طرح رسی کی مضبوطی کا یقین کر لینے کے بعد نیچے اتریں۔ مسرت جہاں نے رسی کو اچھی طرح کھینچ کر جھٹکے دے کر اس کی پائیداری کا تعین کیا اور پھر کچھ جھجکتے ہوئے انہوں نے منڈیر پر سے اپنے پیر نیچے لٹکائے۔ دونوں ہاتھوں سے رسی کو مضبوطی سے تھام کر انہوں نے خود کو فضا میں چھوڑ دیا۔ ایک پل کو تو انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے ان کے ہاتھ ان کا بوجھ برداشت کر پائیں گے اور رسی ان کے ہاتھ سے چھوٹ جائیگی۔ رسی ان کی نرم ہتھیلیوں پر بری طرح کھسک کر انہیں زخمی کر رہی تھی۔ لیکن وہ اس وقت جس کیفیت سے گزر رہی تھیں۔ اس میں انہیں کسی چیز کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ عجیب سا جمود طاری تھا۔ ذہن ہر سوچ سے خالی۔ بس فرجاد کو سامنے پا کر آنکھوں میں خوشی کی رمق جاگ رہی تھی۔ رسی زمین سے قدرے اونچی تھی اس لیے فرجاد نے ان کے دونوں بازو تھام کر انہیں نیچے اترنے میں مدد کی اور پھر تیزی سے ان کا ہاتھ تھام کر گاڑی کی طرف بڑھا۔

''چلو عامر.....'' پہلے سے گاڑی کے بیک ڈور کھلے ہوئے تھے فرجاد نے بیگ اندر پھینکا اور مسرت جہاں کے ہمراہ پچھلی نشستوں پر براجمان ہو گیا۔ عامر نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہی بہت تیزی سے ٹرن لیا۔ اور پھر ہر گزرتا لمحہ سادات نگر اور مسرت جہاں کے درمیان ان مٹ فاصلہ بڑھاتا چلا گیا۔ مسرت جہاں نے ایک محبت کی آسودگی کی خاطر سب کچھ قربان کر دیا۔ سادات نگر کے دروازے اپنے لیے بند کر دیئے خود اپنے ہاتھوں خون کے رشتوں کی ہر ڈور کو توڑ کر وہ ایک نئی دنیا' نیا جہان دریافت کرنے چل پڑیں۔ شاید ایک محبت کبھی کبھی بہت ساری محبتوں پر بھاری پڑ جاتی ہے۔ گاڑی اندھیرے میں گم ہو گئی تھی بالکل ایسے ہی جیسے شبیر حسین شاہ کی عزت۔''

☆.....☆.....☆

نمی لیے خنک ہوا سرسبز درختوں کے پتوں سے اٹھکیلیاں کر رہی تھی۔ لان میں لگائے گئے پھولوں کے پودے نت نئی خوشبوؤں کے حصار میں جھوم رہے تھے آسمان پر چھائے بادلوں نے یک دم موسم کو انتہائی حد تک دلکش بنا دیا تھا۔ یہ موسم ان سب کے لیے ایکسائٹنگ ہوتا تھا۔ سو اس وقت بھی وہ سب لان میں جمع تھے۔ کچھ دنوں سے بڑی اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی لیکن آج وہ بھی کچھ بہتر محسوس کر رہی تھیں۔ سو وہ بھی ان سب کے بیچ موجود تھیں۔ شاذان اور مہوش بیڈمنٹن کھیل رہے تھے۔ طاہر۔ اظہر۔ حسنین اور باصر الگ ٹیم بنائے کرکٹ کھیلنے میں مصروف تھے۔ روبیہ۔ انیقہ اور آریان بھی گھر کی خواتین کے ساتھ باتوں میں مصروف تھیں۔ جب سے فواد نے آریان کو

اپنے ساتھ کا یقین دلایا تھا وہ پہلے کی نسبت کافی خود اعتماد نظر آنے لگی تھی۔ خوف بتدریج کم ہوتا جا رہا تھا۔ اور اسے زندگی کا یہ نیا روپ اچھا لگ رہا تھا۔ یقیناً جو لوگ خوشیوں اور محبتوں کو ترسے ہوئے ہوتے ہیں ان کے لیے تھوڑا ابھی بہت ہوتا ہے۔ محبت کے چند قطرے بھی آب حیات کا درجہ رکھتے ہیں۔

ماحول بہت خوشگوار تھا سب ہنس بول رہے تھے۔

''ویسے زاہدہ! اب تم فواد کی شادی کر ہی دو..... گھر میں کچھ ہلا گلا ہو کوئی رونق ہو۔'' بھابھی مقسوم نے خاموش بیٹھی زاہدہ چچی کو مخاطب کیا۔

''بس بھابھی! بچوں کی مرضی اور پسند جہاں ہوگی وہاں کریں گے۔ فواد نے ابھی کسی لڑکی کے بارے میں مجھ سے بات نہیں کی۔'' زاہدہ چچی اس دن کے جھگڑے کے بعد سے بہت خاموش خاموش رہنے لگی تھیں۔ بابر چچا کے چہرے کی مایوسی اور دلگرفتگی کا ذمہ دار وہ خود کو ٹھہراتی تھی۔ اس لیے اب ان کی فطری اکڑ، ضد اور انا پرستی جیسے اپنی موت آپ مر گئی تھی۔ بہت نرم اور لچکدار رویہ ہو گیا تھا ان کا سب کے ساتھ۔ اور تقریباً سب ہی گھر والوں نے نوٹ بھی کیا تھا یہ اور بات کہ انہیں جتایا نہیں۔ اور فواد، شاذان یا مہوش نے بھی ان سے کسی قسم کی باز پرس نہیں کی تھی۔ ان تینوں نے ماں باپ کے درمیان ہونے والے ساری گفتگو سنی تھی۔ لیکن اس سلسلے میں وہ بالکل یوں انجان بن گئے تھے جیسے انہوں نے کچھ نہ سنا ہو۔ اور شاید باز پرس کرنے کا حق ان کے پاس تھا بھی نہیں۔

''ہاں..... یہ تو تم نے ٹھیک کہا آج کل کے بچے کہاں ماں باپ کی پسند کو کچھ گردانتے ہیں۔'' تائی مقسوم بولیں۔

''تائی امی! کیا آپ کے زمانے میں بھی لوگ پسند سے شادیاں کرتے تھے.....'' انیقہ نے کہا۔

''ارے توبہ کرو..... پسند کی شادی..... توبہ توبہ..... ہمارے زمانے میں تو لوگ اپنی شادی کا تذکرہ تک اپنے منہ سے نہیں کرتے تھے۔ کہاں مرضی کی شادی..... ماں باپ نے جس کھونٹے سے باندھ دیا۔ چپ چاپ سر جھکا کر بندھ گئے مجال ہے جو احتجاج کیا ہو..... آج کل کی تو لڑکیاں ایسے منہ پھٹ ہیں کہ اپنی شادی کی بات بھی یوں کریں گی جیسے کسی عام سی تقریب میں شرکت کرنی ہو..... نہ بھئی آج کل تو بہت ہی برے حالات ہیں۔'' تائی مقسوم معصومیت سے کہہ رہی تھیں۔

''نہیں خیر بڑی بھابھی! ایسی بھی بات نہیں۔ اس وقت بھی بڑے بڑے کھلاڑی پڑے تھے جو ماں باپ ک عزت کی پرواہ کیے بغیر اپنی مرضی اور پسند سے شادی کر کے خاندان کے منہ پر کالک ملنے کو برا نہیں سمجھتے تھے۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں.....'' حدیقہ چچی کا زہریلا لہجہ محفل میں موجود سبھی کے حلق کڑوے کر گیا تھا۔ اللہ جانے حدیقہ کو اس گھرانے کے لوگوں سے کیا بیر' کیا دشمنی تھی۔ وہ ان سب میں سے کسی کو بھی ہنستا ہوا نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ اگر ان کے اور اس گھرانے کے مزاج اور پسند میں کوئی فرق تھا تو اس کا انتقام وہ سب سے کیوں لے رہی تھیں۔ ایک ان کی ذات کے لیے تو سب اپنا آپ' اپنی گھریلو روایات بدلنے سے رہے۔ اگر انہیں اپنی اور دوسروں کی خوشیاں مقسوم ہوتی تو یقیناً وہ خود کو اس ماحول میں ڈھالنے کی کوشش کرتیں۔ لیکن انہوں نے نہ صرف خود کو اپنے میاں اور بچوں کو سب سے الگ

کرلیا تھا۔ بلکہ موقع بے موقع طنز اور تحقیر کے نشتروں سے دوسروں کو زخمی کرنا بھی اپنا فرض سمجھ لیا۔ بڑی اماں کا مسکراتا ہوا چہرہ ایک پل کو تاریک ہوا لیکن بچیوں کی موجودگی میں وہ کسی قسم کا تاثر نہیں دینا چاہتی تھیں۔ اس لیے حدیقہ کی طرف سے انہوں نے اپنی توجہ ہٹالی۔

''حدیقہ! کبھی کبھی دوسروں کا دل رکھ لینا دوسروں کی دل جوئی کرنا آپ کی ذات کو دوسروں کی نگاہ میں معتبر کردیتا ہے۔ میرا خیال ہے تم سمجھ گئی ہوگی۔'' شینا پھپھو کے سرد لہجے میں پہلی بار حدیقہ چچی کے لیے ایک تنبیہ تھی۔ حدیقہ چچی ہونہہ کہہ کر دوسری طرف متوجہ ہوگئیں۔ ایسا کرکے وہ صرف اپنے لیے نفرت کاشت کررہی تھیں۔ آج جو بور ہی تھیں کل وہی کاٹنا بھی تھا۔ سو کسی نے زیادہ توجہ نہ دی۔ انیقہ چائے کے برتن اٹھا کر اندر جانے لگی تو آریان بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ گئی۔ حدیقہ چچی کی حقارت اور تفاخر بھری نگاہیں اسے اپنے وجود کے آر پار ہوتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ اس لیے وہ بھی انیقہ کے ہمراہ اپنے پورشن میں آگئی۔ ٹیلی فون کی بیل پہلے انیقہ نے ہی سنی تھی۔ برتن کچن میں رکھ کر اس نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھالیا۔ دوسری طرف کی بات سن کر اس نے ریسیور پر ہاتھ رکھا اور بولی اینی آپی..... آپ کا فون.....'' کمرے کی طرف جاتی آریان کے قدم زمین نے جکڑ لیے۔ وہ بمشکل پلٹی۔

''میرا فون.....''

''جی شاید سکول سے ہو..... میرا خیال ہے آپ نے اپلیکیشن نہیں بھیجی ہوگی تو سر چھٹی کی وجہ معلوم کرنا چاہتے ہوں گے۔'' ریسیور ہاتھ میں دیتے ہوئے قیاس آرائی کرنے کے بعد انیقہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ آریان نے ریسیور کان سے لگالیا۔

''ہیلو.....'' وہ مری مری آواز میں بولی۔ حقیقتاً اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ کسی طرح یہیں کھڑے کھڑے غائب ہوجائے۔ تاکہ اسے تکلیف پہنچانے والے، اس کے نقصان کے داپے ظالم لوگ ہاتھ ملتے رہ جائیں۔ لیکن یہ ناممکن تھا۔

''ہمارا خیال ہے رانی جی! تین دن سوچنے کے لیے بہت ہوتے ہیں۔ اور جہاں معاملہ ماں کی زندگی کا آجائے..... اپنی زندگی اور دوسرے محبت کرنیوالوں کی عزت کا۔ میرا خیال ہے وہاں فیصلہ کرنے میں زیادہ تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔''

''تم لوگ میرا پیچھا چھوڑ کیوں نہیں دیتے..... آخر کیا بگاڑا ہے میں نے تمہارا۔ کیوں زندگی کو میرے لیے ایک ناروا بوجھ بنانے پر تل گئے ہو.....'' اس کا لہجہ بھیگ گیا۔

''کیسے چھوڑ دیں تمہارا پیچھا..... ارے بڑا روپیہ لگایا ہے ہم نے تم پر..... وہ ستارہ بیگم..... وہ کسی طرح بھی تم سے دستبردار نہیں ہوگی۔''

''کتنا پیسہ لگایا ہے اس بدکار عورت نے..... میں سارا ادا کردونگی۔ پائی پائی واپس کردوں گی لیکن خدارا میرا پیچھا چھوڑ دو۔'' آریان سسک رہی تھی۔

''کہاں سے لاؤ گی اتنا پیسہ..... اے ہاں یاد آیا..... اپنے راجہ سے کہوگی ناں کہ تمہاری قیمت چکا دیں..... تمہیں ہم سے خریدے..... لیکن رانی ہمارے بھی تو کچھ اصول ہیں..... تم اچھی طرح جانتی ہو کہ ستارہ بیگم اپنی دسترس میں آئی چڑیا کو اتنی آسانی سے نہیں نکلنے دیتی۔ اس لیے اب فیصلہ کرکے بتادو کہ کیا کرنا ہے۔''

''جب میں ایک بار کہہ چکی ہوں کہ قیمت چکا دوں گی اپنی..... پھر..... پھر بھی نہیں چھوڑو گے میرا پیچھا۔''

''بتایا ناں کہ جو چیز ہماری ملکیت میں ہو وہ ہم کسی کو نہیں دیتے۔ بے کار ہونے پر توڑ سکتے ہیں۔''

''تو پھر ٹھیک ہے جو تمہارے دل میں آئے کرو۔ میں نے بھی فیصلہ کر لیا ہے کہ خواہ موت کو گلے لگانا پڑے لیکن دوبارہ گندگی کے اس ڈھیر میں دوبارہ واپس نہیں جاؤں گی۔''

''ارے رانی! کیسی باتیں کرتی ہو..... سونے کے جھروکوں کو گندگی کا ڈھیر کہہ رہی ہو۔''

''ارمانوں کے خون میں نہائے سونے کے جھروکے تمہیں مبارک ہوں..... میری جان چھوڑو..... یہ ذہن میں رکھ لو کہ میں اب تنہا نہیں ہوں..... میرے ساتھ زبردستی تمہیں مہنگی پڑ سکتی ہے۔'' آریان کے لہجے میں فواد کی ہمراہی کا عہد غرور بن کر سمایا ہوا تھا۔

''ہم سمجھ گئے..... یہ گھی سیدھی انگلیوں سے نکلنے والا نہیں..... کوئی بات نہیں رانی جی..... شاید تم بھول گئیں ستارہ بیگم جب گھی نکالنے کے لیے انگلیاں ٹیڑھی کر لے تو پھر بہت کچھ تہہ وہ بالا ہو جاتا ہے..... اور ہم انگلیاں ٹیڑھیاں نہیں کرتے پورا ہاتھ گھی میں ڈال دیتے ہیں..... تم نے جو کہنا تھا کہہ ڈالا..... اب جو کرنا ہے ہمیں کرنا ہے..... افسوس تمہیں اپنا تو کیا احساس ہونا ہے اپنی ماں اور اپنے اردگرد بکھرے لوگوں کی عزتیں اور جانیں بھی اپنی ضد کے عوض داؤ پر لگا دیں تم نے.....'' دوسری جانب سے ٹیلی فون بند کر دیا گیا۔ اس نے بھی بے جان ہاتھوں سے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور وہیں قریب پڑی کرسی پر ڈھیر ہو گئی۔ پتہ نہیں اس کے نصیب کی یہ سیاہی کب ڈھلے گی۔ اس کی سوچیں اذیت سے کرلانے لگی تھیں۔ درد سینے میں پھیلتا جا رہا تھا۔

''کیا کہیں کوئی جائے اماں نہیں..... کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں وہ اپنی حرمت سمیت زندگی کے سانس پوری کر سکے..... اس کی ماں..... اذیتوں کا سفر کاٹتے کاٹتے ختم ہوتی جا رہی تھی۔ ہر جبر سہہ چکی تھی وہ..... لیکن غلاظت کی بے حس دلدل میں وہ گری ہوئی تھی اس میں سے نکلنے کا کوئی راستہ سلجھائی نہیں دیتا تھا۔ آریان کو خود سے دور رکھ کر پل پل اس کی یاد میں تڑپتی رہی تھی یہ سوچ کر اس کا تڑپنا اذیت سہنا اور آریان کو اپنی ممتا سے محروم کر دینا اس سے کہیں زیادہ بہتر تھا کہ وہ اس کوٹھے کے گندے ماحول میں پلتی..... دن رات اس کی سماعت میں گھنگھروؤں اور طبلوں کی صدائیں گونجتی اور ایک دن وہ نوخیز پھول حالات کے سنگلاخ ہاتھوں میں آ کر پتی پتی ہو کر بکھر جاتا۔ اسے اپنی بچی کا بکھرنا منظور نہ تھا۔ لیکن اس کی یہ ساری ریاضتیں، ساری کوششیں رائیگاں ثابت ہوئی تھیں۔ اس کی اذیتیں، تکلیفیں بے کار گئیں۔ ستارہ بیگم کی شاطر نظروں کی گرفت آریان پر پڑی تو جیسے وہ کھل ہی اٹھی تھی۔ اس کے کوٹھے پر حسین ترین اور چاند جیسا روشن چہرہ اپنی چھب دکھلاتا تو بڑی بڑی نائیکائیں ہاتھ ملتی رہ جاتیں۔ ستارہ بیگم نے خفیہ طور پر آریان کو ہوسٹل سے یوں غائب کروایا کہ خود اسے بھی پتا نہ چل سکا۔ جب اس نے اپنی ماں کے بے بس چہرے اور گھنگھرو بابا کی تفکر کی لکیروں سے لبریز پیشانی دیکھی تو بہت کچھ سمجھ گئی۔ ستارہ بیگم کا داؤ چل گیا تھا۔ اس کی ماں کی محنت اور کوشش بھی اسے نہ بچا پائی تھی۔ لیکن آریان کوئی تر نوالہ نہیں تھی جسے آسانی سے ہضم کر لیا جاتا۔ وہ کسی ہڈی کی طرح ستارہ بیگم کے حلق میں اٹک گئی تھی۔ مجبور ہو کر ستارہ بیگم نے خفیہ طور پر اس کا سودا کر دیا۔ گھنگھرو بابا کو اس کی بھنک پڑ چکی تھی۔

سو وہیں سے فرار کا منصوبہ بنایا گیا اور آریان ان لوگوں کے چنگل میں پھنسنے سے پہلے ہی بھاگ نکلی تھی۔ اور اب..... اب وہی لوگ دوبارہ مسلسل اذیت کا سامان پیدا کر رہے تھے۔ انیقہ کسی کام سے اپنے کمرے سے نکلی تو آریان کو یوں بے حس و حرکت بیٹھا دیکھ کر اس کے قریب چلی آئی۔

''کیا بات ہے اینی آپی..... آپ کیوں اس قدر پریشان دکھائی دے رہی ہیں.....'' اس نے آریان کو مخاطب کیا۔

''نہیں تو! ایسی تو کوئی بات نہیں.....'' آریان اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ اپنے چہرے کے تاثرات کو چھپانے کا کمال نہیں رکھتی۔ لیکن پھر بھی وہ اسے کیا بتاتی اس کا خاموش رہنا ہی بہتر تھا۔

''تم دونوں یہاں اس طرح کیوں بیٹھی ہوئی ہے۔ جیسے کسی کا انتظار ہو۔'' کوریڈور میں داخل ہوتے ہی روبیہ کو وہ دونوں گفت و شنید کرتی دکھائی دیں۔

''انتظار کس کا کرنا ہے..... آریان آپی پریشان ہیں لیکن بتاتی ہی نہیں ہیں کہ کیا وجہ ہے؟'' انیقہ نے کہا تو روبیہ نے بھی بغور آریان کی طرف دیکھا۔

''ہاں پریشان تو یہ واقعی لگ رہی ہے..... سو آریان بغیر رکے شروع ہو جاؤ..... اگر تم اپنی پریشانی ہمیں نہیں بتاؤ گی تو ہم یہی سمجھیں گی کہ ہماری اتنی محبت کے باوجود تم ہمیں اب تک اپنا نہیں سمجھیں۔''

''نہیں ایسا مت سوچو..... میں سچ کہتی ہوں کہ تم دونوں نے بہن کی کمی پوری کی ہے میرے لیے..... مجھ جیسی کم مایہ لڑکی اتنی محبت اتنے خلوص کی کہاں حقدار تھی.....''

''تم کس لائق ہو..... یہ دوسروں پر چھوڑو۔ اس وقت اپنی پریشانی بتاؤ ہمیں.....''

''کیا کرو گی سن کر..... میں جو ہوں جیسی ہوں اس پر پردہ ہی پڑا رہنے دو۔ میں تم دونوں کی محبت اور اس گھر کے سائے سے محروم نہیں ہونا چاہتی..... میں جانتی ہوں جب تم دونوں سب کچھ جان لو گی تو نفرت سے منہ پھیر لو گی..... اور محبت بھرے چہروں پر اپنے لیے نفرت مجھ سے برداشت نہ ہو پائیگی۔''

''اینی..... خود سے نتیجے اخذ کرتی رہتی ہو تم..... افسوس صد افسوس کہ تم ہمیں سمجھ نہ سکیں۔'' روبیہ کے لہجے میں ملال تھا۔ آریان خاموش بیٹھی اس کی بات سن رہی تھی۔

''اب بول بھی چکو..... کیوں ہمارے صبر کا امتحان لینے پر تلی ہوئی ہو.....'' روبیہ محبت بھری ناراضگی سے بولی۔ آریان نے سوچا آج نہیں تو کل سب کچھ ان کو پتا چل ہی جانا ہے۔ نتیجہ تب بھی وہی نکلے گا جو اب نکلنا ہے۔ وہ محبت کو آزما لینا چاہتی تھی کہ اگر ان کے رویے بدل بھی گئے تو کم سے کم ان سب کو چھوڑتے ہوئے اسے بہت زیادہ اذیت تو نہیں ہوگی۔ اس نے اپنی داستان حیات کا ورق ورق ان دونوں کے سامنے کھول کر رکھ دیا۔ ہر وہ اذیت جو اکیلے اس نے یا اس کی ماں نے سہی تھی۔ لفظوں میں ڈھال کر بیان کر دی۔ آنکھوں سے

اشک برسنے لگے تھے۔ لفظ بے ربط ہو کر ٹوٹ ٹوٹ کر ہونٹوں سے ادا ہو رہے تھے اور روبیہ، انیقہ ساکت بیٹھی درد کی یہ داستان سن رہی تھیں۔ اپنی بات کے اختتام پر اس نے سر اٹھا کر روبیہ اور انیقہ کے چہروں کے تاثرات دیکھے..... وہاں کچھ بھی غیر معمولی نہیں تھا۔ نہ حقارت، نہ حقیقت چھپانے پر کوئی غصہ ان کی آنکھیں اس کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں لیکن پر سوچ انداز میں۔ آریان ان کے یوں یک ٹک دیکھنے پر سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ دل میں چور ہو تو انسان خواہ مخواہ بات بے بات نتیجہ اخذ کرنے لگتا ہے۔ ندامت محسوس کرتا ہے یا خود کو دوسروں کی نظروں سے چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور آریان کا بھی اس وقت یہی حال تھا۔

''اپی..... جن سے محبت کی جاتی ہے ناں انہیں اپنے درد کا بھی شریک بنایا جاتا ہے۔ جب انسان نے تنہا ہی اذیتوں کا سفر طے کرنا ہو تو پھر یہ محبتیں، یہ رفاقتیں محض بہلاوہ ہوتی ہیں۔ ایک بہانہ، صرف رشتہ بے نام.....'' روبیہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

''آپی! اتنے دن ہمارے درمیان رہ کر بھی آپ نہ جان سکیں کہ ہم نے آپ سے جیسی ہیں جو ہیں ہمیں قبول ہیں کی بنیاد پر دوستی کا رشتہ اپنایا ہے۔ آپ کا ماضی کیا تھا۔ ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں۔ اس لیے کہ ہم اچھی طرح جان چکے ہیں کہ آپ بے قصور بے خطا تھیں۔ ہمیں آج کی آریان آپی سے پیار ہے..... اتنا کہ ہم انہیں اپنی ذات کا ایک حصہ سمجھنے لگے ہیں۔ اور جہاں تک نفرت کی بات ہے تو میری پیاری آپی..... نفرت تو ہم نے قابل نفرت لوگوں سے کبھی نہیں کی..... آپ..... آپ تو پاکیزہ ہیں، معطر ہیں کسی پھول کی طرح..... آپ کو تو خدا نے بنایا ہی محبت کے لیے ہے۔ پھر ہم سب آپ سے نفرت کیوں کر دیں۔'' انیقہ کا ایک ایک لفظ امرت بن کر آریان کے دکھے دل کو بھگو رہا تھا۔ اس نے نم آلود آنکھوں سے ان دونوں کی طرف دیکھا۔

''یہ ذہن سے نکال دو اپی! کہ ہم تمہیں جانے دیں گے۔ تم حالات کی تیز دھوپ میں جھلس جاؤ یہ ہم کبھی برداشت نہیں کر سکتے۔'' روبیہ نے کہا تو اس کے لہجے میں آریان کے لیے فکر اور محبت رچی ہوئی تھی۔

''لیکن روبی! وہ تم دونوں کا نام لیتے ہیں کہ اگر میں ان کے ساتھ نہ گئی تو وہ خدانخواستہ تم دونوں میں سے..... مجھے جانا ہوگا اس لیے کہ اپنی ذات کو بچا کر میں تم دونوں کو اذیت کے الاؤ میں نہیں پھینک سکتی۔'' آریان دکھ بھرے لہجے میں بولی۔

''اپی آپی! نہ تو آپ کہیں جائیں گی اور نہ ہی ہمیں کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ وہ لوگ شاید جانتے نہیں کہ سادات نگر کے باسی ابھی اتنے کھوکھلے نہیں ہوئے کہ کوئی ایرا غیرا یوں منہ اٹھا کر چلا آئے عزتوں کا سودا کرنے.....'' انیقہ زندگی میں پہلی بار اتنی سنجیدہ ہوئی تھی۔ روبیہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''کیا یہ تم ہی ہو نکی.....'' وہ شرارت آمیز لہجے میں بولی۔ ماحول پر طاری کشیدگی کو بھی تو کسی طرح کم کرنا تھا۔

''کیوں..... کیا سینگ نکل آئے ہیں میرے جو پہچاننے میں دقت ہو رہی ہے۔''

''نہیں خیر تم بغیر سینگوں کے بھی کم خوبصورت نہیں.....''

''اپیا! پلیز اس وقت میں خطرناک حد تک سنجیدہ ہوں۔ زندگی میں پہلی بار.....''

''اور شاید آخری بار بھی.....'' روبیہ نے لقمہ دیا لیکن انیقہ نے سنی ان سنی کر دی۔

''معاملہ کم سنگین نہیں ہے.....ہمیں بہت سنجیدگی سے اس مسئلے کا حل سوچنا ہے کہ آریان آپی پر کوئی حرف نہ آئے.....گھر کے بڑوں کو بھی خبر کرنی پڑے گی تاکہ کسی بھی پیش آنے والی مشکل میں ہمیں مکمل سپورٹ دستیاب ہو.....میرا خیال ہے سب سے پہلے فہدی بھائی سے بات کی جائے.....''

''ہاں ان سے بات کی جائے.....تاکہ ایک بار پھر آریان کو گھر بھر کے سامنے ذلیل کرتے پھریں۔'' روبیہ کو فواد کے اس دن والے رویے پر بہت غصہ تھا۔ حالانکہ آریان نے اس دن کے بارے میں بھی پوری تفصیل سے انہیں آگاہ کیا تھا کہ غلطی فواد کی نہیں تھی۔ ان کی جگہ کوئی بھی ہوتا۔ ایسے انکشاف کے بعد اس کا رویہ ایسا ہی ہونا تھا۔

''نہیں روبی! اب ایسا نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ اب وہ سب کچھ جان چکے ہیں۔'' آریان نے ڈھکے چھپے لفظوں میں فواد کی حمایت کی۔

''تو بس پھر ٹھیک ہے.....فہدی بھائی اور شانی بھائی کو ساتھ ملا لیتے ہیں۔'' انیقہ نے کہا۔

''اور مہوش.....روبیہ نے پوچھا۔

''رہنے دو اس مغرور حسینہ کو.....بے چاری کی ناک کے نیچے ہی نہیں آتا کوئی۔'' انیقہ جیسے اس سے سخت خار کھائے بیٹھی تھی۔

''چلو ٹھیک ہے رات کو فہدی بھائی کے ساتھ ڈسکس کریں گے۔'' انیقہ اور روبیہ اس کے لیے کس قدر فکر مند تھیں۔ جس کے چاہنے والے اس قدر فکر مند اور حساس ہوں اسے بھلا کیا خوف.....آریان کو ان کا اپنے لیے یوں متفکر اور پریشان ہونا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ بہر حال ان کو اپنا جواز بتا کر اس کی پریشانی تھوڑی کم ہوگئی تھی۔ طبیعت بھی قدرے بحال ہوگئی۔ ثمینا پھپھو کے آجانے پر گفتگو کا موضوع بدل گیا۔ اور جب عشاء کی اذان سے کچھ پہلے ڈاکٹر فواد کلینک سے واپس آئے تو انیقہ نے ان سے تھوڑا سا وقت مانگا۔

''کیا بات ہے بہت فارمل اور سنجیدہ ہو رہی ہو.....'' انہیں اس کا سنجیدہ ہونا کھل رہا تھا۔

''حالات اور ماحول پر ڈپینڈ کرتا ہے برادر.....بہر حال آپ کھانا وانا کھا لیں.....کچھ دیر بعد ہم آپ کو شرف ملاقات بخشیں گے۔'' آخری جملے میں شرارت کی آمیزش تھی۔

''تم کبھی سدھر سکو گی مجھے ناممکن ہی لگتا ہے۔'' فواد مسکراتے ہوئے اپنے پورشن کی طرف بڑھ گئے۔

رات کو میٹنگ کے شرکاء جن میں فواد، شاذان، انیقہ، روبیہ اور آریان شامل تھے فواد کے کمرے میں موجود تھے۔

''ہاں بتاؤ.....کیا مسئلہ ہے۔'' فواد بیڈ پر بیٹھ کر سرہانہ گود میں رکھتے ہوئے بولے۔

''جناب عالی.....مسئلہ سنگین ہے بھی اور نہیں بھی۔ بہر حال مسئلہ آریان آپی سے متعلق ہے۔'' انیقہ نے بات شروع کی۔

''کیا مطلب.....؟'' فواد کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولے۔

''مطلب یہ کہ جو لوگ آپ کے کلینک میں آئے تھے.....جھگڑا اور توڑ پھوڑ کی تھی انہوں نے۔ وہ لوگ اب آریان آپی کو

پریشان کر رہے ہیں۔" انیقہ نے مختصر الفاظ میں کہا۔ فواد جان گئے کہ آریان نے انیقہ اور روبیہ کو اپنا ہمراز بنالیا ہے البتہ شاذان منہ کھولے ہونقوں کی طرح دیکھ رہا تھا اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

"کیا مطلب! کون لوگ ہیں وہ....."

"دیکھوں شانی! تم اپنی چھوٹی سی عقلدانی پر زیادہ بوجھ نہ ڈالو....." انیقہ نے شاذان سے کہا جو متجسس نظروں سے آریان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"لیکن یہ سب آپ خود بھی تو مجھے بتا سکتی تھیں آریان! آپ نے اتنے دن مجھ سے اس مسئلے پر کوئی بات نہیں کی تو میں سمجھا شاید وہ خود ہی پیچھے ہٹ گئے۔ بہر حال آپ پریشان نہ ہوں بہت جلد اس کا کوئی حل نکال لیں گے۔" فواد کے لہجے میں چھپی پس پردہ شکایت آریان کی سمجھ میں آگئی تھی۔ لیکن اس نے زیادہ غور نہیں کیا۔ اس وقت ان سب کی ہمدردیاں توجہ اور ساتھ ہی اس کی سب سے بڑی ضرورت تھی۔

"برادر عزیز! اسی حل کو تلاشنا ہے اسی لیے ہم یہاں آئے بیٹھے ہیں۔" انیقہ نے کہا۔

"میرے خیال میں ہمیں شینا پھپھو سے تفصیلی بات کر لینی چاہیے۔ وہ ہمیں بہتر گائیڈ کر سکتی ہیں۔"

"لیکن کیا وہ ناراض نہیں ہونگی....." آریان کے لہجے میں خدشہ کا تاثر تھا۔

"نہیں آریان! شینا پھپھو ایک لبرل سوچ کی مالک بہت سلجھی ہوئی خاتون ہیں تم دیکھنا وہ ہمارے لیے اس مسئلے میں کتنی مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ اور انیقہ میں پہلے شینا پھپھو سے بات کروں گا۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی بہتر راستہ نکل آئے گا۔"

"کیا مطلب ہے کیا ابھی بات کرنے جا رہے ہیں۔" انیقہ نے حیرت سے پوچھا۔

"کیوں اس میں کیا ہرج ہے.....؟" وہ استفہامیہ انداز میں بولے۔

"نہیں ہرج تو کوئی نہیں..... بہر حال جیسے آپ کی مرضی....."

"میں یہ سوچ رہا ہوں کہ جس قدر جلد ہو سکے اس مسئلے کو حل ہو جانا چاہیے۔ تاخیر کسی صورت بہتر نہیں ہے۔ بہر حال میں جا رہا ہوں پھپھو کے پاس۔ تم لوگ یہیں رک کر میرا انتظار کرو۔" فواد کہہ کر کمرے سے نکل گئے۔

"لو اکیلے ہی جیمز بانڈ 007 بننے کا شوق چرایا انہیں۔" انیقہ کو قلق ہو رہا تھا کہ فواد انہیں چھوڑ کر خود آریان کے سب سے بڑے خیر خواہ بن کر ماما کے پاس چلے گئے تھے۔ بہر حال اب صبر اور انتظار کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ وہ برا سا منہ بنا کر بیڈ پر نیم دراز ہو گئی۔ جبکہ آریان خاموش بیٹھی اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیوں پر نگاہیں جمائے ہوئے تھے۔ بقول روبیہ کے بہت روشن پیشانی تھی اس کی اور بہت فریش لکیریں تھیں اس کے ہاتھ میں..... لیکن مقدر میں روشنی کہیں نہیں تھی بس اندھیرے ہی اندھیرے تھے۔ مقدر کی تلخی ایک زخمی مسکراہٹ بن کر اس کے ہونٹوں پر ثبت ہو گئی۔

ادھر فواد ذہن میں لفظ ترتیب دیتے ہوئے شینا پھپھو کے کمرے میں داخل ہوئے تو وہ سامنے بیڈ پر نیم دراز کوئی ڈائجسٹ پڑھنے میں مصروف تھیں۔ برسوں سے ان کی یہ مطالعے والی عادت آج تک نہ چھوٹی تھی۔

''پھپھو آجاؤ.....'' وہ دروازے میں ہی رک کر اجازت طلب کرنے لگے۔

''آجاؤ.....وہ سیدھی ہو بیٹھیں۔

''کیا ہو رہا تھا.....؟'' انہوں نے یونہی برسبیل تذکرہ پوچھا۔

''روز کی روٹین پوری کر رہی تھی.....ایسی عادت پڑی ہوئی ہے کہ رات کو کچھ پڑھ نہ لوں نیند نہیں آتی.....''

''پھپھو یہی تو آپ کی ڈیسنسٹی ہے.....حقیقتاً اس مطالعے ہی کے باعث گھر میں سب سے لبرل ہیں آپ.....'' وہ عقیدت سے بولے۔

''خیر تو ہے بڑا مکھن لگایا جا رہا ہے۔'' پھپھو کو اپنا یہ ہونہار بھتیجا بہت پیارا تھا۔

''نہیں پھپھو میں سچ کہہ رہا ہوں.....بہر حال اس وقت تو میں بہت اہم موضوع پر بات کرنے کے لیے آیا ہوں۔ آپ کو کوئی مصروفیت تو نہیں یا نیند تو نہیں آ رہی.....''

''نیند اور مصروفیت تم سے زیادہ اہم تو نہیں.....تم بات کرو میں سن رہی ہوں۔'' انہوں نے فواد کے کہے کو بہت اہمیت دی۔ جس سے ان کو کافی حوصلہ ہوا۔

''پہلی بات تو یہ کہ آپ خود کو بالکل غیر جانبدار فریق کے طور پر رکھیں گی۔ دوسرے سادات نگر کی روایات واقدار اور یہاں کے مکینوں کی سوچ سے ذرا ہٹ کر اس معاملے کو پرکھیں گی۔'' فواد انہیں ہموار کرتے ہوئے بولے۔

''ٹھیک ہے.....تم بات کرو.....زیادہ سسپنس کری ایٹ مت کرو۔''

''پھپھو موضوع آریان کی ذات اور اس کا ماضی ہے۔ جس سے کچھ دن پہلے مجھے آگاہی ہوئی ہے میں چاہتا ہوں کہ آپ کو بھی ساری تفصیل بتا کر اس مسئلے کا حل تلاش کیا جائے جواب درپیش ہے۔'' فواد کے منہ سے یہ بات سن کر پھپھو سیدھی ہو بیٹھیں۔ دوسرے لفظوں میں ہمہ تن گوش ہو گئیں۔

''آریان کے ماضی کے متعلق.....بولو.....میں سن رہی ہوں۔''

''پھپھو.....آپ کو یاد ہو گا چند دن پہلے شام کے وقت آپ سب لان میں موجود تھے۔ جب میں آریان کے ساتھ بہت غیر مہذب انداز میں پیش آیا تھا۔ یقیناً آپ سب کو ہی بہت ناگوار گزرا ہو گا۔ یاد ہے ناں پھپھو! جب میں اسے گھسیٹ کر کمرے میں لے گیا تھا۔''

''ہوں.....آگے بولو.....''

''اس دن میرا اپنے دوستوں سے جھگڑا نہیں ہوا تھا۔ بلکہ دو اجنبی میرے کلینک پر آئے تھے غنڈہ ٹائپ شخص تھے اور انہوں نے

مجھے آ کر بتایا کہ آریان ان کی ملکیت ہے۔ اور اسے خاموشی سے ان کے حوالے کر دیا جائے۔ جب میں نے ان سے پوچھا کہ ان کا آریان سے کیا تعلق ہے تو ان بدمعاشوں نے بتایا کہ آریان ایک طوائف زادی ہے اور کوٹھے سے بھاگی ہوئی ہے۔'' ایک پل کو رک کر انہوں نے شینا پھپھو کے تاثرات دیکھے۔ وہ بہت دل جمی سے ان کی بات سن رہی تھیں۔ پھر انہوں نے الف سے الف سے لے کر ی تک ساری تفصیل بتا دی۔ آریان سے ہونے والی گفتگو کا حرف حرف کہہ ڈالا۔

''اب بتائیں پھپھو! کیا اسے گھر میں رکھنا چاہئے۔ یا دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دینا چاہئے۔''

''کیسی باتیں کرتے ہو فواد..... احمقانہ باتیں مت کرو..... وہ تو پہلے ہی بہت دکھی ہے۔ اس کی دل جوئی کرنے اور اس کے زخموں پر مرہم لگانے کی بجائے اسے مزید چرکے لگانے کی بات کرتے ہو..... وہ جو بھی تھی وہ اس کا ماضی تھا جس پر اس کا کوئی اختیار نہیں تھا۔ اگر وہ اپنی مرضی سے اس گندگی میں رہنا پسند کرتی تو وہاں سے بھاگتی ہی کیوں۔ اب جبکہ وہ سادات نگر میں ہے اس کی جان اور اس کی عزت کی حفاظت ہماری ذمہ داری ہے سمجھے۔'' شینا پھپھو کے لہجے میں آریان کے لیے تردد سمٹ آیا۔ فواد کو اس پل اپنی پھپھو بہت پیاری لگیں حساس اور مثبت اندازِ فکر رکھنے والی۔

''بس یہی چاہتا تھا میں..... اس کی مجبوری کو سمجھا جائے..... اس وقت وہ اکیلی ہے تنہا ہے اس کا ساتھ دینے والی اس کی ماں اس وقت ان ظالموں کے چنگل میں ہے سو ہمارا فرض ہے کہ اس کی مدد کریں۔''

''بالکل..... لیکن یہ کوئی مسئلہ تو نہیں۔ تم وہ مسئلہ بیان کرو جو اب درپیش ہے۔''

''اصل میں وہ لوگ آریان کا پیچھا کرتے ہوئے سادات نگر کی دہلیز تک پہنچ چکے ہیں۔ مجھ سے بات کرنے کے بعد وہ رکے نہیں بلکہ انہوں نے درپردہ آریان پر دباؤ ڈالنے کے لیے ٹیلی فونک رابطہ رکھا۔ بار بار اسے فون کر کے پریشان کر رہے ہیں کہ ہمارے ساتھ چلو ورنہ سادات نگر کی کسی بہو یا بیٹی کو ہم اٹھا کر لے جائیں گے۔ وہ بہت پریشان ہے.....''

''بات تو ہے پریشانی کی..... اور صرف اس کے لیے ہی نہیں ہمارے لیے بھی.....'' شینا پھپھو پر سوچ انداز میں بولیں۔

''اسی لیے تو آپ کے پاس آیا ہوں کہ اب کیا کیا جائے.....''

''میرا خیال ہے سب کو اعتماد میں لینا پڑے گا اماں بی سمیت۔''

''نہیں پھپھو..... آپ کے سوا کسی کو بھی علم نہیں ہونا چاہئے۔'' فواد ابھی مزید کچھ کہنا چاہتے تھے کہ دروازے میں سے انیقہ نے اندر جھانکا۔

''اندر آ جائیں.....''

''جب یہاں تک تشریف لے ہی آئی ہیں تو اندر بھی آ جائیں۔'' فواد نے جل کر کہا۔

''حد ہوتی ہے نافرمانی کی۔ کہہ کر بھی آیا تھا کہ وہاں کوئی نہ آئے اور سب کے سب منہ اٹھا کر آ گئے تھے۔

''اب اپنی چونچیں ذرا بند رکھنا۔'' فواد نے انہیں تنبیہ کی اور ایک بار پھر شینا پھپھو کی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ سب اندر آ کر بیٹھ گئے تھے۔

''فہدی! جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ بالکل ناممکن ہے۔ گھر کے افراد سے کوئی بھی بات زیادہ دیر چھپی نہیں رہ سکتی۔ اور خود سوچو اماں بی جو اسے اتنا چاہتی ہیں جب انہیں یہ پتا چلے گا کہ ان سے کچھ چھپایا گیا ہے تو انہیں کتنا افسوس ہوگا۔ میرا خیال ہے بتا دینا بہتر ہے۔ دوسری صورت میں سب کی ناراضگی مول لینی پڑے گی۔'' شینا پھپھو بالکل ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ بڑی اماں آریان کو بہت محبت سے پیش آتی تھیں۔ اور آریان ان کی محبت کو کسی صورت کھونا نہیں چاہتی تھی۔

''پھر.....''

''جو کچھ بھی کرنا ہے بہت سوچ سمجھ کر کرنا..... میرا خیال ہے سب گھر والوں کی سپورٹ حاصل ہونے پر زیادہ بہتر نتیجہ برآمد ہوگا۔''

''پھپھو! میں اپنے طور پر ان لوگوں کو سبق سکھانا چاہتا ہوں۔''

''فہدی احمقانہ باتیں مت کرو۔ وہ لوگ مجرمانہ طور طریقے کے ہونگے۔ ان سے یوں براہ راست بھڑنا اتنا آسان نہیں جتنا تم سمجھ رہے ہو.....''

''کیوں کیا وہ سلطان راہی کی روح سے ملاقات کر کے آئے ہیں۔'' شاذان کا منہ بند نہ رہ سکا۔

''شانی..... فضول باتوں سے پرہیز کرو..... موقع محل دیکھ کر بات کیا کرو۔'' روبیہ نے اسے گھورا۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ سب اس وقت آریان کے لیے پریشان تھے۔

''یہ مسئلہ اتنا سیدھا نہیں ہے۔ کتنی پیچیدگیاں ہو سکتی ہیں تم میں سے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔ ہم لوگ جو گھروں کی چار دیواری سے نکلتے ہیں پھر بھی اپنوں کے حصار میں رہتے ہیں۔ مجرمانہ ذہنیت کے لوگوں کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ ستارہ بیگم جیسی عورتیں ہاتھ آیا شکار اتنی آسانی سے نہیں جانی دیتیں۔ اور اس کے لیے کسی کی جان بھی لینی پڑ جائے تو وہ اس سے بھی نہیں چوکتیں۔ اس لیے میرا مشورہ یہی ہے کہ تم میں سے عملی طور پر کوئی سامنے نہ آئے۔ میں اماں بی سے تفصیلی بات کروں گی۔ سب مل کر اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کریں گے۔'' شینا پھپھو نے انہیں سمجھایا۔ وہ سب خاموشی سے ان کی باتیں سن رہے تھے۔

''اور آریان! تم پریشان مت ہونا..... میرے لیے جیسی انیقہ اور روبیہ ہیں اسی طرح تم بھی ہو۔ کسی کی جرأت نہیں کہ وہ میری بیٹی کو کوئی معمولی سی تکلیف پہنچا سکتے۔ سادات نگر بزدل لوگوں کی جاء نہیں..... تمہاری طرف اٹھنے والی میلی آنکھ نکالنے کی جرأت ہے ہم میں۔'' شینا پھپھو کا مستحکم لہجہ آریان کی پلکیں بھگو گیا۔

کسی نے سچ کہا ہے کہ عورت جب ماں بن جاتی ہے تو دنیا بھر کے بچوں کو وہ اپنی اولاد سمجھنے لگتی ہے..... اس کی ممتا کسی سمندر کی طرح وسیع ہوتی ہے۔ جتنی محبت بانٹتی ہے اس سے کہیں زیادہ محبت اور پیدا ہو جاتی ہے۔ شینا پھپھو بھی سراپا ماں تھیں۔ ہر ایک کے لیے

اور آریان جیسی حرماں نصیب لڑکی کے لیے بھی۔ فوادان سے بات کر کے مطمئن ہو گئے تھے۔ اور آریان بھی۔

اگلے دن شینا پھپھو نے اماں بی سے تفصیلی بات کی اور توقع کے عین مطابق ان کے دل میں آریان کے لیے جو محبت تھی وہ جوں کی توں رہی بلکہ اس کے درد اس کے دکھ سن کر اور بڑھ گئی تھی۔ انہوں نے سب خواتین کو اپنے پاس بلایا سوائے حدیقہ کے..... کیونکہ وہ دوسروں کے دکھوں سے خط اٹھانے والوں میں سے تھیں۔ اور ان سے آریان کے متعلق ہر بات کہہ کر انہیں یہ بھی کہا کہ جلد سے جلد اپنے شوہروں کو اس مسئلے پر رام کرنے کی کوشش کریں تا کہ اس بے سہارا لڑکی کو مشکل سے نکالا جا سکے۔ سب خواتین نے موقع دیکھ کر شوہروں سے بات کر لی اور سب ہی آریان کی فیور میں نظر آ رہے تھے۔ حدیقہ اور شاکر چونکہ اس گھر کے کسی مسئلے میں شامل نہیں ہوتے تھے۔ اس لیے انہیں اب بھی اس معاملے سے دور ہی رکھا گیا تھا۔ بڑی اماں سمیت گھر کے سب مرد و خواتین آریان کے حق میں تھے سوائے عارب تایا کہ..... ان کو شینا پھپھو کچھ نہیں بتانا چاہتی تھیں۔ لیکن اماں بی نے کہا کہ اسے اعتماد میں لے لو۔ یہ نہ ہو کچھ عرصہ بعد اسے کہیں سے بھنک پڑ جائے اور تمہاری جان کے لیے مصیبت بن جائے۔ پہلے ہی تمہاری زندگی بہت تنگ ہے اور پھر زیادہ تنگ ہو جائے گی۔ سو انہوں نے ایک دن جب عارب تایا کا موڈ کچھ بہتر تھا جو کہ شاذ و نادر ہی ہوتا تھا۔ آریان کی بات چھیڑ دی۔ لیکن جو شدید ردعمل عارب تایا کی طرف سے دیکھنے میں آیا۔ شینا پھپھو پریشان ہو گئیں۔

☆.....☆.....☆

مہندی رچے گورے گورے پاؤں اس کے سامنے تھے کمرے میں نیم تاریکی تھی شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے بالکل اس کی زلفوں کی طرح۔ غلام عباس نے سامنے مخملیں بستر پر محو خواب وجود کو دیکھا۔ کس قدر حسن سمیٹ رکھا تھا اس بے خبر وجود نے۔ یوں لگتا تھا کائنات ہی سمٹ کر مجسم ہو کر سامنے آ گئی ہو۔ لمبی لمبی گہری آنکھیں جن پر سیاہ پلکوں کا چھتنار سا ہی فگن رہتا تھا۔ اور اس وقت بھی سرخی مائل گورے گالوں پر وہ پلکیں اپنا سایہ کیے ہوئے تھیں۔ نیم وگلابی شنگرفی ہونٹ جیسے کوئی گیت گانے کو مچل رہے تھے۔ اس گھر میں بے شمار کمرے تھے لیکن غلام عباس کو یہی لگتا تھا کہ زندگی بس اسی کمرے میں مقید ہے۔ جانے کیوں اس کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی سانسیں سہل ہو جاتی تھیں۔ سینے میں سلگتی ارمانوں کی چتا پر جیسے شبنم کی ٹھنڈک اترنے لگتی تھی۔ اس نے ہاتھوں میں پکڑے موتیے کے ڈھیروں پھولوں کو ایک نظر دیکھا پھر دبے قدموں آگے بڑھ کر اس نے وہ سارے پھول ان گورے گورے پیروں پر ڈھیر کر دیئے یوں جیسے کوئی داس دیوی کے چرنوں میں کچھ دان کر رہا ہو۔ نرم گداز ہوئے پیروں کو شاید نرم نرم پھولوں کا سجل سالمس ناگوار گزرا تھا وہ کچھ کسمسائے اور پھر جیسے ساری کائنات ہی متحرک ہو گئی۔ محو خواب وجود ایک توبہ شکن انگڑائی لے کر بیدار ہو چکا تھا۔ سیاہ گھور آنکھیں نیند کے خمار سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ غلام عباس نے نگاہیں چرا لیں۔

''کیا وقت ہو گیا غلام عباس..... کیا روشنیاں جل اٹھی ہیں؟'' دھیمی سی آواز غلام عباس کے کانوں سے ٹکرائی۔

''جی بی بی.....'' غلام عباس کا چہرہ جھکا ہوا تھا اور نگاہیں زمین میں گڑی ہوئی تھیں جانے کیا بات تھی وہ ان آنکھوں میں نہیں دیکھ

سکتا تھا۔ پورے دن میں اس کے لیے وہ لمحے بے حد قیمتی اور مقدس ہوتے تھے۔ جب وہ اس کمرے میں پھول لیکر آتا تھا۔

''غلام عباس! تم سے کتنی بار کہا ہے ہمارے پاؤں اس قابل نہیں جن پر تم یہ پھول نچھاور کرو۔ ایسا کر کے تم ان کی پاکیزگی کو بھی مجروح کرتے ہو اور میری ذات میری روح کے زخموں پر سے کھرنڈ اترنے لگتے ہیں۔ پاکیزگی، پارسائی، پاک دامنی، محبت ان لفظوں سے نا آشنا ہو چکی ہوں۔ ان پھولوں کی نرمی سے میرے زخموں کا مداوا ممکن نہیں۔'' درد جب لفظوں میں در آتا ہے تو سننے والے کی سماعت کو بھی زخمی کر دیتا ہے۔ غلاس عباس نے تڑپ کر اس کی جانب دیکھا۔

''ایسا مت کہیں بی بی! آپ کیا جانیں آپ کیا ہیں۔ میں نے پہلے بھی آپ سے کہا ہے کہ مجھے مت روکا کریں۔ اپنی زندگی پر میرا کوئی اختیار نہیں۔ میں نے کبھی اختیار کی تمنا بھی نہیں کی۔ بس چند لمحے مجھے عطا کر دیں غلام عباس کسی سے کچھ نہیں مانگتا نہ ہی آپ سے کسی چیز کا طلب گار ہے۔ بس ایک خواہش ایک آرزو ہے اس کو پورا کرنے دیں۔'' غلام عباس کی آنکھیں اب بھی جھکی ہوئی تھی۔ چاندنی کی آنکھیں اس کے چہرے پر ٹک گئیں۔ جس جگہ چہروں کی پہچان مشکل ہو جائے کون کیا ہے..... کیسا ہے؟ سمجھ ہی میں نہ آئے وہاں ایسا بے ریا شخص کیا جی پائے گا۔

''آج ایک بات پوچھیں غلام عباس..... کیا بتاؤ گے؟''

''پوچھیں بی بی.....''

''تم روزانہ میرے لیے پھول کیوں لیکر آتے ہو؟''

''پتا نہیں کیا بات ہے بی بی! لیکن آپ کو آواز دے کر جگانا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ اور چھوتا اس لیے نہیں کہ میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتا۔ آپ کی پاکیزگی مانع ہوتی ہے۔ اس لیے..... اس لیے آپ کو جگانے کا مجھے یہی طریقہ سمجھ آیا۔'' غلام عباس کا لہجہ بہت دھیما تھا اور چاندنی جیسے اس کی محبت کے اس انداز پر کانپ اٹھی تھی۔ اس کا زخم زخم وجود بھلا محبت کے اس انداز کا کہاں متحمل ہو سکتا تھا۔ اس کی پلکیں لرزنے لگیں۔ گرم گرم آنسو اس کی آنکھوں کے کناروں پر تھرکنے لگے۔ اپنے پھیلے ہوئے گھنیرے بالوں کو سمیٹ کر اس نے جوڑے کی شکل دی اور بہت خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ غلام عباس دیر تو اس کے بولنے کے انتظار میں کھڑا رہا اور جب وہ کچھ نہ بولی تو وہ بھی نہایت خاموشی سے کمرے سے نکل گیا۔ سامنے کرسی پر اس کا باسی گجرے اور دیگر سنگھار کی چیزیں رکھی تھیں۔ باہر کا ماحول اپنے آپ میں آنے لگا تھا۔ روشنیوں کے ہوتے ہی دھیمے دھیمے ساز و سر لہروں کی طرح اٹھنے لگے تھے۔

''محبتیں پانے کا جو طریقہ تم نے چنا تھا ناں..... آخر اس کا انجام یہی ہے۔ کیا بغاوت کبھی راس بھی آئی ہے۔ باغی کی سزا موت ہے اور تم..... تم خود دیکھ لو۔ ہر گزرتے دن اور رات میں کتنی بار مرتی ہو تم..... کیا جینا اس کو کہتے ہیں؟''

''کچھ دھندلے عکس اس کی آنکھوں کے سامنے آ رہے تھے۔ اس کے کچھ اپنے بھی تو تھے جن کو وہ کھو چکی تھی اور جب کچھ کھو جاتا ہے تو اتنی بڑی کائنات میں اس کو تلاش کرنا کہاں ممکن ہوتا ہے اور اب..... اب یہ غلام عباس..... یہ ایک بار پھر اس کے راستوں کے کانٹے

چننے نکل کھڑا ہوا ہے یہ جانے بغیر کے وہ کانٹے چن نہیں سکے گا ہاں محبت کے خارزار میں گھسیٹ کر اسے مزید زخمی ضرور کر دے گا۔

☆.....☆.....☆

صبح کا وقت تھا۔ سادات نگر کی چہل پہل حسب معمول تھی۔ بچے سب ہی سکولوں کو جا چکے تھے۔ فواد کو ایمرجنسی ٹیلی فون آیا تھا سو وہ بھی کلینک جا چکے تھے۔ انیقہ کے پیپرز ہونے والے تھے۔ اس لیے وہ کالج جانے کی بجائے گھر پر ہی تیاری کر رہی تھی۔ رات گئے تک پڑھنے کی وجہ سے وہ ابھی سوئی ہوئی تھی۔ روبیہ اور آریان سکول جانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ کہ انہیں شینا پھپھو والے کمرے سے بلند آوازیں سنائی دیں۔ روبیہ تیزی سے آگے بڑھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ پپا کسی بات پر اس کی مما کو ڈانٹ رہے ہیں۔ شینا پھپھو کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ عارب تایا ہی دھاڑے جا رہے تھے۔ پھر اس نے دیکھا کسی طوفان کی طرح وہ اپنے کمرے سے نکلے اور اماں بی کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ اماں بی چاشت کی نماز سے فارغ ہو کر تسبیح کرنے میں مصروف تھیں۔ جب وہ اندر داخل ہوئے.....ان کے خطرناک تیور اماں بی کو پہلی نظر میں ہی دکھائی دے گئے۔

''اماں بی.....کیا ہو رہا ہے اس گھر میں.....کیا سن رہا ہوں میں۔'' آتے ہی بلا تمہید انہوں نے قدرے سخت لہجے میں اماں بی کو مخاطب کیا۔

''عارب بیٹا.....سکون سے بیٹھ کر بات کرو۔ جو بھی کرنی ہے.....کیا سن لیا تم نے.....؟'' اماں بی کا سکون قابل دید تھا۔

''ایک طوائف زادی اس گھر میں کس لیے رہ رہی ہے.....اماں بی کیا آپ کے اصول ختم ہو چکے ہیں۔ مر چکی ہیں سادات نگر کی روایات.....'' عارب شاہ سخت برافروختہ تھے۔

''عارب پہلے اپنے لہجے کو درست کرو کہ کس سے مخاطب ہو.....یہ مسئلہ اٹھے گا میں جانتی تھی.....اسی لیے میں نے سب کو بلایا ہے.....اگر انتظار کر سکتے ہو تو چند لمحے انتظار کر لو.....ہر بات واضح ہو جائے گی۔'' اماں بی انہیں جواب دینے کے بعد دوبارہ اپنی ادھوری تسبیح کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ عارب شاہ پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ لیکن جانے کس مصلحت کے تحت خاموش ہو گئے۔ پھر کچھ ہی دیر میں گھر کے تقریباً تمام فرد اماں بی کے کمرے میں جمع ہو گئے۔

''میرا خیال ہے کہ جس کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے۔ اسے بھی بلا لیا جائے۔'' اماں بی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولیں۔ اور شینا پھپھو جا کر آریان کو اپنے ہمراہ لے آئیں۔ آریان کو اماں بی نے اپنے قریب بٹھا لیا اور طائرانہ نظر کمرے میں موجود افراد پر ڈالی۔ سب ہی خاموش اپنی اپنی جگہ سوچوں میں گم بیٹھے تھے۔

''میں ایک بہت اہم موضوع پر بات کرنا چاہتی ہوں لیکن اس سے پہلے یہ جاننا چاہوں گی کہ سادات نگر کے مکینوں کے لیے میرے کہے کی کتنی اہمیت ہے۔''

''اماں بی! یہ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ آج بھی اور آنے والے کل کو بھی اس گھر کے ہر فیصلے پر آپ کی مہر تصدیق ثبت ہوتی ہے۔

ابا میاں نہیں ہیں تو کیا ہوا..... ہمارے نزدیک آپ کا کہا ہوا بھی اتنا ہی محترم اور معتبر ہے جتنا کہ ان کا تھا.....'' اظہر چچا سلیقے سے بولے۔ اماں بی طمانیت بھرے انداز میں مسکرائیں۔

''تو بس ٹھیک ہے..... آریان بیٹی کے بارے میں پچھلے کچھ دنوں کے دوران ہونے والے انکشاف کے بارے میں سب جان ہی چکے ہوں گے..... میں نے آپ سب کو اس لیے بلایا ہے تاکہ اپنے فیصلے سے آگاہ کرسکوں کہ آریان اب اسی گھر میں رہے گی۔ انیقہ، روبیہ، مہوش اور انا کی طرح..... آپ میں سے کسی کو کوئی اعتراض تو نہیں.....'' انہوں نے بات ختم کرتے ہوئے عمیق نظروں سے سب کے چہروں کے تاثرات دیکھے سوائے عارب شاہ کے سب نارمل انداز میں بیٹھے ہوئے تھے۔

''ہمیں بھلا کیا اعتراض ہوسکتا ہے اماں بی! جب آپ نے فیصلہ کرلیا ہے تو پھر آپ کو کسی کی رائے لینے کی ضرورت نہیں.....'' بابر چچا بھی اماں بی کے حمایتیوں میں شامل ہوگئے۔

''تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے بابر..... ایک بیٹی کے باپ ہوکر سمجھ نہیں سکتے کہ اس جیسی لڑکی ہمارے گھر میں رہے گی تو ہماری بچیوں پر کیسے اثرات مرتب ہوں گے۔'' عارب شاہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولے۔

''اس جیسی سے تمہاری کیا مراد ہے عارب؟'' اماں بی کا لہجہ بے لچک تھا۔

''کیا اب سادات نگر کے مکین اپنے مقام سے اس حد تک گر چکے ہیں کہ انہیں سید گھرانوں اور کوٹھوں کا درمیانی فرق ہی نظر نہیں آسکتا۔''

''بھائی! یہاں آپ زیادتی کررہے ہیں۔ اس بچی کو ہمارے درمیان رہتے بہت دن گزر چکے ہیں۔ ایسی کون سی قابل اعتراض بات دیکھی آپ نے اس میں..... جس کی وجہ سے اس کا یہاں رہنا ہمارے گھر کے ماحول کو خراب کردے۔'' اظہر شاہ عارب تایا کی بات سن کر متحمل لہجے میں بولے۔ حقیقتاً تو یہ ٹھیک تھا کیونکہ سب ہی آریان کی بے بسی سمجھ رہے تھے۔ آریان وہ اس وقت دہرے عذاب سے گزر رہی تھی۔ ایک طرف وہ ماں کے دکھ کو اپنی جان پر سہہ رہی تھی تو دوسری طرف زندگی کی سانسیں اس پر کسی امتحان کی طرح گزر رہی تھیں۔ وہ اماں بی کے کمرے میں بیٹھی تھی لیکن اسے یوں لگ رہا تھا وہ کسی عدالت کے کٹہرے میں کھڑی ہے اور ارد گرد موجود لوگ اس کی ذات کو طنز و تشنیع کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ لفظوں کے پتھر اس کی روح کو زخما رہے تھے لیکن وہ خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں کو بہنے سے روکنے کی سعی میں مصروف تھی۔

''بس میں نے کہہ دیا ہے کہ میں کم از کم یہاں برداشت نہیں کرسکتا۔ اس گندگی کے ڈھیر سے اپنے گھر کو آلودہ نہیں کرسکتا۔''

''عارب بھائی! پلیز اس طرح تلخ باتیں مت کریں..... اس بچی کا آگے پیچھے کوئی نہیں۔ حالات کی ستائی ہوئی ہے۔ اگر ہم اسے سہارا نہیں دیں گے تو آئندہ زندگی میں اس کے ساتھ جو کچھ ہوگا ہم سب اس کے ذمہ دار ہوں گے۔'' اظہر شاہ بولے۔

''کس لیے ذمہ دار ہوں گے..... ہمارا اس کے ساتھ رشتہ کیا ہے؟..... رحمدلی اپنی جگہ لیکن کیا ہر بے سہارا، گھر سے بھاگی ہوئی

آوارہ لڑکی کو گھر میں پناہ دے دیں کہ شاید یہ واقعی بے قصور ہے۔ یہ گھر ہے..... اسے گھر ہی رہنے دو..... دارالامان مت بناؤ۔'' عارب شاہ کا ہر ہر لفظ آریان کے دل پر ایک نیا زخم بناتا جا رہا تھا۔ آنسو اب اس کے اختیار سے باہر ہو گئے تھے۔ وہ بے آواز رونے لگی۔ وہاں موجود خواتین اس کے دکھ کو محسوس کر رہی تھیں۔ اس کے درد کو سمجھ رہی تھیں لیکن اس معاملے میں نہیں بول سکتی تھیں۔ کہ سادات نگر کی یہ بھی ایک روایت رہی تھی کہ فیصلے صرف مرد کیا کرتے تھے خواتین کو دخل اندازی کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی لیکن سب ہی خواتین فطرتاً حساس اور نرم دل واقع ہوئی تھیں۔ اس لیے عارب شاہ کا رویہ انہیں اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ خاص طور پر شینا پھپھو آریان کے سامنے بے حد ندامت محسوس کر رہی تھیں۔

''یعنی تمہیں آریان کے یہاں رہنے پر اعتراض ہے..... تم ہمارے فیصلے پر انحراف کر رہے ہو۔'' اماں بی درشتگی سے بولیں۔

''اماں بی! آپ اسے انا کا مسئلہ مت بنائیں..... میں آپ کے فیصلے سے انحراف نہیں کر رہا۔ اس گھر کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے رائے دے رہا ہوں جو مجھے ٹھیک نہیں لگے گا میں اس سے اختلاف کروں گا۔''

''تو ٹھیک ہے..... آریان کو یہاں رکھنے کا فیصلہ میرا ہے..... تمہیں اگر اس کے یہاں رہنے پر اعتراض ہے تو میں بھی یہاں نہیں رہوں گی۔ بات آریان کی نہیں میری اہمیت کی ہے۔ جہاں میری بات کو اہمیت ہی نہیں دی جاتی تو وہاں رہ کر میں کیا کروں گی۔'' اماں بی قطعیت سے بولیں۔

''اماں بی! آپ محض ایک چھوٹی سی بات کو ایشو بنا رہی ہیں۔ میں جس وجہ سے مخالفت کر رہا ہوں اس کو سمجھنے کی کوئی کوشش نہیں کر رہا..... ہماری ایک عزت ہے شہر میں ایک مقام ہے۔ ہمیں زیب نہیں دیتا کہ اس لڑکی کو اپنے گھر میں رکھیں۔ کل کو اگر انگلیاں اٹھیں گی تو اس سے اس کا کچھ نہیں بگڑے گا ہماری ساکھ خراب ہو گی۔ ان جیسیوں کا کیا ہے ایک چھوڑ سو ٹھکانے ڈھونڈ سکتی ہیں۔'' عارب شاہ کا زہریلا لہجہ آریان کی رگ و پے میں گردش کرتے خون میں شامل ہو کر اس کے سارے وجود کو نیلا کر گیا۔ اذیت کے اس کڑے احساس نے تڑپا دیا تھا اسے لیکن افسوس کہ وہ تو حالات کے دھارے پر بہتا ایک بے وزن وجود تھی۔ لہریں اس کے ساتھ جو سلوک بھی کرتیں اسے سہنا تھا۔

''بس عارب بھائی..... بس..... آپ نے کہا ہم نے سن لیا۔ بابر چچا نے ہاتھ اٹھا کر عارب شاہ کو مزید بولنے سے روک دیا۔ آپ مسلسل ایک پاک باز اور معصوم لڑکی کو تحقیر کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ آپ کو یہ قبول نہیں تو ٹھیک ہے آپ اس کے لیے اپنے پورشن کے دروازے بند کر دیں۔ لیکن سادات نگر سے نکالنے کا فیصلہ آپ اکیلے نہیں کر سکتے۔ اس گھر میں پانچ خاندان آباد ہیں۔ آریان کو آپ ٹھکرا رہے ہیں ہم سب نہیں۔ یہ میرے ساتھ رہے گی..... جس طرح مجھے مہوش عزیز ہے آریان بھی ویسی ہی ہے میرے لیے۔ اٹھو بیٹا..... آج کے بعد تم ہمارے ساتھ رہو گی..... زاہدہ بیگم اٹھیے آریان بیٹی کو اپنے ساتھ لے جائیے۔'' بابر چچا نے پہلے آریان اور پھر زاہدہ چچی کو مخاطب کیا۔ زاہدہ چچی خاموشی سے اٹھیں تاکہ آریان کو اپنے ساتھ پورشن میں لے جائیں۔ آریان نے ایک نظر اماں بی کی طرف ڈالی۔ اماں بی، بابر چچا کے فیصلے سے بہت مطمئن اور خوش دکھائی دے رہی تھیں۔

''جاؤ بیٹی! مجھے یقین ہے کہ آج کے بعد اس گھر میں تمہیں دوبارہ سوال و جواب کے کڑے امتحان سے نہیں گزرنا پڑے گا۔ اب یہ گھر تمہارا ہے..... تمہیں اب کوئی تکلیف..... نہیں ہوگی یہاں۔ سادات نگر کے مکین محبتوں کے معاملے میں تہی داماں سہی..... لیکن اتنے حوصلے والے ہیں کہ تمہیں پناہ میسر کر سکیں۔ بابر اور زاہدہ کو اپنے والدین سمجھ کر رہو گی تو سکھی ہوگی۔'' اماں بی نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔ وہ سر جھکا کر زاہدہ چچی کے ہمراہ کمرے سے نکل گئی۔ عارب شاہ اپنے چہرے پر بہت سی نگاہوں کی تپش محسوس کر رہے تھے۔ لیکن انہیں اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا ان ملامتی نگاہوں کے سامنے وہ شرمندہ نہیں تھے۔ سو بہت سکون سے اٹھ کر باہر نکل گئے۔ یہ ہی بہت تھا کہ اب آریان کی صورت انہیں اپنے اردگرد دکھائی نہیں دیتی تھی۔

☆.....☆.....☆

کلینک میں داخل ہوتے ہی فواد کو کچھ غیر معمولی محسوس ہوا۔ آفس میں سر پکڑے بیٹھا کاشف، اپنے سامنے پڑے پانی کی ادھ بھرے گلاس کو یوں گھور رہا تھا جیسے ہپناٹزم کی مشق کر رہا ہو۔

''تمہیں کیا ہوا ہے.....'' فواد نے اس کا کندھا ہلایا۔

''یہی تو افسوس ہے کہ ابھی تک کچھ ہوا کیوں نہیں.....'' وہ تو جیسے جلا بیٹھا تھا۔

''یہ بھلا کیا بات ہوئی۔'' فواد مسکراتے ہوئے اس کے سامنے والی چیئر پر بیٹھ گئے۔

''تم سے اگر اپنا مریض نہیں ناں سنبھالا جاتا تو کوئی پنجرہ منگوا دو جس میں طوطے کی طرح بند کر دیں اسے حد ہوگئی۔ کلینک کو پاگل خانہ بنا کر رکھ دیا ہے.....''

''یار بے ضرر سا شخص ہے وہ۔ کیا کہہ دیا اس نے تمہیں؟''

''ابھی کچھ نہیں کہا مگر کہہ بھی سکتا ہے۔ صبح صبح اکبر بھاگا بھاگا میرے پاس آیا کہ وہ مریض گیٹ سے باہر جانے کی کوشش کر رہا ہے۔ نذیر کمپاؤنڈر اور وارڈ بوائے نے بڑی مشکل سے قابو میں کیا ہوا تھا۔ اتنی مشکل سے کنٹرول کر کے اسے وارڈ میں لائے اور پیروں میں سنگل ڈال کر بیڈ کے ساتھ باندھ دیا پھر ناشتہ کرانے کی کوشش کی تو نواب صاحب نے گلاس اٹھا ادھر پٹخ دیا..... چائے کا کپ اکبر کے پیروں پر دے مارا..... وہ جلے پیر کی بلی کی طرح پورے وارڈ میں اچھلنے لگ گیا۔ ٹرے اٹھا کر نذیر کے منہ پر دے ماری..... گال پھاڑ ڈالا اس کا تین چار ٹانکے لگانے پڑے۔'' کاشف نے داستان الم ایک ہی سانس میں کہہ سنائی۔

''یار! اتنا تو معصوم شخص ہے وہ..... مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ سب اس نے کیا ہوگا۔''

''تو پھر ٹھیک ہے تمہیں اگر یہ معصوم شخص بہت پیارا ہے ناں تو رہو اپنے اس کلینک کم پاگل خانے میں اس کے ساتھ..... مجھے تو چھٹی دو۔ میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔ کل کلاں کو میرا سر پھاڑ ڈالے یا مجھ پر حملہ کر دے تو میرے تو سارے ارمان خاک میں مل گئے ناں۔'' کاشف اپنے مخصوص انداز میں بولا۔

''لیکن پتا بھی تو چلے کہ آخر وہ کہتا کیا ہے..... کس بات پر وہ اتنے غصے میں آ گیا وہ تو بہت خاموش اور سمٹی سمٹائی شخصیت کا مالک ہے۔''

''اللہ جانے! صبح سے کہے جا رہا ہے مجھے جانے دو..... میں نے جانا ہے..... میں آ رہا ہوں۔ میں جاؤں گا۔ میں آؤں گا۔ خدا جانے کون سے سیارے کی مخلوق اٹھا کر لے آئے ہو کون سی بولی بولتا ہے میری تو عقل سے باہر ہے۔'' کاشف جل بھن کر بولا۔

''چلو میرے ساتھ جا کر دیکھتے ہیں.....''

''نہ بابا..... تم جاؤ۔ مجھے اپنی زندگی فی الحال بہت پیاری ہے۔ ہائے میری فریال تمہاری محبت میں یہ ڈاکٹر جیسا منحوس پیشہ جان کو چمٹ گیا۔'' وہ آہ بھر کر اپنی اکلوتی منگیتر کو یاد کرنے لگا جس کی خواہش پر اس نے میڈیکل جوائن کیا تھا۔

''تم کبھی سدھر نہیں سکتے۔'' فواد ٹیبل پر سے اسٹیتھی سکوپ اٹھا کر وارڈ کا راؤنڈ لینے چلے گئے۔ نذیر اور اکبر نے اسے بری طرح جکڑ رکھا تھا اور نرس سلمٰی اس کے بازو میں انجکشن لگانے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن اس کی مسلسل موومنٹ کی وجہ سے وہ اس میں ناکام ہو رہی تھی۔

''کیا ہو رہا ہے..... یہ کیا طریقہ ہے؟'' فواد گرج کر بولے۔ نذیر اور اکبر نے گھبرا کر مریض کے بازو چھوڑ دیئے۔

''جس رویئے سے بچانے کی خاطر میں نے اسے یہاں ایڈمٹ کیا ہے تم لوگ وہی سلوک اس کے ساتھ روا رکھو گے تو کیا فرق پڑے گا اس کی شخصیت پر..... احمق کہیں کے۔'' آخری لفظ فواد نے خود کلامی کے سے انداز میں کہے۔

''سر جی! اس کی دوائی اور ٹیکے کا ٹائم ہو گیا ہے۔'' سلمٰی نے کہا۔

''لیکن دوا سے پہلے اسے کچھ کھانے کو دو.....''

''پر سر! یہ کچھ کھاتا بھی تو نہیں..... یہ دیکھیں صبح اس نے کیا حال کر دیا میرا۔'' نذیر نے اپنا گال آگے کر کے دکھایا۔

''ہاں سن چکا ہوں..... بہر حال تم جاؤ کچھ لے کر آؤ کھانے کو میں کوشش کرتا ہوں۔'' فواد کہہ کر بہت آرام سے اس کے قریب بیٹھ گیا۔

''بابا.....'' بہت ملائمت سے اسے پکارا۔ تو وہ جیسے چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔

پتا نہیں ان کے سامنے وہ اس قدر سلجھا ہوا کیوں بن جاتا تھا۔ وہ آج تک یہ سمجھ نہیں پائے تھے کہ ان کے سامنے تو کبھی اس نے کوئی اوٹ پٹانگ حرکت نہیں کی تھی۔

''دیکھو..... مجھے جانے دو..... میں نے جانا ہے..... میں آ رہا ہوں..... میں جاؤں گا۔ میں آؤں گا.....'' بے ربط لفظ اس کے منہ سے نکل رہے تھے۔

''بابا..... کہاں جانا ہے آپ کو.....'' فواد نے اسی طرح نرم لہجے میں کہا۔ نذیر کمپاؤنڈر اتنی دیر میں ڈبل روٹی کے دو تین پیس اور دودھ کے ایک گلاس پر مشتمل ناشتہ لے آیا۔

''میں..... مجھے جانا ہے..... میں جاؤں گا۔'' اس کی جیسے ایک ہی رٹ تھی۔

''چلیں ٹھیک ہے آپ نے جہاں جانا ہے میں لے چلوں گا آپ کو..... لیکن پہلے کچھ کھالیں۔''

''لے چلو گے.....'' اس کے لہجے میں شک تھا۔

''ہاں لے چلوں گا.....''

''.....تم..... لے چلو گے.....''

''ہاں بابا..... جہاں کہیں گے لے چلوں گا لیکن پہلے آپ کو یہ کھانا کھانا ہوگا پھر دوا لینی ہوگی۔''

''ٹھیک ہے.....'' وہ رضامند ہو گیا تھا۔ فواد نے ڈبل روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے دودھ میں بھگو کر اسے کھلانے شروع کر دیئے۔ نرس سلمیٰ، نذیر اور اکبر ہونق بنے دیکھ رہے تھے۔ آج سے پہلے انہوں نے کسی ڈاکٹر کو اپنے مریض کے ساتھ اس قدر ان ٹچ نہیں دیکھا تھا۔ فواد خود بھی بہت ریزرو تھے لیکن انہوں نے جس سچویشن اور حالات میں اس کو دیکھا تھا وہ سمجھتے تھے کہ وہ ان کی خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔ سو ایک لحاظ سے انہیں اس سے قلبی لگاؤ سا محسوس ہوتا تھا۔

وہ بہت توجہ کے ساتھ بغیر مزاحم کیے کھانا کھاتا رہا۔ پھر گلاس میں باقی بچا ہوا دودھ پی لینے کے بعد اس نے اردگرد ایک نظر ڈالا۔

''اب..... اب مجھے جانا ہے..... مجھے لے چلو.....''

''نہیں بابا! اب کچھ دیر آرام کریں..... آپ تھک گئے ہوں گے۔'' فواد کا انداز ٹالنے والا تھا۔

''آرام کروں.....'' وہ تیز لہجے میں بولا..... ''میں نے کہا..... مجھے جانا ہے..... میں جاؤں گا..... مجھے جانے دو۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا گلاس ٹھائیں کی آواز سے سامنے دیوار پر دے مارا۔ فواد نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑنے کی کوشش کی۔

''تم..... تم نے جھوٹ بولا..... تم نے کہا لے چلو گے.....'' وہ چلانے لگا۔

وارڈ میں موجود دوسرے مریض سر اٹھا اٹھا کر دیکھ رہے تھے۔

''بابا..... میں نے انکار تو نہیں کیا۔ میں لے چلوں گا آپ کو.....'' فواد آگے بڑھے لیکن اس نے ان کے سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کر ایسا بھرپور دھکا دیا کہ وہ گرتے گرتے بچے۔ پہلی بار اس کی جنونی کیفیت ان کے سامنے آئی تھی۔

''جھوٹ..... تم سب جھوٹے ہو..... تم نہیں لے کر جاؤ گے میں نے جانا ہے۔'' وہ اپنے آپ کو زنجیروں سے آزاد کرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ فواد اسے یونہی چھوڑ کر آفس میں آ گئے۔

''کاشف۔ ہی از ریئلی آسیریس کیس.....'' فواد تھکے ہوئے لہجے میں بولے اور کرسی پر سر تھام کر بیٹھ گئے۔

''نہیں میرے بھائی وہ تو بے چارہ بے ضرر اور معصوم سا شخص ہے۔'' کاشف نے لطیف سے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''طنز مت کرو اس سے پہلے میں نے اس کی ایسی کیفیت نہیں دیکھی..... کیا اسے اسی طرح کے دورے پہلے بھی پڑتے رہے

ہیں۔'' فواد نے پوچھا۔

''نہیں پہلے ان دوروں کی شدت بہت کم ہوتی تھی۔ اب تو بہت شدید ہیں۔ اس کے اس طرح ہسٹریائی انداز میں چیخنے اور چلانے کا وارڈ کے دوسرے مریضوں پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔'' کاشف نے کہا۔

''یہ تو ہے..... پھر تمہارے خیال میں کیا ہونا چاہئے۔''

''میرا خیال ہے اس کو اوپر کے کمرے میں شفٹ کر دو۔ کاشف نے پرخیال انداز میں کہا۔

''نہیں ..... یہ خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔ ملازمین کی ذرا سی غفلت سے اس کی جان بھی جا سکتی ہے کیونکہ اس کے آج کے بی ہیویئر سے یہ اندازہ ہو چکا ہے مجھے کہ وہ مینٹلی اپ سیٹ ہے اور ایسے لوگ کسی وقت بھی کچھ کر سکتے ہیں جو ان کے لیے یا کسی دوسرے کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔'' فواد نے کاشف کی تجویز رد کر دی۔ اسی وقت بابر شاہ نے آفس میں قدم رکھا۔ فواد ان کو دیکھ کر حیران سے ہو گئے۔ کاشف نے آگے بڑھ کر ان سے مصافحہ کیا۔

''ابو آپ..... خیریت تو ہے ناں.....؟'' انہوں نے پوچھا بابر شاہ بہت کم ان کے کلینک آتے تھے۔

''ہاں خیریت ہی ہے۔ گھر سے کسی کام نکلا تو اماں بی نے اپنی دواؤں کی پرسکرپشن تھما دی۔ یہیں قریب ہی ہاشمی بلڈرز ہیں ناں۔ وہیں کام تھا مجھے تو سوچا جاتے ہوئے پرچی تمہیں دے جاؤں..... گھر واپسی پر یاد سے لیتے آنا.....'' انہوں نے جیب سے کاغذ نکال کر ٹیبل پر رکھا۔ کاشف آفس سے کسی کام کا بہانہ کر کے نکل گیا تھا کہ ممکن ہے باپ بیٹے کو کوئی ضروری بات کرنا ہو۔

''ابو! آئی تھنک بات کچھ اور ہے.....'' فواد نے بابر شاہ کے چہرے پر چھائے سکوت اور لہجے کی سنجیدگی سے اخذ کیا تھا۔ وگرنہ بابر شاہ اتنے چھوٹے سے کام کے لیے ان کے کلینک پر کبھی نہ آتے کہ دوائیاں تو میڈیکل سٹور سے مل جاتی ہیں۔ فواد کی بات سن کر ایک ثانیے کو بابر شاہ نے ان کے چہرے کو دیکھا۔

اولاد جب کندھے سے کندھا ملا کر چلنے لگ جائے۔ ماں باپ کے لیے کس قدر مشکل ہو جاتا ہے اپنا آپ چھپانا۔

''ہوں..... فہدی! تم نے اپنی شینا پھپھو سے کوئی بات کی تھی؟'' انہوں نے فواد سے پوچھا۔

''کس سلسلے میں.....'' فواد سیدھے ہو بیٹھے یعنی ان کا خیال درست تھا کہ کچھ نہ کچھ ہوا ہے اب کیا ہوا ہے یہ تو بابر شاہ ہی بتا سکتے تھے۔

''آریان سے متعلق.....''

''جی ہاں..... کی تھی..... گھر میں اس مسئلے پر کوئی بات ہوئی ہے۔'' انہوں نے پوچھا۔

''ہاں شینا نے اماں بی سے بات کی اور بعد میں اماں بی نے گھر کی خواتین کے ذریعے بات ہم تک پہنچائی۔ باقی سب تو ٹھیک ہی تھے بس عارب بھائی نے بہت ہنگامہ کیا.....''

''لیکن کس بات پر.....'' فواد کوفت بھرے لہجے میں بولے۔ اسے عارب تایا اپنی انہی عادت کی وجہ سے کچھ خاص پسند نہیں

تھے۔ کبھی کبھی تو شینا پھپھو کے لیے ان کا دل بہت دکھتا تھا کس قدر نائس خاتون اور عارب تایا جیسے شخص کے ساتھ زندگی کے اتنے سال کس طرح گزارے ہونگے انہوں نے.....

''یہی بات ایشو بنا رکھی تھی کہ آریان کا بیک گراؤنڈ ٹھیک نہیں۔ اب تک آریان انہی کے پاس تھی۔ لیکن ان کے اس طرح ہنگامہ کرنے کے بعد میں آریان کو اپنے پورشن میں لے آیا ہوں..... تم پریشان نہیں ہونا۔ آریان کے مسئلے میں تم اکیلے نہیں ہو..... میں تمہارے ساتھ ہوں..... اس بچی کی عزت اور زندگی بچانے کے لیے جو بھی مجھ سے بن پڑے گا میں کرونگا۔'' بابر شاہ نے فواد کو اپنے ساتھ کا یقین دلایا تو وہ جیسے خود کو ہلکا پھلکا تصور کرنے لگے۔

''تھینک یو..... تھینک یو ویری مچ..... میں سچ مچ خود کو اکیلا محسوس کر رہا تھا۔''

''پگلے! ماں باپ کس لیے ہوتے ہیں۔ ہر دکھ اپنی ذات پر سہہ جاتے ہیں اولاد کی خوشی کی خاطر..... آریان کو میں اپنی بیٹی بنا چکا ہوں۔ اس لیے اب اس کی حفاظت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ بہر حال ابھی تو میں تمہیں لینے آیا تھا کہ میرے ساتھ ایس۔ پی کے آفس چلو..... پولیس کو پہلی فرصت میں اعتماد میں لینا ہمارے لیے زیادہ سود مند ثابت ہوگا۔ پہلے ان بدمعاشوں کا تو معاملہ نمٹائیں۔ جو آئے روز پریشان کر رہے ہیں۔ ستارہ بیگم کے بارے میں بعد میں سوچیں گے۔'' بابر شاہ یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''ابو! میرا خیال ہے کہ آپ خود ایس۔ پی سے مل لیں..... آپ کا دوست ہے..... آپ زیادہ بہتر طور پر اس سے بات چیت کر سکیں گے۔ میرا ذہن اس وقت اپ سیٹ ہے۔''

''او یار..... کیوں اپ سیٹ ہے؟ کوئی وجہ بھی تو ہو.....'' بابر شاہ نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ اسی پل کاشف' نذیر کے ہمراہ اندر داخل ہوا۔ اس نے بابر شاہ اور فواد کے مکالمے کا آخری حصہ سن لیا۔

''وجہ بہت معقول ہے جناب! ان کے کلینک پر ایک وی۔ آئی۔ پی مریض تشریف فرما ہیں۔ سو ان کا اپ سیٹ ہونا لازمی ہے۔''

''کیا مطلب؟ کیا کسی بڑے گھر سے تعلق رکھتا ہے وہ.....'' بابر شاہ دلچسپی سے بولے۔

''جی نہیں..... موصوف نے انہیں سڑک پر بچوں سے پتھر کھاتے دیکھا تو پکڑ کر کلینک لے آئے..... بس تب سے انہوں نے جو سلوک ہمارے ساتھ اور ہمارے مریضوں کے ساتھ روا رکھا ہوا ہے الامان الحفیظ.....'' کاشف ایک ہی لے میں بولے جا رہا تھا۔

''بند بھی کرو اپنی بکواس..... ابو ایسی کوئی بات نہیں..... اصل میں میں ایک ایکسپیریمنٹ کر رہا ہوں اس پر.....'' فواد نے کہا۔

''تم تو ایکسپیریمنٹ کر رہے ہو اور اس نے جو نذیر اور اکبر کے اوپر کیا تھا وہ کیا تھا؟''

کاشف کی بات سن کر بابر شاہ کی توجہ نذیر کے بینڈیج والے گال پر پڑ گئی۔

''اسے کیا ہوا.....؟''

''یہ ڈاکٹر فواد کی لیبارٹری کے حملے کا شکار ہوئے ہیں۔''

''میں سمجھا نہیں.....'' بابر شاہ کی توجہ اپنی پریشانی سے وقتی طور پر ہٹ گئی۔

''جن پر ہمارے ڈاکٹر صاحب تجربہ کر رہے ہیں۔ اپنے نذیر صاحب انہی کے تجربے کا شکار ہوئے ہیں۔''

''فواد! یہ تو بہت خطرناک بات ہے.....تم نے ایسے مریض کو اپنے کلینک میں کس لیے رکھا ہوا ہے۔ یہ مینٹل ہاسپٹل تو نہیں۔''

''ابو! وہ عام حالات میں نارمل رہتا ہے کبھی کبھار ایسا ہوتا ہے۔''

''بہر حال اسے یہاں سے شفٹ کرو.....جس طرح اس نے اسے زخمی کیا۔ کسی اور کو بھی کر سکتا ہے بلکہ دورے کی حالت میں ایسے لوگ قتل تک کر دیتے ہیں اور انہیں پتا نہیں چلتا۔'' بابر شاہ نے کہا۔

''مجھے جانے دو.....میں نے جانا ہے.....چھوڑو مجھے.....میں آؤں گا.....میں جاؤں گا۔'' آفس کے ساتھ والے کمرے سے اچانک بہت اونچی آواز بلند ہوئی۔

''چلیے جناب، ریڈیو پھر آن ہو گیا۔'' کاشف نے بیزاری سے کہا۔

''آخر اس کے ساتھ مسئلہ کیا ہے.....کون ہے.....کیا بیک گراؤنڈ ہے اس کا؟ کچھ اتا پتا بھی ہے یا یونہی فلاح دارین حاصل کرنے چل پڑے ہو۔'' بابر شاہ نے فواد سے پوچھا۔

''نہیں ابو! اس کے بیک گراؤنڈ کے بارے میں میں کچھ نہیں جانتا۔ کافی دن پہلے روڈ پر میں نے پہلی بار اسے انتہائی زخمی حالت میں دیکھا تھا۔ بچے اس کو پتھر مار رہے تھے۔ پتا نہیں میرے دل میں اس کے لیے کچھ سی کیوں پڑی۔ میں نہیں جانتا۔ بس یہ سوچ ذہن میں ابھری کہ مجھے اس شخص کو بچانا چاہیے۔ بس اس وقت سے یہ میرے کلینک پر ہے۔''

''کیا اس کی بیماری آخری سٹیج پر ہے۔'' بابر شاہ نے پوچھا۔

''نہیں ابو! اس کے ٹھیک ہونے کے ایٹی پرسنٹ چانس ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اس کو توجہ اور ٹریٹمنٹ ملے تو یہ جلدی ٹھیک ہو سکتا ہے۔'' فواد نے کہا۔

''اور یہ جو کچھ بول رہا ہے.....اس کا کیا مطلب ہے.....؟ کہاں جانا چاہتا ہے؟ کسی جگہ کا نام بھی لیتا ہے؟''

''نہیں انکل! کسی جگہ کا تو نام نہیں لیتا.....لیکن لگتا ہے کہ بے چارہ بڑی بری چوٹ کھائے بیٹھا ہے.....''

''کہیں کسی کوٹھے والی کے عشق اور فرقت میں اس کا یہ حال نہ ہو گیا ہو۔'' کاشف اپنی عادت کے مطابق اوٹ پٹانگ ہانکے جا رہا تھا اس بات سے بے خبر کے بابر شاہ پر اس کے ان جملوں نے اثر کیا تھا۔ انہوں نے ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر کاشف کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے کا رنگ ایک لمحے کو متغیر ہوا تھا۔ جو فواد کی نظروں سے بھی چھپا نہ رہ سکا۔

''کاشف یار! کسی کسی وقت بولنے سے پہلے سوچ بھی لیا کرو.....'' پھر وہ بابر شاہ سے مخاطب ہوئے۔

''نہیں ابو! ایسی کوئی بات نہیں بس کسی کسی وقت دورے کی حالت میں اس کی سوئی اڑ جاتی ہے۔ عموماً خاموش ہی رہتا ہے۔ بس

دورے کی حالت میں ہی اسے بولتے سنا ہے اور یہی جملے دہراتا ہے۔ پتا نہیں اس کے پس پردہ کیا کہانی ہے۔'' فواد جیسے باتوں میں بابر شاہ کا دھیان بٹانے کی کوشش کرنے لگے۔ بابر شاہ بالکل خاموش تھے۔ جیسے وہاں موجود ہی نہ ہوں۔ پھر وہ کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''اچھا..... میں..... چلتا ہوں..... میں خود ہی مل لوں گا..... ایس۔ پی سے۔'' عجیب سے الجھن آمیز انداز میں کہہ کر وہ باہر جانے کو پلٹے۔ ساتھ والے کمرے سے متواتر آوازیں آرہی تھیں۔ ان کے قدر غیر ارادی طور پر اس طرف اٹھ گئے۔ حالانکہ ان کا ادھر جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

''انکل! ادھر مت جایئے گا۔ اس وقت وہ دورے کی کیفیت میں ہے۔'' کاشف نے انہیں اس طرف جاتے دیکھ کر پیچھے سے کہا۔ لیکن انہوں نے جیسے سنا ہی نہ تھا۔

''ابو..... نہ جائیں ادھر۔ وہ آپ کو کہیں زخمی نہ کردے۔'' فواد نے بھی روکا لیکن انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں خاموش کرادیا۔ اور خود دھیمے قدموں سے چلتے اس کمرے کے دروازے پر پہنچ گئے۔ جہاں وہ چلا رہا تھا۔ دروازے کا ایک پٹ کھلا ہوا تھا۔ انہوں نے کمرے کے اندر جھانکا۔ فرش پر ادھر ادھر برتن' بستر کی چادر اور جانے کیا کیا الا بلا بکھرا پڑا تھا اور وہ بیڈ پر ایک کونے میں بیٹھا ہوا تھا۔ پیروں میں زنجیریں تھیں۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور ہونٹوں پر یہی الفاظ تھے۔

''مجھے جانا ہے..... میں آؤں گا..... میں جاؤں گا..... چھوڑو مجھے جانے دو..... مجھے لے چلو.....'' بابر شاہ کی نظریں اس کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں۔ وہ بہت عام سے انداز میں اس کو دیکھ رہے تھے۔ کہ اچانک ان کے ذہن میں کچھ الجھن سی پیدا ہوئی۔ یونہی دیکھتے دیکھتے الجھن آمیز لکیریں ان کی پیشانی پر نمودار ہوگئیں۔ انہوں نے پرسوچ انداز میں آنکھیں سکوڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

کونسی چیز دماغ کو پہنچ رہی تھی وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ اضطراری انداز میں ہونٹ کاٹتے وہ دوبارہ پلٹ آئے۔ فواد کو اپنے ابو کا یہ انداز بہت غیر معمولی اور عجیب لگا تھا۔ وہ بے خیالی میں چلتے ہوئے ان کے قریب آگئے۔ ان کی نظریں تو فواد کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں لیکن فواد یقین سے کہہ سکتے تھے کہ بابر شاہ ان پر نظریں جمائے رکھنے کے باوجود انہیں نہیں دیکھ رہے تھے۔ ان کی باطنی آنکھیں کہیں اور دیکھ رہی تھیں۔

''فہدی! تم اس کا بہت خیال رکھنا..... اسے کہیں جانے مت دینا۔'' بابر شاہ کے منہ سے نکلنے والے جملے غیر متوقع تھے۔ فواد کے ذہن میں کئی سوچوں نے بیک وقت سر ابھارا۔

''کیا ہے اس شخص میں کہ پہلے میں نادانستگی میں اس کے سحر میں گرفتار ہوا اور اب ابو بھی.....'' وہ الجھن آمیز انداز میں اپنے ابو کے چہرے کو دیکھ رہے تھے۔ جہاں کوئی تاثر نہیں تھا۔ بابر شاہ بات ختم کرکے دوبارہ واپسی کے لیے پلٹے..... اور بہت آہستہ روی سے قدم اٹھاتے آفس سے نکل گئے۔ کاشف ان کو جاتے دیکھ رہا تھا۔ اس سارے دورانیے میں وہ کبھی بابر شاہ کو اور کبھی فواد کو دیکھتا رہا' ان کے تاثرات نوٹ کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ بابر شاہ کے جانے کے بعد وہ بھی کندھے اچکا تا وارڈ کی طرف

چلا گیا۔فواد اپنے ابو کے بارے میں سوچنے لگے۔

''کیا شناسائی ہو سکتی ہے ابو کی اس شخص سے.....کیا زندگی میں پہلے کبھی یہ ملے ہیں؟''

اور دوسری طرف بابر شاہ کی سوچ بھی اس سے مختلف نہیں تھی۔ پتا نہیں کیا بات تھی وہ شخص انہیں کچھ شناسا لگا تھا۔انہیں یاد نہیں آ رہا تھا کہ انہوں نے پہلے اسے کہاں دیکھا..... پتا نہیں دیکھا بھی تھا یا نہیں۔ کہ بعض چہرے یونہی شناسا اور مانوس سے لگتے ہیں۔لیکن یہ بات تو طے تھی کہ اس شخص کو دیکھ کر بابر شاہ کے الجھے ہوئے ذہن کو ایک اور نئی الجھن مل گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

تھکے ہوئے پیروں میں اتنی سکت نہیں تھی کہ اس کے وجود کا بوجھ سہار سکتے۔ وہ تقریباً خود کو گھسیٹتے ہوئے کمرے تک لائی تھی.....آراستہ و پیراستہ کمرہ، نادر و نایاب قیمتی چیزوں سے سجا اس کا یہ کمرہ.....اگر کسی کو کہتی کہ اس کمرے میں اس کا دم گھٹتا ہے تو وہ اس کا مذاق اڑاتا.....اگر وہ کہتی کہ اس کمرے میں رہنے سے بہتر تو یہ سمجھتی ہے کہ چھوٹی سی جھونپڑی میں رہ لے تو سننے والا اسے بے وقوف گردانتا۔لیکن حقیقت یہی تھی اسے یہ آسائش نہیں چاہئے تھی۔ یہ مخملیں قالین، نرم گرم بستر، اطلس و کمخواب کے ملبوسات۔ان میں سے کوئی چیز اس کے لیے کشش نہیں رکھتی تھی۔اس لیے کہ اس سب کے عوض اس کی روح اس کا وجود رہن تھا.....اس کی ذات گروی تھی۔اور جب آزادی کا احساس ختم ہو جائے تو پنجرہ سونے کا ہو چاہے تیلیوں کا..... پرندے کے لیے زندگی سے عدم دلچسپی کے لیے یہی بات کافی ہے کہ وہ آزاد نہیں.....قید ہے اور قید بھی ایسی کہ اسی پنجرے کے در و دیوار سے سر ٹکرا ٹکرا کر ایک نہ ایک دن اسے مر جانا ہے لیکن آزادی کا سانس اسے اب نصیب نہیں ہونا.....اس کے ساتھ بھی تو کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ آزادی.....اور آزادی کی لطافتیں سب ہی کچھ ایک سہانا خواب تھیں۔اسے لگتا تھا جنم جنم سے وہ اس پنجرے میں قید ہے۔ بھاری بھرکم لباس سے نجات پا کر اس نے بالکل سادہ سے کپڑے زیب تن کیے۔زیورات کے نام پر بوجھ اٹھا رکھا تھا اس سے چھٹکارہ پایا چہرے پر مصنوعی حسن کے نشانات مٹائے۔

کتنے پتوں کے نیچے دب گئی ہے میری اصل شخصیت.....اب تو آئینے میں خود کو دیکھ کر پہچان بھی نہیں پاتی کہ یہ میں ہوں یا کوئی اور ہے.....دروازے پر کھٹکا ہوا اور اگلے ہی لمحے غلام عباس حسب معمول ہاتھ میں چائے کا کپ لیے کھڑا تھا۔ یہ شخص اسے ہمیشہ حیران کر دیتا تھا۔اس کے پل پل کی خبر رکھتا تھا۔

''آجاؤ غلام عباس! وہاں کیوں کھڑے ہو.....'' وہ آگے آ گیا۔ ہاتھ میں پکڑا ہوا کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر واپسی کے پلٹا تو چاندنی نے اسے روک لیا۔

''غلام عباس! کچھ دیر بیٹھو گے نہیں۔''

''بی بی.....روندے ہوئے پھول اکٹھا کرنے میں بہت دیر ہو جاتی ہے۔ بائی جی اندھیرا کر دیں گی.....ساری روشنیاں بجھا دیں گی تو میرے لیے بہت دشوار ہو جائے گا۔'' وہ سادگی سے بولا۔

''تم کیا اندھیروں سے ڈرتے ہو غلام عباس.....''

''نہیں بی بی! اندھیروں سے کیا ڈرنا.....غلام عباس ان اندھیروں میں ہی تو پل کر جوان ہوا ہے.....روشنیاں چبھتی ہیں آنکھوں کو۔لیکن میں ان پھولوں پر ان بکھری ہوئی پتیوں پر کسی اور کے پاؤں برداشت نہیں کر سکتا جو آپ پر نچھاور کی جاتی ہیں۔''

''غلام عباس! یہ جانتے ہوئے بھی کہ جس پر خار راستے پر تم چل رہے ہو وہ کسی منزل کی طرف نہیں جاتا.....تم سفر جاری رکھے ہوئے ہو.....بھلا اس میں تمہیں کیا حاصل ہوگا؟''

''بی بی! حاصل اور لاحاصل کی بحث میں پڑتا ہی کون ہے.....میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ سفر میں رہنے ہی میں اطمینان قلب ہے.....اور پھر ہر مسافر کو منزل کہاں ملتی ہے۔کچھ تو مسافت کی دھول میں ہی گم ہو کر رہ جاتے ہیں۔سو میں نے منزل پانے کی ہوس اپنے دل میں بیدار ہی نہیں ہونے دی.....مفات کو چن لیا۔''

''یہ بہت مشکل نہیں۔اکیلے زندگی بھر کی مسافت۔'' چاندنی غلام عباس کی باتوں پر غور کرتے ہوئے بولی۔

''اکیلا کب ہوں میں.....آپ بھی تو ساتھ ہیں۔راستے الگ ہیں تو کیا ہوا۔ہمسفر نہیں ہیں تو کیا ہوا؟ آپ بھی مسافر؟ میں بھی مسافر.....نہ میری کوئی منزل نہ آپ کی کوئی منزل اور جب ہم دونوں ہی مسافت میں ہیں تو پھر نہ میں اکیلا ہوں نہ آپ تنہا ہیں۔''

''غلام عباس! کبھی کبھی تم مجھے حیران کر دیتے ہو۔اس ماحول اس جگہ کے باسی نہیں لگتے.....مجھے کبھی کبھی یوں لگتا ہے جیسے تمہاری کوئی اور دنیا ہے.....تم کہیں اور سے آئے ہو.....اس ماحول سے یکسر نامانوس اور اجنبی.....تمہاری باتیں.....تمہاری سوچیں اتنی الگ کیوں ہیں۔''

''پتا نہیں بی بی! نہیں جانتا.....پر میں الگ کہاں ہوں.....ایک طوائف کی کوکھ سے جنم لیا ہے میں نے.....آج تک طوائفوں کی کمائی ہوئی روٹی کھائی ہے۔میں نے ہی میں سے ہوں۔میرا اصل یہی ہے۔'' اس کے کرب انگیز لہجے میں سچائی سمٹی ہوئی تھی۔

''غلام عباس! تم یہاں رہتے ضرور ہو لیکن تمہارا من، تمہاری روح یہاں نہیں رہنا چاہتی.....تمہارے پیروں میں تو بیڑیاں نہیں ہیں.....تم تو مرد ہو.....آزاد.....خود مختار اپنی مرضی کے مالک.....تم تو اس عقوبت خانے سے نکل سکتے ہو.....پھر کیوں نہیں چلے جاتے.....''

''کہاں جاؤں.....میرے پیروں میں بیڑیاں نہیں.....میرے ہاتھوں میں سنگل نہیں لیکن بی بی! ایک ان دیکھی قید میں ہوں میں.....میں آزاد کہاں ہوں.....پر کاٹ کر پرندے کو کھلی فضا میں چھوڑ کر یہ سمجھ لینا کہ وہ آزاد ہے محض خود فریبی ہے اور کچھ نہیں اور میں ایسا ہی ایک پنچھی ہوں۔''

''میں سمجھی نہیں.....''

''بی بی! اس چار دیواری سے باہر کی دنیا بہت ظالم ہے۔گدھوں کی طرح اپنوں کا گوشت نوچ نوچ کر کھانے والی۔یہاں سب اپنی مرضی سے بکتے ہیں لیکن باہر کی دنیا میں نہ خریدار ہے نہ دکاندار۔وہاں تو لوٹ مار ہوتی ہے اور بس.....آپ کا یہ غلام عباس لٹ نہیں

سکتا.....اس کے کاسۂ دل میں بس چند سکے ہیں اور یہ ریزگاری اسے اپنی جان سے بھی پیاری ہے.....میں نے یہیں پڑے رہنا ہے بی بی! عبادت کا پہلا اصول یہی ہے کہ ایک بار جس در پر ماتھا ٹیک دیا پھر مر جانا ہے وہ در نہیں چھوڑنا۔"

"غلام عباس تم کیا کہہ رہے ہو میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔" چاندنی کو واقعی اس کی باتیں سمجھ نہیں آ رہی تھیں۔

"سمجھ جائیں گی بی بی! آپ بھی سمجھ جائیں گی۔ جس استاد سے میں نے سبق لیا ہے کبھی تو اس کی نظر کرم آپ پر بھی ہو گی۔ سب مفہوم واضح ہو جائیں گے۔ ہر بات سمجھ آنے لگے گی.....پھر آپ غلام عباس کا ان کہا بھی سمجھنے لگ جائیں گی اور مجھے اسی دن کا انتظار ہے.....اس انتظار کی مسافت کے عوض جتنے کانٹے میرے پیروں میں چبھیں گے میرے اندر اور صبر آتا جائے گا.....وہ کانٹے پھول سمجھ کر میں دامن میں بھرتا رہوں گا۔"

غلام عباس بات مکمل کر کے کمرے سے نکل گیا اور چاندنی حیرت کے عالم میں دروازے کے سامنے لگے پردے کو ہلتا دیکھ رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

رات اپنی تمام تر سیاہی کے ساتھ رخصت ہو چکی تھی ایک پل کے لیے بھی بابر شاہ کی آنکھیں نیند سے آشنا نہیں ہوئی تھیں۔ بہت سارے مسائل کسی عفریت کی طرح منہ پھاڑے ان کے سامنے کھڑے تھے۔ فواد کے کلینک میں جس شخص کو انہوں نے آج دیکھا تھا۔ اس نے انہیں ایک نئی الجھن میں ڈال دیا تھا۔ بار بار ذہن سے جھٹکنے کے باوجود اس کا چہرہ ان کی نگاہوں کے سامنے آ جاتا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ بار بار تخیل کے پردے پر وہ چہرہ انہیں کیوں دکھائی دے رہا ہے.....اس سے پہلے انہوں نے اسے کہاں دیکھا تھا.....انہیں یاد نہیں آ رہا تھا۔ لیکن اس چہرے کے شکست خوردہ نقوش انہیں شناسا لگ رہے تھے۔ کوئی سوچ ان کے ذہن میں سوئی کی طرح چبھ رہی تھی۔ اپنے کمرے میں کرسی پر بیٹھے وہ کسی سوچ میں گم تھے.....اسی وقت زاہدہ بیگم کمرے میں داخل ہوئیں۔ بابر شاہ کے چہرے پر ثبت پریشانی انہوں نے آتے ہی محسوس کر لی تھی۔

انہوں نے ناشتے کی ٹرے ان کے سامنے ٹیبل پر رکھ دی.....بابر شاہ کی نیند سے عاری سرخ ہوئی آنکھیں زاہدہ بیگم کی طرف اٹھیں۔ تردد اور پریشانی نے جیسے انہیں ایک ہی رات میں بیمار کر کے رکھ دیا تھا۔

"زاہدہ.....ناشتہ نہیں کرنا فی الحال سٹرونگ سی چائے کا ایک کپ چاہیے.....اگر تکلیف نہ ہو تو....."

تکلیف کی کیا بات ہے.....ابھی بنائے دیتی ہوں....." انہوں نے کہا اور ٹرے اٹھانے لگیں تو وہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

"آپ کدھر جا رہے ہیں....." ان کی کیفیت کو سمجھنے کے باوجود زاہدہ چچی نے کسی قسم کا استفسار مناسب نہیں سمجھا۔

"لان میں جا کر بیٹھتا ہوں.....پتا نہیں کیا بات ہے کمرے کی فضا میں دم گھٹ رہا ہے۔" وہ کہتے ہوئے باہر چلے گئے۔ صبح صبح لان میں بالکل خاموشی تھی۔ ہلکی ہلکی خنک ہوا چل رہی تھی وہ لان چیئر پر بیٹھ گئے۔ ذہن کے تمام گوشے حالات کی الجھی ہوئی ڈور کو سلجھانے، کی تگ و دو میں لگے ہوئے تھے۔ پریشانی اور تفکر کی عمیق لکیروں کا جال سا پیشانی پر پھیلا ہوا تھا۔ اسی پل روبیہ انہیں اپنے پورشن

سے نکل کر ان کے حصے کی جانب بڑھتی دکھائی دی۔ اس نے دروازے میں سے اندر جھانک کر آریان کو آواز دی اور ایک دو منٹ کے بعد آریان بھی اس کے ہمراہ تھی۔ غالباً وہ دونوں سکول جا رہی تھیں۔

جس جگہ وہ بیٹھے ہوئے تھے ان دونوں کو وہاں سے گزر کر جانا تھا۔ سو ان کے قریب آتے ہی دونوں نے سلام کیا۔

''وعلیکم اسلام..... سکول جا رہی ہو.....'' انہوں نے بر سبیل تذکرہ پوچھا۔

''جی انکل.....'' آریان نے جواب دیا۔

''بیٹا! بہت احتیاط اور دھیان سے جایا کرو..... آجکل بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔''

''جی.....'' وہ اثبات میں جواب دیتی گیٹ کی طرف چل پڑیں۔ بابر شاہ کی نگاہیں آریان کے سراپے پر تھیں اور ذہن کی سوئی ہر جھنجھٹ سے ہٹ کر آریان پر آ ٹکی۔ پتا نہیں کیا بات تھی بابر شاہ کو اس بچی سے عجیب سی انسیت ہو گئی تھی۔ اس کا رکھ رکھاؤ..... اس کا سلیقہ، حسن صورت، حسن سیرت..... کوئی بھی تو ایسا پہلو نہیں تھا جس کی وجہ سے وہ طوائف زادی یا کوٹھے کی پیداوار نظر آتی..... اس کی روشن پیشانی، حیا سے جھکی پلکیں، معصوم پاکیزہ چہرہ اور بھولپن اس کے خاندانی ہونے کی دلیل تھی۔ انہوں نے اسے اپنی بیٹی کہا تھا..... اور اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کے مستقبل کی ذمہ داری بھی انہوں نے اٹھائی تھی..... انہوں نے ایک باپ بن کر اسے رخصت کرنا تھا اور ایک بیٹی کی طرح اس کے سارے چاؤ پورے کرنے تھے لیکن کیا کوئی اتنا اعلیٰ ظرف ہو گا کہ اس بچی کو اس کے داغدار ماضی سمیت قبول کر لے۔ جب سے وہ اسے اپنے پورشن میں لے کر آئے تھے اس کی ذات کے جوہر تو اب ان کے سامنے کھلے تھے..... اس کی دھیمی دھیمی مسکراہٹ اور صحرا کے مندر میں بجنے والی گھنٹیوں جیسی آواز انہیں بہت بری طرح کسی کی یاد دلا گئی تھی۔ اس کا مضبوط کردار، سگھڑاپا اور اس کی شخصیت کا سلجھاؤ..... ہر چیز ہی انہیں اچھی لگی تھی۔ انہوں نے اب تک آریان میں کوئی برائی نہیں دیکھی تھی جو قابل گرفت و قابل مذمت ہوتی۔

آریان کے لیے شریک زندگی چنتے وقت انہیں از حد خیال رکھنا ہو گا کہ اب تک کی محرومیوں بھری زندگی کے بعد آئندہ کوئی محرومی اس کے حصے میں نہ آئے..... ان کے ذہن میں فواد شاہ کا بھرپور سراپا در آیا۔ ان کی لو دیتی آنکھوں کی ہلکی سی چمک بابر شاہ نے دیکھی تھی لیکن ابھی وہ پورے وثوق سے نہیں کہہ سکتے تھے..... ہاں البتہ آریان کو اگر اس نگاہ سے دیکھا جاتا تو وہ ہر لحاظ سے ان کے معیار پر پوری اترتی تھی..... ''بیٹی تو میں اسے کہہ ہی چکا ہوں تو پھر مستقل بیٹی بنانے میں کیا ہرج ہے..... لیکن اس سے پہلے اس کی ماں کو یہاں موجود ہونا چاہیے۔ اس کو عذاب سے نکالنا ضروری ہے.....'' ایس۔ پی صاحب سے ملاقات کے بعد بابر شاہ کافی پریشان تھے کیونکہ جن ستر سو جھنجھٹوں کا ذکر ایس۔ پی نے ان کے سامنے کیا تھا' انہیں حل کرنا قدرے مشکل تھا۔

''کن سوچوں میں گم ہیں..... چائے لیں۔'' زاہدہ بیگم چائے کا کپ لیے قریب ہی کھڑی تھیں۔ سوچوں کے گرداب میں پھنس کر وہ اردگرد سے بالکل ہی بے خبر ہو گئے تھے۔ انہوں نے کپ پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن وہ جہاں تھا وہیں رہ گیا۔ وجہ بہت معقول تھی۔ آریان اور روبیہ جنہیں ابھی سکول گئے پانچ چھ منٹ سے زیادہ نہیں ہوئے تھے وہ دونوں انتہائی گھبرائی ہوئی حالت میں گیٹ سے

داخل ہوئی تھیں۔ زاہدہ بیگم اور بابر شاہ دونوں ہی ان کی حالت دیکھ کر چونک گئے تھے۔ آریان کا تو گھبراہٹ کے مارے اس قدر برا حال تھا کہ اس کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں۔ حلق خشک اور آنکھیں بالکل بنجر سی لگ رہی تھیں۔ چہرے کا رنگ ہلدی کی طرح پیلا پھٹک ہو رہا تھا۔ جبکہ روبیہ قدرے حواسوں میں تھی۔ زاہدہ بیگم نے آریان کا ہاتھ پکڑ کر اسے کرسی پر بٹھایا۔

''کیا بات ہے؟ کیا ہوا..... اور اس قدر گھبرائی ہوئی کیوں ہو.....'' انہوں نے پوچھا۔

''وہ..... وہ..... وہ باہر.....'' آریان کی زبان اس کا ساتھ چھوڑ گئی۔ بہادر ہونے میں اور بہادر کہنے میں کس قدر فرق ہوتا ہے آریان کو آج اچھی طرح سمجھ آ رہا تھا۔

''کیا ہے باہر.....'' بابر شاہ کچھ کچھ سمجھ گئے تھے لیکن پھر بھی کنفرم کرنا چاہتے تھے۔

''وہ..... وہ باہر پان والی دکان پر..... دونوں..... دونوں کتے بیٹھے ہوئے ہیں.....'' آریان کوشش کے باوجود اپنی بوکھلاہٹ اور گھبراہٹ پر قابو نہیں پا سکی تھی۔ بابر شاہ کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''آپ کہاں جا رہے ہیں جی..... نہ جائیں باہر..... لعنت ڈالیں ان پر.....'' زاہدہ بیگم ایک ہی سانس میں بولے چلی گئیں۔

''زاہدہ بیگم! تم کبھی عقل سے کام نہ لینا.....'' بابر شاہ دانت پیستے ہوئے کوٹھی کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گئے..... وہ سب بھی ان کے ہمراہ ہی آ گئے..... بابر شاہ نے لاؤنج میں رکھے ہوئے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا اور کچھ نمبر پریس کیے۔

''ہیلو..... ایس۔ پی کامران صاحب سے بات کرائیں۔'' دوسری جانب سے ریسیور اٹھائے جانے پر انہوں نے کہا۔ کچھ لمحے یونہی سرک گئے' غالباً ایس۔ پی کا ریڈر انفارم کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ریسیور سے آواز ابھری۔

''ہیلو.....'' ایس۔ پی صاحب میں بابر شاہ بات کر رہا ہوں.....'' بابر شاہ نے اپنا تعارف کرایا۔

''جی جناب! کیا حال چال ہیں آپ کے.....'' ایس۔ پی خوشگوار لہجے میں بولے۔

''بالکل ٹھیک ٹھاک..... کل جس سلسلے میں آپ سے ملا تھا۔ اس کے بارے میں کچھ تفصیل مزید ہے۔''

''جی فرمائیں میں سن رہا ہوں''۔

''جن بدمعاشوں کا میں نے آپ سے تذکرہ کیا تھا وہ اس وقت ہماری گلی کی ہی ایک دکان پر موجود ہیں.....'' بابر شاہ نے اطلاع بہم پہنچائی۔

''ذرا حلیے تو بتا دیں ان کے.....'' ایس۔ پی نے پوچھا تو بابر شاہ نے روبیہ کے بتائے ہوئے حلیے ان کے گوش گزار کر دیئے۔

آپ فکر مت کریں..... میں ابھی تھانے فون کرواتا ہوں۔'' ایس پی نے کہا۔

''بہت بہت شکریہ آپ کا.....''

''بابر صاحب! غیریت مت برتیے۔ ہمارا آپ کا تو بڑا ساتھ ہے۔'' ایس۔ پی مسکراتے لہجے میں بولے۔ بابر شاہ نے بھی ایک

دو باتیں کرنے کے بعد فون بند کر دیا۔

''چاچو! کیا کہہ رہے تھے ایس۔ پی صاحب!'' روبیہ ان کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی ان سے مخاطب تھی۔

''اب گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ایس۔ پی صاحب خود اس معاملے کو سیریسلی لے رہے ہیں۔ انشاء اللہ بہت جلد مسئلہ حل ہو جائے گا۔'' وہ واپس لان میں آ گئے۔

''ویسے آریان بیٹا..... اب اگر آپ مناسب سمجھیں تو ذرا تفصیل سے اپنے بارے میں آگاہ کریں..... اپنے والد اور والدہ کے بارے میں۔ تاکہ اس وقت آپ جن لوگوں کے چنگل میں ہیں۔ ان لوگوں پر پکا ہاتھ ڈالا جا سکے۔'' بابر شاہ آریان سے بہت نرم لہجے میں بولے۔

''انکل میرا ماضی کیا تھا میں بتا چکی ہوں..... ایک طوائف نے مجھے جنم دیا..... باپ کون ہے..... مجھے نہیں معلوم..... ماں کے پاس ایک شکستہ سا کاغذ ہے جس پر ایجاب قبول کی ایک رسمی سی کارروائی کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس شخص کا نام میرے سارے سرٹیفکیٹس پر درج ہے۔ لیکن وہ کیسا ہے میں نہیں جانتی..... میں نے آج تک اسے دیکھا نہیں۔'' آریان کے لہجے میں درد کروٹیں لینے لگا۔

''ہوں..... نوے فی صد لوگوں کی طرح گناہ کر کے منہ چھپانے والوں میں سے.....''

''نہیں انکل..... اس شخص نے باقاعدہ نکاح کیا تھا امی سے..... لیکن پھر جانے اس کے دل میں کیا آئی کہ انہیں یوں بے یارو مددگار چھوڑ کر چلا گیا اور اس کے بعد آج تک پلٹ کر نہ دیکھا..... شاید دنیا سے ڈر گیا.....''

''آریان! ستارہ بیگم کے ہاتھ کیسے لگیں تم.....'' روبیہ نے سوال کیا۔

''یہ میری بدقسمتی ہے..... میں اور کیا کہوں اس بارے میں۔ ماں سے محبت کرنا مہنگا پڑا مجھے..... امی کے منع کرنے کے باوجود میں لاہور ان کی جائے رہائش پر پہنچ گئی تھی۔ سات سال سے اٹھارہ سال کی عمر تک بورڈنگ میں رہنے والے بچے کو ایک گھر کے تصور کی کس قدر طمانیت اور خوشی محسوس ہو سکتی ہے شاید کوئی نہ سمجھ سکے..... بارہ سال ماں سے الگ رہی تھی میں۔ اور..... ستارہ بیگم نے بس ایک نگاہ مجھ پر ڈالی..... لیکن اس ایک نگاہ کے بعد میں آزادی کو ترس گئی۔'' آریان پرت پرت اپنی ذات کے راز کھول رہی تھی۔

''یہ ستارہ بیگم کس قسم کی ذہنیت رکھتی ہے۔'' بابر شاہ نے پوچھا۔

''ویسی ہی ذہنیت رکھتی ہے جیسی ہر کامیاب دھندا کرنے والی بائی کی ہو سکتی ہے۔ وہ خود کو کہا کرتی تھی ستارہ بیگم ولد پیسہ..... اسے بس پیسے کی زبان سمجھ آتی ہے اور پیسے ہی کی بولی بولتی ہے وہ.....'' آریان کے لہجے میں نفرت اُمڈ آئی۔

''آریان..... تم اور تمہاری امی دونوں ہی بے قصور ہیں۔ ناکردہ گناہوں کی سزا کا بھگتان تم کیوں بھگتو..... ہم ستارہ بیگم کے مطالبات پورے کریں گے..... تمہاری تو جان چھوٹ ہی جائیگی۔ لیکن ہماری کوشش یہ ہے کہ تمہاری امی کو بھی ظلم کے چنگل سے چھڑایا جائے۔'' بابر شاہ مضبوط لہجے میں بولے۔ اظہر چچا کسی کام سے باہر نکلے تو ان سب کو وہاں بیٹھا دیکھ کر وہ بھی وہیں آ گئے۔

''کیا ہو رہا ہے.....'' لان چیئر پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے بابر شاہ کی طرف دیکھا۔ انہوں نے پہلی ہی نظر میں ان کی پریشانی

بھانپ لی تھی۔

''بس کچھ مسائل ہیں جن کے حل کی وجہ سے پریشان ہوں.....لیکن خیر.....''

''کچھ مجھے بھی تو بتائیں.....'' اظہر نے اصرار کیا تو بابر شاہ نے آریان سے متعلق ساری بات تفصیل سے بتا دی۔

''ہوں.....'' اظہر نے پرخیال انداز میں ہلکارا بھرا۔

''بھائی مسئلے پریشان ہونے سے کبھی حل نہیں ہوتے.....پھر آپ تن تنہا ہی ہر مسئلے کے سامنے سینہ سپر ہو جاتے ہیں۔اس لیے دہری پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے آپ کو.....بہر حال یہاں آپ ہرگز اکیلے نہیں ہیں۔ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔مانا کے الجھنیں بہت ہیں لیکن ایسا بھی نہیں کہ ان کا تدارک نہ کیا جا سکے.....انسان کرنے پر آئے تو کیا نہیں ہو سکتا۔'' اظہر چچا شروع سے ہی سٹیٹ فارورڈ قسم کے بندے تھے۔مسئلے کی تہہ میں پہنچ جانا اور فوری اس کا حل نکال لینا ان کے لیے زیادہ مشکل نہیں تھا لیکن اس کے برعکس بابر چچا کی خاموش طبیعت کے باعث ان کے اندر فیصلہ کن قوت ارادی قدرے کم تھی۔بس زندگی میں چند بار ایسا ہوا کہ وہ حالات کے سامنے ڈٹ گئے اور حالات کو ان کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑے۔

آریان، اظہر چچا اور بابر چچا کے درمیان ہونے والی گفتگو سن رہی تھی۔کسی قدر سکون کے لمحے میسر آئے تھے اسے ایک طویل عرصے کے بعد۔زاہدہ چچی اور روبیہ بھی بیٹھی ہوئی تھیں۔اسی وقت صابرہ موبائل ہاتھ میں لیے ان کے قریب چلی آئی.....کال بابر شاہ کے لیے تھی.....انہوں نے موبائل کان سے لگا لیا۔ہیلو کے بعد وہ کچھ نہ بولے دوسری طرف کی بات سنتے رہے اور آخر میں شکریہ کہہ کر موبائل آف کر دیا۔

''آریان! تمہاری ایک پریشانی تو ختم ہو گئی۔'' بابر چچا نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب انکل؟'' وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے ان کی طرف دیکھ کر بولی۔

''اب گھبرانے کی ضرورت نہیں وہ دونوں پولیس کی حراست میں ہیں۔'' بابر چچا نے کہا۔

''فون کس کا تھا بھائی؟'' اظہر چچا نے پوچھا۔

''ایس۔پی کا.....ابھی کچھ دیر پہلے میں نے انہیں فون کر کے اطلاع دی تھی کہ وہ دونوں غنڈے جو آریان کو تنگ کرتے ہیں اور جنہوں نے فواد کے کلینک میں بھی کافی توڑ پھوڑ کی تھی ہماری گلی میں ہی ایک دکان پر موجود ہیں۔ایس۔پی صاحب کے فون پر تھانے کے عملے نے فوری ایکشن لیا اور انہیں گرفتار کر لیا گیا ہے۔''

''یہ تو بہت اچھا ہوا۔خواہ مخواہ بچی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے منحوس مارے۔'' زاہدہ چچی اپنی لینگویج میں بولیں۔آریان نے بھی سکون کا سانس لیا۔

''آریان بیٹا۔تمہیں ابھی میرے ساتھ چلنا ہوگا.....'' بابر شاہ نے کہا تو آریان سے پہلے اظہر چچا بول پڑے۔

''وہ کس سلسلے میں.....''

''ایس۔پی صاحب سے ملنے کے لیے.....ان دونوں کے خلاف بیان دینا ہے آریان کو۔''

بابر چچا نے کہا۔فواد تیار ہو کر باہر نکلے تو بابر چچا نے انہیں پکار لیا۔

''فہدی.....ایک منٹ.....''

''جی ابو.....'' وہ ٹائی کی ناٹ سیٹ کرتے ہوئے ان کے قریب چلے آئے۔

''ایک منٹ تم ذرا بیٹھو.....آریان بیٹا! تم ابھی سکول جاؤ۔میں تمہیں سکول سے ہی پک کرلوں گا.....'' وہ پہلے فواد سے اور پھر آریان سے بولے۔فواد کچھ نہ سمجھتے ہوئے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

آریان اور روبیہ سکول جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''بھائی! میں بھی جا رہا ہوں۔ٹرک لوڈ کروانا ہے گندم سے۔پرسوں سے مال یونہی پڑا ہوا ہے۔ٹرک کی کچھ ریپیئرنگ کروانی تھی۔میں بس ایک گھنٹے میں آجاؤں گا۔پھر اس مسئلے پر بھی کچھ کرتے ہیں۔'' اظہر چچا بھی اٹھ کر چلے گئے۔زاہدہ چچی بھی چائے کے برتن اٹھا کر اندر چلی گئیں۔

''جی ابو.....کہیں.....''

''کلینک جا رہے ہو.....''

''جی ہاں.....''

''وہ تمہارے سپیشل مریض کا کیا حال ہے؟''

''اب کچھ بہتر ہے.....میرا خیال ہے کہ اس کے لیے آب و ہوا کی تبدیلی بہتر ثابت ہوگی۔اس لیے میں نے سوچا کہ آج اسے کچھ سیر و تفریح کروا دیں۔کلینک پر تو آج عابد اور عامیہ کی ڈیوٹی ہے۔ہفتے میں ایک دن وہ دونوں ہوتے ہیں۔سو میں اور کاشف فارغ تھے تو سوچا.....کچھ چینج ہو جائے۔''

''تو ٹھیک ہے پھر اٹھو چلیں.....'' بابر چچا کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''آپ نے بھی کہیں جانا ہے.....'' فواد نے پوچھا۔

''ہاں تمہارے ساتھ ہی جانا ہے۔'' بابر چچا مسکرا کر بولے تو وہ کچھ حیران حیران سے گاڑی میں آ بیٹھے لیکن بولے کچھ نہیں۔

کلینک پہنچ کر انہوں نے کاشف کو پروگرام سے آگاہ کیا۔

''لیکن تمہارا وہ معصوم، بے ضرر مریض تو سو رہا ہے.....''

''کوئی بات نہیں ابھی جاگ جائیگا۔''

''کہاں لے جاؤ گے اسے۔''

''مارگلہ ہلز.....'' فواد نے جواب دیا۔

''یقین ہو گیا.....تم اپنے ساتھ ساتھ میرا بھی رگڑا بھی لگوا کر رہو گے.....'' کاشف مصنوعی تاسف سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''کچھ نہیں ہوتا۔تم تو بزدلی میں لڑکیوں کو بھی پیچھے چھوڑ رہے ہو۔تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ابو بھی میرے ساتھ جا رہے ہیں تم اور میں ہی نہیں ہیں۔''

''سر جی! وہ بابا جاگ گیا ہے.....ناشتہ بھی آرام سے کر لیا ہے اس نے۔'' نرس سلمٰی نے اندر آ کر بتایا تو فواد کاشف کو ہمراہ لے کر اس کے کمرے میں چلے گئے۔واقعی وہ بہت خاموش اور تہذیب یافتہ انسان نظر آ رہا تھا۔کسی قسم کی حرکت کیے بغیر وہ خاموشی سے ان دونوں کی طرف دیکھنے لگا۔

''میں جاؤں گا.....میں نے جانا ہے۔'' وہ سرگوشی والے انداز میں بولا۔

''یار فواد! یہ تمہیں دیکھتے ہی کہاں جانے کی ضد شروع کر دیتا ہے۔'' کاشف بولا۔

''بابا.....کہاں جانا ہے آپ نے.....'' فواد بہت نرم لہجے میں بولے۔

''میں جاؤں گا.....میں نے جانا ہے.....''

''ٹھیک ہے بابا آپ کو لے چلوں گا.....لیکن ایک شرط پر آپ شور نہیں کریں گے۔'' فواد نے کہا۔

''شور.....نہیں کروں گا!'' وہ فواد کو اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے گھورتا ہوا اپنے مخصوص سپاٹ انداز میں بولا۔

''ہاں.....اگر آپ کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کریں تو آپ کو لے چلوں گا۔''

''نہیں کرتا.....لے چلو گے.....'' وہ جھٹکے سے بولا۔اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک در آئی۔

''ہاں بالکل.....لے چلوں گا.....''

''لے چلو گے.....''

''ہاں بابا لے چلوں گا.....اب اٹھیں.....'' فواد نے آگے بڑھ کر اس کے پیروں کو زنجیروں سے آزاد کرایا۔زنجیروں کے نشان اس کے پیروں پر اس بری طرح بنے ہوئے تھے جیسے وہ اس کے پیروں میں ہی کھب گئی تھیں۔

''اٹھوں.....''

''ہاں جی.....اٹھیں.....''

''لو اٹھا.....وہ ایک جھٹکے سے بیڈ پر سے اٹھا لیکن لڑکھڑا گیا۔کافی دنوں سے اس نے زمین پر پاؤں نہیں رکھا تھا۔زنجیروں کی وجہ سے بھی پیروں میں خون کی گردش جیسے بہت کم رہی ہو گی۔اسی لیے اس کے پیر اس کا بوجھ نہیں اٹھا پا رہے تھے۔فواد نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا۔

''چلیں.....'' انہوں نے کاشف کو اور اسے مخاطب کیا۔

''چلو.....'' اس نے خوشی سے کہا۔ پتا نہیں کیوں فواد کو اس کا اس طرح مسکرانا بہت اچھا لگا۔ بابر چچا انہی کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے انہیں آتے دیکھ کر وہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ کلینک سے باہر آ کر فواد نے اس کو گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بٹھایا اور کاشف کو اس کے ہمراہ بیٹھنے کو کہا۔

''یار! تمہارے کہنے پر میں بیٹھ جاؤں گا۔ پر میری زندگی اور موت کے ذمہ دار تم ہی ہو گے۔'' کاشف ناراضگی سے بولا۔

''بکواس نہ کرو اور چپ چاپ بیٹھ جاؤ..... کہا نہیں جائیگا وہ تمہیں۔'' فواد کے کہنے پر وہ ڈرنے کی ایکٹنگ کرتا ہوا اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ بابر شاہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئے اور فواد نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ گاڑی کلینک سے نکال کر مین روڈ پر ڈال دی۔

''ابو! وہ دونوں تو گرفتار ہو گئے جن کی وجہ سے پچھلے دنوں کافی ٹینشن رہی لیکن مکمل طور پر اطمینان والی بات نہیں ہے ابھی..... آریان کے اصل دعویداروں کے علم میں جیسے ہی یہ بات آئے گی وہ وسیع پیمانے پر اس کی بازیابی کے لیے کوشش کریں گے۔'' فواد نے کہا۔

''ہاں! تم ٹھیک کہہ رہے ہو..... یہ مسئلہ فی الوقت ٹل ضرور گیا ہے لیکن حل نہیں ہوا..... اسی سلسلے میں آج ایس۔ پی سے ملنا ہے مجھے..... آریان کا بیان بھی ہو جائے گا اور اس کی زبانی ستارہ بیگم کے بارے میں معلومات بھی مل جائیں گی..... ایس۔ پی کامران کا چچازاد بھائی لاہور میں ایس۔ پی کے عہدے پر تعینات ہے۔ یقیناً اس وجہ سے بھی وہ ہماری فیور کرے گا۔ مجھے سو فیصد امید ہے کہ یہ مسئلہ حل ہو جائیگا۔'' بابر چچا پر خیال انداز میں بولے۔

''وہ دونوں آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ اور کاشف خاموش بیٹھا گاڑی کے شیشے سے باہر جھانک رہا تھا۔ جبکہ اس کے ساتھ والی نشست پر بیٹھا شخص خلاف توقع رویے کا اظہار کر رہا تھا۔ یعنی شیشے میں سے باہر بھاگتی ہوئی گاڑیوں اور لوگوں کو دیکھ دیکھ کر خوشی سے ہنس رہا تھا۔

''مارگلہ ہلز پر جانے والی سڑک پر ٹرن لیتے ہی وہ قدرے خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔ وہاں پہنچ کر گاڑی روک کر فواد نے اس کی طرف والا دروازہ کھول دیا۔

''آئیں بابا..... باہر آ جائیں.....''

''باہر آ جاؤں.....! وہ جھٹکے سے بولا۔

''جی ہاں.....'' فواد نے کہا تو وہ گاڑی سے اتر آیا۔

''بابا..... دیکھیں کتنی خوبصورت جگہ ہے آپ اب گھومیں پھریں.....'' فواد نے اس سے بات کرنے کے بعد کاشف کو اس پر نظر رکھنے کو کہا۔ اور خود بابر چچا کے ہمراہ نسبتاً ہٹ کر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ ان کی نظروں کا مرکز صرف وہی ذات تھی۔ اور وہ حیران تھے کہ وہ جو تمام راستہ خوشی سے قلقاریاں مارتا رہا تھا۔ یہاں پہنچ کر بالکل چپ ہو گیا تھا۔ اور چاروں طرف عجیب عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شناسائی یا پسندیدگی کے بجائے کچھ ہیجان سا محسوس ہو رہا تھا۔ کاشف اور وہ دھیرے دھیرے چلتے ان کے قریب آ گئے۔

''یار فواد! تم اس کو یوں نارمل لوگوں کی طرح آزاد مت چھوڑو..... یہ کسی پل نظر بچا کر بھاگ بھی سکتا ہے۔'' کاشف نے کہا۔

''نہیں بھاگے گا..... تمہیں کس لیے کہا ہے کہ اس پر نظر رکھو..... اتنی جان تو ہوگی کہ اسے بھاگتے دیکھ کر قابو کر سکو.....''

''تم نے کیا مجھے جھارا پہلوان سمجھ رکھا ہے۔ پتا بھی ہے کہ دورے کی حالت میں بیس آدمیوں جتنی طاقت آجاتی ہے اس میں۔ میں ننھی سی جان اکیلا کہاں اسے قابو کر سکوں گا۔'' کاشف کا کہنا بھی درست ہی تھا اس کا تجربہ چند دن پہلے انہیں ہو چکا تھا۔ وہ باری باری ان دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ لیکن سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہے۔

''میں جاؤں گا..... مجھے جانا ہے..... چلو..... لے چلو.....''

''لو! اب موصوف اور کہیں جانے کو پر تول رہے ہیں۔ تمہاری اس فیاضی کا بھی موصوف کے دماغ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔''

''فیاضی.....'' ایک لفظ کچھ جانا پہچانا سا تھا۔ اس نے چونک کر دیکھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے شدید غصے سے اس کے چہرے کا رنگ سرخ ہو گیا..... وہ کسی شعلے کی طرح بھڑک اٹھا۔

''فیاض..... فیاض.....'' اس نے کاشف کو گریبان سے پکڑ لیا اور تقریباً جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔

''ہاں..... چھوڑو..... فیاض..... فیاض.....'' وہ بری طرح کاشف سے چمٹا ہوا تھا۔ کاشف بے چارہ تو اس افتاد پر بوکھلا کر رہ گیا۔ جبکہ فواد اور بابر شاہ بھی حیران پریشان سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شاید ماضی کے تہہ خانے میں یاد کا کوئی روزن کھلا تھا' کوئی کرن چمکی تھی لیکن وہ صرف فواد کے لیے تھی۔ خود اس کے دماغ کو تشنج کے جھٹکے سے لگنے لگے تھے۔

''فیاض..... لے چلو..... فیاض..... چھوڑو..... جانا ہے.....'' اس پر آہستہ آہستہ دورے کی سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ بابر شاہ بہت غور سے اس کو دیکھ رہے تھے..... فواد اور کاشف دونوں ہی اسے سنبھالنے کی کوشش کرنے لگے۔ اس کے حلق سے واشگاف چیخیں بلند ہونے لگیں۔ آنکھیں حلقوں سے ابل کر باہر آ گئی تھیں اور پتلیاں پھیل چکی تھی۔ چہرے اور گردن کی رگیں ابھر آئیں..... اس کے عضلات عجیب سے تناؤ اور کھینچاؤ کا شکار ہو گئے۔ ہاتھ پاؤں اکڑ گئے۔ آہستہ آہستہ اس کی چیخیں بند ہو گئیں اور حلق سے ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے کوئی ذبح شدہ جانور کرب کے عالم میں ڈکرا رہا ہو اور وہ پھر وہ بے سدھ ہو کر ان دونوں کے بازوؤں میں ہی ڈھلک گیا۔

وہاں رکنا اب بیکار ہی تھا۔ جس کے لیے وہ یہاں آئے تھے وہ تو دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا تھا۔ بمشکل تمام اسے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لٹا کر وہ سب گاڑی میں بیٹھ گئے۔ فواد نے پہلے بابر شاہ کو گھر پر ڈراپ کیا اور خود کاشف کے ہمراہ کلینک آ گئے..... ایمرجنسی وارڈ میں اس کو خصوصی ٹریٹمنٹ دی جانے لگی۔

☆.....☆.....☆

لمبے بالوں کے ننھے ننھے گھنگھروں میں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ سفید سادی ساڑھی میں ملبوس وہ اکیلی بیٹھی جانے کیا سوچ رہی تھی۔

''بی بی.....ایسے کیوں بیٹھی ہیں؟'' غلام عباس اسے یوں بیٹھے دیکھ کر قریب چلا آیا۔

''خالی ہاتھ جو رہ گئی ہوں.....'' اس نے جیسے عام سے لہجے میں کہا۔

''نہ بی بی.....ایسے نہ کہیں.....آپ تو دان کرنے والوں میں سے ہیں۔آپ کے ہاتھ کیسے خالی ہو سکتے ہیں.....''

''ارے غلام عباس! مجھ جیسے لوگ کسی کو کیا دے سکتے ہیں سوائے دکھوں کے.....ساری ریاضت خاک میں مل گئی.....برسوں کی اذیت سہنے کے باوجود کچھ حاصل نہیں ہوا۔'' وہ خود کلامی کے سے انداز میں بولی۔

'غلام عباس! جب ساری زندگی چلتے چلتے پاؤں زخمی ہو جائیں' روح میں تھکان اتر آئے اور بعد میں پتا چلے کہ جو اثاثہ' جو زادِ راہ ساتھ لے کر چلے تھے وہ تو کوئی نقب زن بے خبری میں لے اڑا.....تو اس وقت کیا ہوتا ہے.....''

''بی بی.....میں تو خود زندگی بھر سفر میں رہا.....چلتا رہا اور پاؤں زخمی ہوتے رہے۔وجود پر تھکن ایسے ہے جیسے زخم پر کھرنڈ.....پر مجھ میں اور آپ میں فرق ہے بی بی.....میں جب سفر کے لیے نکلا تھا تو خالی ہاتھ تھا.....میرے پاس زادِ سفر نہیں تھا۔اس لیے میں لٹنے کے کرب سے ناواقف ہوں لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ ایک مسافر کے لیے زادِ راہ کتنا ضروری ہوتا ہے۔''

''غلام حسین! اندر زخموں نے کرلاہٹ مچا رکھی ہے.....میں ختم ہوتی جا رہی ہوں.....کیا میرا گناہ اتنا بڑا تھا کہ جس کی سزا ساری زندگی پر محیط ہو جائے۔دیکھو اب تو.....اب تو میرے بالوں میں چاندی کے تار جھلملانے لگے ہیں.....اب تو میرے چہرے کی رعنائی بھی دم توڑتی جا رہی ہے.....اس حسن کے پیچھے ہی تو دیوانے تھے ناں سب.....پھر اب، اب میری مسلسل سزا ختم کیوں نہیں ہو رہی۔'' لفظ اس کے ہونٹوں پر سسکنے لگے۔

''بی بی.....آپ نے کوں سا گناہ کیا ہے۔یوں خود کو مت برا کہیں.....کبھی کبھی قدرت ہمارے لیے بڑے عجیب فیصلے کرتی ہے اور ہمیں تمام عمر ان فیصلوں کے آگے بے زبان بن کر سر جھکانا پڑتا ہے۔ہمیں احتجاج کا کوئی حق نہیں دیا جاتا۔اور آپ اور میں انہی لوگوں میں سے ہیں۔''

''نہیں غلام عباس! تم نہیں جانتے.....میرا گناہ بہت بڑا ہے۔میں نے راتوں کو اٹھ اٹھ کر خدائے وحدہٗ لاشریک سے معافی مانگی.....انہی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں سے گناہ کی اس سیاہی کو دھونے کی کوشش کرتی رہی لیکن ابھی کمی ہے۔ابھی اور ریاضت چاہیے۔اور میں.....میں ٹوٹ چکی ہوں.....'' چاندنی کا بکھرا لہجہ غلام عباس کے دل پر چرکے لگا رہا تھا۔

''بی بی! آج آپ کا حرف حرف مایوسی کے بوجھ تلے دبا ہوا محسوس ہو رہا ہے.....غلام عباس ابھی زندہ ہے بی بی! آپ خدا کے بعد مجھ پر بھروسہ رکھیں۔''

''غلام عباس! تمہیں یاد ہے نا۔کئی سال پہلے تم نے ایک بار کہا تھا کہ جس استاد سے تم نے سبق لیا ہے اس کی نظرِ کرم مجھ پر بھی ہو گی.....تب میں تمہارا ان کہا بھی سمجھنے لگ جاؤں گی.....کیا تمہیں آج بھی اس دن کا انتظار ہے۔''

''آپ کو اب تک یاد ہے بی بی.....'' وہ کچھ حیران ہو کر بولا۔

''ہاں غلام عباس! لیکن میں آج بھی سمجھ نہیں پائی تمہارے ان جملوں کا مطلب اس وقت کیا تھا؟''

''آپ نے میرا انتظار کچھ اور بڑھا دیا بی بی! لیکن غلام عباس انتظار سے تھکنے والا نہیں ہے۔''

''مجھے بتاؤ تو سہی ان جملوں کا مطلب؟''

''ابھی وقت نہیں آیا بی بی! تھوڑا اور انتظار کریں.....''

''ارے گھنگھرو۔ کہاں مر گیا رے.....؟'' باہر سے آنے والی کرخت آواز نے ان دونوں کی محویت توڑ دی۔

''بی بی! زندگی بھر یہ گھنگھرو بس دوسروں کی خاطر بجتا رہا.....لیکن اس کی صدا میں چھپا درد کبھی کسی نے محسوس نہ کیا۔ پر آپ کی ہر کراہ غلام عباس کے دل پر لکھی ہے۔ بی بی! آپ فکر نہ کریں جس رب نے بیس سال اسے اپنے اماں بخشی آج بھی وہی رحیم و کریم اس کا حامی و ناصر رہے گا.....''

''اس کا کچھ پتہ چلا غلام عباس؟'' اسے اپنی آواز کسی کنویں سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

''ابھی تک ان کے ہاتھ نہیں آئی تو سمجھیں خیریت سے ہے.....باقی کچھ دنوں میں میں خود چکر لگا کر آؤں گا.....آپ فکر نہ کریں۔'' غلام عباس کہہ کر باہر بڑی بائی جی کی بات سننے چلا گیا۔

''پتا نہیں! کس حال میں ہو گی تم؟ ایک ایک لمحہ اذیت سے گزر رہا ہے تمہارے بغیر۔ خدا کرے کوئی تکلیف تمہیں چھو کر بھی نہ گزرے.....تمہاری حرماں نصیب ماں دعاؤں کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتی ہے۔'' چاندنی خود سے ہم کلام تھی۔ اس کے چلے جانے کے بعد بھی غلام عباس پر یا اس پر کسی کو شک نہیں تھا۔ اسی وجہ سے ان دونوں کے ساتھ کسی قسم کی سختی نہیں کی گئی.....کوٹھے کے تمام امور اسی طرح جاری و ساری تھے لیکن در پردہ ستارہ بیگم عرف بڑی بائی جی چوٹ کھائی ہوئی ناگن کی طرح اندر ہی اندر مچل رہی تھی.....نئی اطلاع کے مطابق وہ دونوں جو اس کی تلاش میں گئے تھے اور انہوں نے اسے ڈھونڈ بھی نکالا تھا لیکن اس وقت پولیس کی حراست میں تھے۔ یقیناً اس کے شکار کو کوئی محفوظ پناہ گاہ مل گئی تھی۔ لیکن شکار کو بل سے باہر کیسے نکالا جائے یہ اس سے بہتر اور کون جان سکتا تھا۔

☆.....☆.....☆

پچھلے کئی دنوں سے مہوش کے اجنبیت آمیز رویے نے آریان کو بہت ریزرو کر دیا تھا۔ وہ بابر چچا اور زاہدہ چچی کی محبت اور فواد کی خواہش کے آگے ہار کر ان کے پاس آ گئی تھی۔ لیکن مہوش اٹھتے بیٹھتے اسے کسی نہ کسی طنز کا شکار کیے رکھتی۔ اس کا دل تو پہلے ہی دکھا ہوا تھا۔ عارب تایا کی تلخ ترش باتوں کے بعد سے وہ روبیہ اور انیقہ کی طرف بھی نہیں گئی تھی۔ البتہ شینا پھپھو، روبیہ اور انیقہ باقاعدگی سے اسے ملتی بھی تھیں اور حتی الامکان اس کی دلجوئی کرنے کی کوشش بھی کرتیں۔ بڑی اماں کا خصوصی برتاؤ اسے کسی حد تک سہارا دیئے ہوئے تھا ورنہ کبھی کبھی چند لوگوں کی نفرت کے سامنے بہت سے لوگوں کی محبتیں بھی ہارنے لگتیں۔ اس وقت بھی وہ لاؤنج میں اکیلی بیٹھی ہوئی تھی۔ زاہدہ چچی

مہوش کے ساتھ بازار گئی ہوئی تھیں کچھ شاپنگ کرنی تھی اور اس کے بعد انہوں نے اپنی بہن کے گھر جانا تھا۔ بابر چچا کوریڈور سے اندر داخل ہوئے تو وہ سامنے ہی خاموش بیٹھی نظر آ گئی۔ وہ اپنے کمرے میں جانے کی بجائے اسی کی طرف آ گئے۔ پتا نہیں وہ کیا سوچ رہی تھی کہ گردوپیش سے اس حد تک بے نیاز تھی کہ ان کے آنے کی اسے خبر تک نہ ہوئی۔

''آریان بیٹا! کیا سوچ رہی ہو.....'' وہ اس کے سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

''کچھ نہیں انکل.....بس یونہی.....'' ان کے پکارنے پر وہ جیسے کہیں بہت دور سے واپس پلٹی تھی۔

''میں دیکھ رہا ہوں کہ تم آج کل اداس اداس رہنے لگی ہو.....کیا زاہدہ یا مہوش نے کچھ کہہ دیا!'' اپنی بیگم اور بیٹی کی عادت سے وہ اچھی طرح واقف تھے۔ سو انہیں خدشہ تھا کہ ضرور اس کی اداسی کا پس منظر ان دونوں میں سے کسی کا رویہ ہوگا۔

نہیں انکل اداس تو نہیں.....بس اکیلی بوریت محسوس کر رہی تھی۔ روزانہ اس وقت روبیہ اور انیقہ آ جاتی ہیں۔ وہ آج اپنی نانی امی کے گھر گئی ہوئی ہیں.....''

''تو مہوش کے ساتھ گپ شپ لگا لیا کرو وہ بھی تو تمہاری بہن ہے۔'' بابر چچا پر شفقت انداز میں اس سے باتیں کرنے لگے۔

''اتفاق سے وہ بھی آج گھر پر موجود نہیں۔'' آریان مسکرا دی۔

''فواد تو ہے ناں گھر پر.....'' انہوں نے پوچھا۔

''جی غالباً ان کا آج ہاف ڈے تھا۔ کچھ دیر پہلے ہی واپس آئے تھے شاید کھانا کھا کر سو رہے ہوں۔''

''کمال ہے! ہر ایک ہی اپنی مصروفیت میں پھنسا ہوا ہے کسی کو تمہارا خیال نہیں آیا۔'' بابر چچا متاسف لہجے میں بولتے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اسی پل فواد لاؤنج میں آتے دکھائی دیئے۔

''اسلام وعلیکم ابو.....'' گیلے بالوں میں تولیہ رگڑتے وہ قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

''وعلیکم اسلام.....اچھا ہے تم خود ہی آ گئے.....ورنہ میں اب تمہیں ہی بلانے جا رہا تھا۔''

''کیوں خیریت ابو.....''

''تمہیں خود تو احساس نہیں ہوتا.....کم سے کم میری مان لو اور آریان بیٹی کو کہیں گھمانے لے جاؤ.....'' بابر چچا کے ذہن کے گوشے میں فواد کی پسندیدگی کا پوائنٹ موجود تھا۔ سو وہ بڑی عمیق نظری سے ان کے چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ آریان کے نام پر ایک ہلکا سا جگنو جوان کی آنکھ میں چمکا تھا۔ وہ بابر چچا کی تیز نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔ ایک طمانیت سی انہوں نے اپنے دل میں اترتی محسوس کی۔

''لیکن انکل.....'' آریان ہچکچا رہی تھی۔

''بس اب خاموش.....جب سے آئی ہو.....آئے روز نت نئے جھنجھٹوں میں پڑ کر بہت اپ سیٹ ہو گئی ہو۔ کچھ چینج ہو جائے تو اچھا ہے.....چلو فواد.....آریان کو لے جاؤ کہیں۔''

''ٹھیک ہے ابو میں لے چلتا ہوں۔ لیکن ایس۔ پی سے ملاقات کے بارے میں آپ نے کچھ بتایا ہی نہیں۔ اس کا کیا بنا؟ کیا کہتا ہے وہ.....؟'' فواد نے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے پوچھا۔

''اس میں کچھ مشکلات ہیں لیکن قابل حل ہیں..... کچھ دنوں تک جانا ہے لاہور..... ایس۔ پی بھی ہمارے ساتھ جائے گا۔''

''وہ کس لیے.....؟''

''وہ اس لیے کہ وہاں کا ایس۔ پی اس کا کزن ہے..... سو اس کے ہمارے ساتھ جانے کی وجہ سے اس کی خصوصی اٹینشن ہمیں ملے گی۔''

''ہوں.....'' انہوں نے ہلکا سے ہنکارا بھرا۔ ''چلیے آریان..... اچھا ابو بس آدھے گھنٹے تک واپس آجائیں گے۔''

''ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے جاؤ.....'' آریان کچھ جھجکتے ہوئے ان کے ساتھ ہولی۔ بابر چچا کی گہری نگاہوں نے ان دونوں کے سراپے کا موازنہ کیا اور ایک ہلکی سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

''اگر یہ دونوں ہمیشہ کے لیے یونہی ساتھ ساتھ رہیں تو اس میں کوئی ہرج تو نہیں۔''

بیٹے کی پسندیدگی تو انہوں نے محسوس کر لی تھی..... خود انہیں بھی آریان اس حیثیت سے اچھی لگی تھی..... اور انہیں یقین تھا کہ زاہدہ بیگم کو بھی اس فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ کہ اس دن، جب انہوں نے بچوں کے سامنے بابر چچا کی ذات کو نامعتبر کیا تھا۔ اس دن کے بعد سے وہ بہت بدل گئی تھیں۔ وجہ شاید یہ تھی کہ انہیں یہ احساس ہونے لگا تھا کہ بابر شاہ کے ساتھ انہوں نے زیادتی کی ہے۔ زندگی بھر جس شخص نے انہیں کسی کمی کا شکار نہیں ہونے دیا۔ ان کا ہر حق ادا کیا۔ محبت پر اختیار نہیں ہوتا لیکن جس نے ان کے لیے، اپنے بچوں کے لیے محبت سے دستبرداری کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اسی شخص کو یوں سرعام نامعتبر کر دینا بہت بڑی زیادتی تھی۔ سو وہ پہلے کی نسبت بہت خیال رکھنے لگ گئی تھیں بابر چچا کا۔ شاید اپنی زیادتی کا ازالہ کرنے کے لیے۔

گاڑی گیٹ سے باہر نکال کر فواد نے اپنے بائیں جانب خاموش بیٹھی آریان کی طرف دیکھا۔

''آریان! کہاں چلیں.....؟'' انہوں نے پوچھا۔

''جہاں آپ کا دل چاہے۔'' وہ یونہی سر جھکائے بولی۔

''میرا خیال ہے کہ کسی خاص جگہ پر جانے کی بجائے لانگ ڈرائیو بہتر رہے گی.....'' آریان نے کوئی جواب نہ دیا۔ گاڑی کے شیشے سے باہر کا منظر انتہائی خوبصورت لگ رہا تھا۔ اسلام آباد کی صاف ستھری سڑکیں' آسمان پر چھائے ہوئے بادل۔ اچانک ونڈ سکرین ننھے ننھے شبنم کے قطروں سے بھیگنے لگی۔

''فنٹاسٹک..... دیکھوں موسم کو بھی ہمارے ساتھ کتنی ہمدردی ہے۔'' فواد کا انداز بالکل نیا تھا۔ یوں جیسے بہت عرصے بعد اندر کا حبس ختم ہو گیا تھا۔ باہر کی ٹھنڈی پھوار دھیرے دھیرے اندر کی ساری کثافت کو صاف کر رہی تھی۔ جذبے نکھرنے لگے۔ یہ احساس کہ ان

کے بے حد نزدیک بیٹھا یہ مہکتا وجود ان کی ساری محبتوں، ساری وفاؤں کا حق دار ہے..... پیار کی نرمی سے اس کے وجود اور روح کا ہر زخم انہوں نے ہی رفو کرنا ہے' خود بخود نشہ سا بن کر ان کی آنکھوں میں سما گیا۔

''آریان! ایک بات پوچھوں؟'' انہوں نے بات شروع کی۔

''جی.....'' گھنیری پلکیں اٹھا کر اس نے عجب قیامت خیز انداز میں ان کی طرف دیکھا تھا۔

''تم.....تم میرے بارے میں کیا سوچتی ہو.....؟''

''آپ کو جب بھی دیکھتی ہوں دل کرتا ہے آپ کو پکاروں.....آپ کی عزت کرنے میں جان لڑا دوں۔ کبھی کبھی ہوتا ہے ناں آپ کسی کے بارے میں احترام اور عزت سے اتنا سوچتے ہیں۔ جتنا شاید اپنے بارے میں بھی وقت نہیں نکالنا چاہتے۔ مجھے آپ کے بارے میں عزت سے سوچنا، آپ کو عزت دینا بہت اچھا لگتا ہے۔''

''کمال ہے فواد میاں؟ تم تو کچھ اور ہی سمجھے بیٹھے تھے۔'' انہوں نے دھیمے سے لہجے میں خود سے کہتے ہوئے ہلکی سی چپت اپنے سر پر لگائی۔

''جی.....'' وہ حیران سی ہو کر بولی۔ ان کا کہا ہوا جملہ وہ ٹھیک سے سن نہیں پائی تھی۔

''آپ کے خیال میں آریان! آپ کے لیے جو کچھ میں اتنے عرصے سے کرتا آ رہا ہوں اس کی کیا وجہ ہے؟'' وہ تم سے آپ پر آ گئے۔

''آپ نے جو کچھ بھی کیا میں اس کے لیے آپ کی شکر گزار ہوں۔ بلکہ یہ لفظ اس کیفیت سے بہت کم ہے جو میں دل میں آپ کے لیے محسوس کرتی ہوں.....'' وہ ممنونیت سے بولی۔

''یعنی یہ سب کچھ جو میں نے کیا محض انسانی ہمدردی میں کیا.....ایم آئی رائٹ.....''

''جی.....'' وہ سر جھکا کر بولی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر وہ یہ عجیب و غریب باتیں کیوں کر رہے ہیں۔

''کیا تم اپاہج ہو۔ کوئی کمی ہے تمہاری ذات میں کہ تم سے ہمدردی کی جائے..... یہ سب میں نے ہمدردی میں نہیں کیا.....''

''پھر.....؟'' وہ سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

''پھر کا مفہوم سمجھا تو دوں مگر تمہاری ناراضگی کا ڈر ہے.....'' وہ شریر سے لہجے میں بولے۔

آریان کو تو آج ان کی ایک ایک بات حیرت زدہ کیے دے رہی تھی۔ فواد نے اس کی طرف دیکھا۔

''حیران مت ہو..... کچھ لفظ کچھ باتیں قبل از وقت کہہ دی جائیں تو اپنی دلکشی کھو دیتی ہیں..... سو پھر کا مفہوم پھر کبھی سہی..... میرا خیال ہے واپس چلنا چاہئے.....'' گہری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے کہا۔ آریان کو ان کی نگاہوں میں لکھے جذبے عجیب سی کیفیت کا شکار کر رہے تھے۔ اس نے گردن موڑ کر باہر کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ ان کی آنکھوں میں دیکھنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ فواد بھی اس کی کیفیت سمجھ رہے تھے۔ سو زیادہ ڈسٹرب کرنا انہوں نے مناسب نہیں سمجھا۔ اور واپس ہو لیے۔

کبھی کبھی انسان کا دل چاہتا ہے کہ سفر ختم ہی نہ ہو..... راستے طویل ہوتے چلے جائیں۔ لیکن یہ صرف اسی وقت ہوتا ہے جب ہمراہی دل کے قریب تر ہو..... دل ہمسفر کی رفاقت لمحوں کے بجائے صدیوں پر محیط ہو جانے کی دعائیں کرتا ہے۔ سو اس وقت فواد کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا۔ لفظ کسی آبشار کی صورت ان کے دل سے پھوٹ رہے تھے لیکن وہ انہیں ہونٹوں پر روک رہے تھے..... شاید اس لیے کہ ابھی محبت کی اوائل تھی..... جذبوں کی تشہیر اس وقت بھلی لگتی ہے جب وہ کندن ہو چکے ہوں۔ وقت سے پہلے کوئی بھی بات کر دینا اس کی اہمیت کو ختم کر دینے کے مترادف ہے.....

اور آریان ان ان کہے لفظوں کو سمجھ رہی تھی..... بھیگی بھیگی پلکوں میں جس کا عکس سمٹ رہا تھا' پھیل رہا تھا۔ اس کے لہجے کی نزاکت کو وہ نہ سمجھتی تو پھر کون سمجھتا۔ وہ زندگی..... وہ زندگی کیسی تھی۔ جب فواد شاہ کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو محبت کے مفہوم سے نا آشنا تھی۔ اس نے سوائے ماں کی محبت کے کسی اور محبت کا ذائقہ نہیں چکھا تھا۔ نہ باپ کی۔ نہ بہن بھائیوں کی۔ جنگل کی اس الہڑ ہوا نے راستے کا تعین کر لیا تھا۔ وہ قفس زدہ ماحول سے نکل کر خوشبو کی تلاش میں تھی جو اس کی روح کو شانت کر دے۔ محبت کے لمس سے نا آشنا رہی تھی۔ مگر محبت آمیز جذبوں سے بے خبر ہرگز نہیں تھی۔ جس سے دل کے گلزار مہک اٹھتے ہیں۔ اس کا دل عجیب اتھاہ میں ڈوبتا جا رہا تھا۔

''آریان.....'' فواد نے اسے بہت ہولے سے پکارا تھا۔ وہ ان کی طرف دیکھنے لگی۔

ایک نظم سنیں..... سنیں گی.....''

''جی.....'' آریان کے کہنے پر ایک لمحے کو فواد خاموش ہوئے۔ گاڑی اس وقت جس روڈ سے گزر رہی تھی وہ کوئی مصروف روڈ نہیں تھا۔ انہوں نے گاڑی کی رفتار بہت دھیمی کر دی۔ ونڈ سکرین پر نظریں جمائے کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ بہت نرم اور گداز لہجے میں بولنے لگے۔

چلو تم کو بتاتے ہیں
کہ تم کو دیکھ کر دل نے
کہا تم رشتہ جاں سے بھی بڑھ کر ہو
دعا کی سرحدوں پر
جو ادھوری ہے، مری ایسی تمنا ہو
میرے دل کا مقدر ہو
کہ تم اک روشنی بن کر، شفاء لیکر
کبھی دست مسیحا کی طرح
اترے ہوئے، ہر زخم دل پر ہو

چلو تم کو بتاتے ہیں
کہ تم ایماں ہمارا ہو
سرائے دہر میں، اندیشہ زندگانی میں
تم ہی دل کا سہارا ہو
جو روح کے آسماں پہ جگمگایا ہے محبت سے
سہانی شام کی چاہتوں کا پہلا تارہ ہو
وفا کا استعارہ ہو
تمہارے قرب کی خوشبو سے پتھر کی طرح ہم نے
سلگتی دھوپ میں پھیلاؤ پایا ہے
تمہارے پیار کی رنگین کنول ٹھنڈی ہوا سے سرسراتے ہیں
ہم ساون میں بھیگے پیڑوں کو چھو لیں تو
تمہارے لمس کی خوشبو کے لمحے جگمگاتے ہیں
چلو تم کو بتاتے ہیں
کہ ہم نے زندگی کے سب ورق لے کر
سب ہی سطروں میں لکھ لی ہے تمنا تم کو پانے کی
زمانے بھر میں شاید کاتب تقدیر کے ہاتھوں
میرے دل نے لکھ لی ہے تمہاری چاہ کی خواہش
تمہاری آرزوؤں کا جو ایک ادراک ہے مجھ میں
کسی میں ہو نہیں سکتا
تمہاری مسکراہٹ کا جو اک ارمان ہے مجھ میں
کسی میں ہو نہیں سکتا
چلو تم کو بتاتے ہیں۔

لفظوں میں بھی جان ہوتی ہے۔ یہ بھی دھڑکنوں کی طرح دھڑکتے ہیں۔ یہ بھی پھولوں کی طرح مہکتے ہیں اور بادلوں کی طرح برستے ہیں۔ آریان ان لفظوں کے ردھم میں پور پور بھیگ رہی تھی لیکن شاید ان دونوں کو ہی اپنی اپنی محبت کا بھرم رکھنا آتا تھا۔ واپسی کا سفر ختم

ہونے والا تھا۔لیکن اس مختصر سے سفر کی رفاقت نے ان دونوں کے دلوں میں یقین بھر دیا تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے ہی ہیں۔

☆.....☆.....☆

آریان کا بیان قلمبند کروانے کے بعد بابر شاہ اسے لیے ایس۔پی کے آفس سے باہر نکلے۔

''میرا خیال ہے بیٹا! کہ کم سے کم اب یہ دونوں تو اندر گئے.....ستارہ بیگم کے ہاتھوں کی پہنچ یہاں تک نہیں ہو سکے گی۔اس ٹینشن سے نجات کے بعد اب ہم پوری دلجمعی سے لاہور جا کر ستارہ بیگم سے ملاقات کر سکتے ہیں.....کیا خیال ہے تمہارا؟'' گاڑی کا فرنٹ ڈور کھول کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ خود گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھے۔

''جی انکل.....'' آریان نے مختصر جواب دیا۔

''شام ہونے والی ہے میرا خیال ہے فہدی کو بھی ساتھ لے چلیں۔'' بابر چچا خود کلامی کے سے انداز میں بولتے ہوئے گاڑی چلا رہے تھے.....فواد کا کلینک راستے میں پڑتا تھا۔سو وہ اسی طرح چل پڑے۔اصل مسئلہ تو کچھ اور تھا۔اصل میں وہ اس مریض سے متعلق کافی الجھن میں تھے۔سو ارادی غیر ارادی طور پر کلینک کی طرف رخ کر لیتے تھے۔کلینک پہنچ کر وہ جس وقت آریان کے ہمراہ آفس میں پہنچے تو وہاں کا ماحول دیکھ کر ٹھٹھک گئے۔کاشف فواد پر بری طرح ناراض ہو رہا تھا۔

''فہدی! یہ کس مصیبت کو گلے ڈال رکھا ہے.....آج پھر بھاگ نکلا وہ تمہارا چہیتا.....کتنی مشکل سے قابو کر کے لائے.....دو گھنٹے سڑکوں پر مارے مارے پھرتے رہے اس کی تلاش میں.....کچھ حاصل نہ وصول مفت کی سر دردی.....کل کلاں کو کسی گاڑی کے نیچے سر دے دے تو ہمارے اوپر بلاوجہ مصیبت آ جائے گی ناں.....'' کاشف آج سچ مچ ناراض تھا۔بابر شاہ اور آریان آگے بڑھ کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

''اسلام وعلیکم انکل.....'' کاشف کی نظر بابر شاہ پر پہلے پڑی۔فواد نے بھی سلام دعا کی۔

''کیا ہوا؟ خیریت تو ہے.....'' بابر شاہ نے پوچھا۔

''انکل کیسی خیریت اور کہاں کی خیریت.....پتا نہیں کہاں سے راہ چلتے پاگل کو لا کر سر پر مسلط کر رکھا ہے اس نے.....بھاگنے کی عادت ہے اسے.....ہر وقت آنے جانے کا جنون اس کے سر پر سوار رہتا ہے۔آج بھی بھاگ گیا۔کلینک کا آدھا عملہ اس کی تلاش میں سرگرداں رہا۔اتنی مشکل سے اسے ڈھونڈ کر قابو کر کے لائے.....میں اس سے یہ پوچھ رہا تھا کہ کیا ہر سڑک پر پھرنے والے پاگل، بے سہارا کو یہ یونہی اٹھا اٹھا کر کلینک لائے گا؟ فضول کی دردسری کا کیا اس نے ہی ٹھیکہ لے رکھا ہے؟''

''یار کاشف! اب تو وہ پہلے سے بہت بہتر ہو گیا ہے.....بات سمجھنے لگا ہے۔بس کچھ وقت لگے گا اور وہ ٹھیک ہو جائے گا لیکن اگر اسے ٹریٹمنٹ دینے کی بجائے یونہی سڑکوں پر لوگوں کے پتھر، ٹھڈے، دھتکار ملی تو پھر شاید وہ کبھی ٹھیک نہ ہو.....بلکہ ممکن ہے کہ مزید خراب ہو جائے اور پھر اسے صحیح کرنا ناممکن ہو جائے۔'' فواد کاشف کو سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے.....اس کے لیے اس حد تک غصیلے انداز کے باوجود فواد بہت تحمل سے کام لے رہے تھے۔

''اب کہاں ہے وہ.....؟'' بابر شاہ نے سوال کیا۔

''کہاں ہونا ہے موصوف نے..... کسی بندر کی طرح کمرے میں باندھا ہوا ہے۔'' کاشف جلے ہوئے لہجے میں بولا۔

''کیا میں اسے دیکھ سکتا ہوں؟'' بابر شاہ نے پوچھا۔

''آئیں میں خود لے چلتا ہوں.....'' فواد کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے..... بابر شاہ نے بھی اٹھ کر ان کے ساتھ قدم آگے بڑھائے۔ آریان اٹھنے لگی تو فواد نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

''تم بیٹھو..... ہم بس ابھی آتے ہیں.....'' انہوں نے کہا اور بابر شاہ کے ساتھ آفس کے دروازے سے نکل کر ملحقہ کمرے میں داخل ہو گئے۔ دروازے سے اندر آگے ہی انہیں وہ بیڈ پر دکھائی نہیں دیا تھا۔ زنجیروں سے باندھا ہوا تھا وہ لیکن بیڈ کے پائے کے ساتھ ٹیک لگائے نیچے زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔ گھٹنے سینے سے لگا کر ان کے گرد بازو حمائل کر کے ان پر سر رکھے بیٹھا تھا۔ وہ دونوں اس کے قریب جا کر بیٹھ گئے۔

''بابا.....'' فواد نے آہستگی سے پکارا لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا بدستور یونہی بازوؤں پر سر رکھے بیٹھا رہا۔

''بابا.....'' اب کی بار انہوں نے قدرے اونچی آواز میں پکارا تو اس نے بہت آہستگی سے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا..... اس کی شکست خوردہ آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ فواد اور بابر شاہ بے چین ہو اٹھے۔

''مرد ہو کر روتے ہو؟'' بابر شاہ کا یہ جملہ تلخ سہی لیکن اس پر اثر انداز نہیں ہوا تھا۔ اس نے محض نفی میں سر ہلایا یہ اور بات کہ پلکوں پر ٹکے آنسو چھلک کر اس کے گالوں کو بھگونے لگے۔

''تو پھر یہ کیا ہے.....؟'' انہوں نے اس کی بھیگی آنکھوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ آنسو کیوں نکل رہے ہیں؟''

''اندر پانی بہت جمع ہو گیا ہے۔ آنسوؤں کے ذریعے ختم کر رہا ہوں۔ تاکہ پھر کبھی روؤں نہ۔'' بہت سلیقے سے اس نے جواب دیا۔ بابر شاہ اور فواد نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

''تم نیچے کیوں بیٹھے ہو..... اوپر بیٹھو..... اٹھو شاباش۔'' بابر شاہ نے اس کا بازو پکڑ کر اسے اٹھانا چاہا لیکن اس نے بازو چھڑا لیا۔ کچھ دیر انہیں گھورتا رہا..... عجیب سا انداز تھا اس کا۔

''آپ سید ہیں نا.....'' ان کے سوال کے جواب میں بجائے جواب دینے کے اس نے جو سوال پوچھا وہ ان کے لیے غیر متوقع تھا۔

''ہاں..... میرا تعلق سادات فیملی سے ہے.....'' ان کا جواب سن کر وہ ایک طرف کو سرک گیا۔ جیسے خود کو سمیٹنا چاہتا ہو.....

''آپ..... آپ یہاں نہ بیٹھیں..... اوپر بیٹھیں..... آپ سید ہیں..... اوپر بیٹھیں.....'' اس کی آواز لرز رہی تھی۔

''تم بھی تو نیچے بیٹھے ہوئے ہو..... میں بیٹھ گیا تو کیا ہو گیا۔'' بابر شاہ بولے۔

''نہیں..... میں تو نیچ ذات کا ہوں..... میرا کوئی نسب نہیں..... میری کوئی پہچان نہیں..... میں آپ کے برابر کیسے بیٹھوں..... کیوں بیٹھوں.....''

بابر شاہ کے لاشعور کی اتھاہ گہرائیوں میں اس کا جواب سن کر کہیں کوئی سوئی ہوئی یاد دھیرے سے کسمسائی لیکن وہ اس یاد کے وجود کو محسوس نہ کر پائے۔

''تمہیں کس نے کہا کہ تم نیچ ہو..... تمہارا کوئی نسب نہیں۔'' بابر شاہ نے اس سے پوچھا۔ تو وہ انہیں یوں دیکھنے لگا جیسے ان کی سوچ پر افسوس کر رہا ہو۔

''ضروری تو نہیں کہ کسی کے بتانے پر ہی میں سمجھوں..... میرے وجود کا کوئی مجھے احساس دلائے تو تب ہی مجھے احساس ہوگا کیا.....'' وہ کس مضمون میں بول رہا تھا' بابر شاہ نہیں سمجھے۔ پھر انہوں نے دل میں سوچا کہ یہ کونسا نارمل انسان ہے ذہنی طور پر اپ سیٹ ہے اور میں اس سے ایسے گفتگو کر رہا ہوں جیسے یہ بالکل ٹھیک ہے۔ انہوں نے اس کی طرف دیکھا جو اپنی بات مکمل کرنے کے بعد دوبارہ سر جھکا کر بیٹھ گیا تھا۔

''تم کسی فیاض کو جانتے ہو؟'' بابر شاہ نے پوچھا تو ایک جھٹکے سے اس نے سر اٹھایا۔ اف خدایا کس قدر وحشت تھی اس کے چہرے پر۔ سارے جسم کا خون جیسے آنکھوں میں سمٹ آیا تھا۔ اس کی نظریں مسلسل بابر شاہ کو دیکھ رہی تھیں۔ ان آنکھوں کی وحشت دیکھ کر بابر شاہ اور فواد ایک قدم پیچھے سرک گئے۔ انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس پر دورے کی کیفیت طاری ہونے والی ہے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس نے ان کے چہروں پر نگاہیں ٹکائے ٹکائے ہی عجیب سے انداز میں نفی میں سر ہلایا۔

''میرے ساتھ چلو گے؟'' بابر شاہ نے پوچھا۔

''کہاں.....؟'' بھاری سی آواز اس کے حلق سے برآمد ہوئی۔

''جہاں تم کہو گے؟''

''شاہ صاحب! کیوں مذاق اڑاتے ہو میرا..... یہ آپ کے بس کی بات نہیں۔ میں نے جانا ہے ناں تو خود جاؤں گا۔ اور اب کہ جاؤں گا تو ہاتھ نہیں آؤں گا..... پیروں میں بیڑیاں ڈال کر کہتے ہو کہ تم آزاد ہو..... پرندے کے پر کاٹ کر اسے اڑنے کا مشورہ دیتے ہو..... اب کہ جاؤں گا تو نہیں آؤنگا..... خود جاؤں گا کسی کی مدد نہیں چاہئے..... جاؤں گا کوئی نہیں روک پائے گا.....'' پھر وہ سر پیچھے کر کے بیڈ کی پٹی سے ٹیک کر خلاؤں کو گھورتے ہوئے کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔

''میں آؤنگا..... نکلوں گا یہاں سے..... جاؤں گا..... جلد آؤنگا.....''

''بابا.....'' فواد نے اسے متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ پھر بابر شاہ نے بھی اسے پکارا لیکن وہ ان کی طرف متوجہ نہیں تھا یا شاید ان کی طرف متوجہ ہونا ہی نہیں چاہتا تھا۔ فواد نے بابر شاہ کو اٹھنے کا اشارہ کیا اور دونوں دوبارہ آفس میں آ گئے۔

''فواد! تمہارا کہنا درست ہے..... پہلے کی نسبت بہت بہتر ہو چکا ہے یہ..... آج اس نے جتنی باتیں بھی کیں بہت سلیقے اور تہذیب سے کیں..... بے ربط جملے اس کے منہ سے بہت کم نکلے ہیں۔'' وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

''جی ابو! میں یہی کاشف کو سمجھانا چاہ رہا تھا کہ اب وہ اپنی پرسنٹ ٹھیک ہو چکا ہے۔ بس کسی کسی وقت پٹڑی سے اتر جاتا ہے۔ اب اگر ہم اس سے مزید بولنے کی کوشش کرتے' کسی قسم کا استفسار کرتے تو وہ بھڑک اٹھتا..... لیکن مجھے یقین ہے کہ بہت جلد ٹھیک ہو جائے گا..... آپ یہ بتائیں کہ آریان سمیت کہاں سے آ رہے ہیں.....'' فواد نے بات کے اختتام پر ان سے پوچھا۔

''صبح بتایا تو تھا تمہیں کہ آریان کا بیان قلمبند کروانا تھا..... ایس۔ پی صاحب سے اس کی تفصیلی بات ہوئی ہے.....''

''پھر کیا نتیجہ نکلا.....؟'' فواد نے پوچھا۔

''فی الحال تو کچھ نہیں کہہ سکتے..... بہرحال امید کے کئی پہلو روشن ہیں..... تم یہ بتاؤ کہ گھر چل رہے ہو ہمارے ساتھ یا ابھی کام ہے کلینک میں.....'' بابر شاہ نے ان سے پوچھا۔

''[illegible]''

''[illegible]''

دونوں کلینک سے نکل کر گاڑی میں آ بیٹھے۔

بابر شاہ گاڑی ڈرائیو کر رہے تھے لیکن ان کا ذہن کا ہر نکتہ اس پاگل پر مرکوز تھا۔ اس کا لہجہ اس کی باتیں رہ رہ کر ان کے دماغ میں کھلبلی مچا رہی تھیں۔

''اندر پانی بہت جمع ہو رہا ہے اس لیے آنسوؤں کے ذریعے ختم کر رہا ہوں کہ پھر کبھی روؤں ہی نہ۔''

''میں نیچ ذات ہوں..... میری کوئی پہچان نہیں..... میرا کوئی [illegible]'' [illegible] دماغ میں شائیں شائیں ہونے لگی..... آندھیوں کے جھکڑ سے چلنے لگے [illegible] گرنے لگے تھے۔ پھر اچانک دماغ کی گہرائیوں میں دور تاریکیوں [illegible] بریک پر جا پڑا..... گاڑی کے ٹائر بہت بری طرح چرچرائے اور گاڑی [illegible] طرف دیکھنے لگی۔ اسے یہی لگا کہ بابر شاہ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ ان [illegible] ہوتی آنکھیں اسے متوحش کر گئیں۔ بابر شاہ کی نظریں پتا نہیں کون سے [illegible] جیسے کسی زلزلے کی زد میں تھا۔

''وہ ایک پھانس جو کافی عرصے سے دماغ میں نیزے کی [illegible] تھا..... اچانک تمام پردے سرک گئے تھے..... انہیں سب کچھ یاد آ گیا [illegible] نے بہت دھیرے سے بابر شاہ کے اسٹرنگ پر دھرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

''انکل کیا بات ہے..... آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟'' [illegible]

''کچھ نہیں..... کچھ نہیں بیٹا..... میں ٹھیک ہوں..... سوری بیٹا۔'' آریان سے بات کرنے کے بعد انہوں نے گاڑی سٹارٹ کی اور تقریباً فل سپیڈ میں بھگاتے ہوئے گھر لے آئے۔ گاڑی روک کر نیچے اترے۔ لان میں اس وقت فیض چچی، شینا پھپھو، روبیہ، انیقہ اور بڑی اماں موجود تھیں۔ بابر شاہ جس کیفیت اور عالم میں وہاں سے گزرے تھے اس میں انہیں رسماً بھی کسی سے دعا سلام کا خیال نہ آیا۔ چہرے پر شدید ٹینشن کا غبار سب ہی نے دیکھ لیا تھا اور محسوس کر رہے تھے کہ یقیناً کچھ غیر معمولی ہو گیا ہے۔ وگرنہ بابر شاہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اپ سیٹ ہونے والے آدمی نہیں تھے۔ آریان گاڑی سے اتر کر جب ان کے قریب آئی تو وہ سب پریشانی میں اس سے استفسار کرنے لگے کہ بابر شاہ کو کیا ہوا؟ بڑی اماں کے پوچھنے پر اس نے بتایا۔

''پتا نہیں بڑی اماں! ایس۔ پی صاحب کے آفس سے واپسی پر کلینک چلے گئے تھے۔ وہاں کسی مریض سے ملنے کے بعد کچھ اپ سیٹ ہوئے تھے۔ ڈرائیونگ کے دوران راستے میں بھی ایک دو بار حادثہ ہوتے ہوتے بچا.....'' آریان کو جو معلوم تھا اس نے بتا دیا۔ لیکن اس سے بابر شاہ کی پریشانی کا کیا ربط ہے کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

بابر شاہ کمرے میں داخل ہوئے تو زاہدہ چچی وارڈ روب کھولے پریس شدہ کپڑوں کی سیٹنگ میں مصروف تھیں۔ انہوں نے پلٹ کر ان کے چہرے کی طرف دیکھا۔

''آپ آ گئے..... کیا بنا؟'' انہوں نے یونہی پوچھ لیا تھا۔ وگرنہ ان کے چہرے پر پھیلی ٹینشن وہ پہلی ہی نظر میں دیکھ چکی تھیں۔

بیان ہو گئے.....'' کھوئے کھوئے لہجے میں کہتے ہوئے وہ بیڈ سائیڈ ٹیبل کھول کر دیکھنے لگے۔

''کیا تلاش کر رہے ہیں.....''

''وہ میرے سگریٹ کہاں ہیں.....؟''

''نیچے والی دراز میں ہیں.....''

''اگر زحمت نہ ہو تو ایک کپ چائے بنا لاؤ۔'' سگریٹ سلگاتے ہوئے انہوں نے زاہدہ چچی سے کہا۔

''جی اچھا.....'' وہ بغیر کچھ اور کہے خاموشی سے کمرے سے نکل گئیں۔ بابر شاہ کوئی عادی سموکر نہیں تھے۔ صرف شدید پریشانی کے عالم میں کبھی کبھار سگریٹ پینے لگ جاتے تھے۔

جب وہ چائے بنا کر لائیں تو کمرہ دھویں سے بھرا ہوا تھا۔

''خیر تو ہے.....'' کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر وہ پریشان سے لہجے میں بولیں۔

''ہاں خیریت ہی ہے.....'' ان کے اندر کیا ٹوٹ پھوٹ ہو رہی تھی۔ کسی سے بھی شیئر نہیں کر سکتے تھے۔ دماغ کے بخیے ادھڑ رہے تھے۔ عجیب سی اذیت رگ و پے میں دوڑ رہی تھی..... انہوں نے ادھ جلا سگریٹ ایش ٹرے میں مسلا اور بغیر چائے پیے اٹھ کر چلے گئے۔

''پتا نہیں کیا پریشانی ہے..... مجھے بھی نہیں بتاتے بس اکیلے ہی اذیت سہتے رہیں گے۔'' وہ بھی خود کلامی کرتی کمرے سے نکل

آئیں اور لان میں بڑی اماں کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔

''زاہدہ بچی..... یہ بابر کو آخر پریشانی کیا ہے؟'' بڑی اماں نے پوچھا۔

''کچھ نہیں پتا اماں بی..... کچھ بتاتے بھی تو نہیں ہیں۔''

''یہ آریان بتا رہی تھی..... کلینک میں کسی مریض سے ملنے کے بعد ایسے پریشان ہو گیا ہے۔''

''جی اماں..... فواد نے کلینک میں کوئی پاگل مریض لا کر رکھا ہوا ہے..... جس دن سے اس کو دیکھا ہے انہوں نے..... رات رات بھر جاگتے رہتے ہیں..... انہیں اتنا پریشان میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر مسئلہ کیا ہے۔'' وہ حقیقتاً بابر شاہ کے ناقابل فہم رویے پر پریشان تھیں۔

پھر رات گئے بابر شاہ گھر میں داخل ہوئے..... سادات نگر کے آدھے مکین سو چکے تھے اور کچھ سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ زاہدہ چچی کی بے خواب آنکھیں خواب گاہ کے دروازے پر ٹکی ہوئی تھیں۔ انہیں اندر آتے دیکھ کر وہ جلدی سے اٹھ بیٹھیں۔

''آپ آ گئے.....''

''ہوں.....'' وہ خاموشی سے ایزی چیئر پر بیٹھ گئے۔ سگریٹ بدستور ان کے ہاتھ میں سلگ رہا تھا۔

''آخر آپ اپنی پریشانی کیوں نہیں بتاتے مجھے۔''

''کیا بتاؤں.....'' بہت کمزور اور ٹوٹا ہوا لہجہ تھا ان کا۔ ''بس اتنا سمجھ لو زاہدہ آج سارے گھاؤ کھل گئے..... ٹوٹ کر بکھر گیا ہوں میں..... بہت بند باندھ رکھے تھے طوفان کے آگے لیکن..... لیکن سب کچھ بہہ گیا۔''

''ہو کیا گیا..... کچھ بتائیں تو سہی۔'' زاہدہ چچی ان کے ٹوٹے ہوئے انداز پر گھبرا کر بولیں۔

''کچھ دن پہلے تمہیں میں نے بتایا تھا کہ فواد کے کلینک میں ایک مریض کو دیکھا تھا میں نے۔''

''جی ہاں..... یاد ہے مجھے..... کیا ہوا اسے.....؟''

''اسے کچھ نہیں ہوا..... وہ الجھن دور ہو گئی جو اسے دیکھ کر دماغ میں پیدا ہوئی تھی..... کہ اسے کہاں دیکھا ہے۔''

''تو کیا پتا چل گیا.....''

''ہاں پتا چل گیا..... پہچان لیا میں نے اسے..... یاد آ گیا مجھے کہ میں اسے کیسے جانتا ہوں۔ کہاں دیکھا تھا میں نے اسے؟''

''کون ہے وہ.....؟'' زاہدہ چچی کے لہجے میں اشتیاق سمٹ آیا۔

''تم جان کر کیا کرو گی؟'' انہوں نے پہلو بچایا۔

''جس شخص کے لیے آپ اتنے پریشان ہیں وہ کوئی معمولی یا غیر اہم شخص نہیں ہو سکتا۔ میں آپ کی شریک زندگی ہوں بابر! کم سے کم مجھے تو پتا ہونا چاہیے۔'' ان کی بات کے جواب میں وہ کچھ نہیں بولے..... سگریٹ کا ایک گہرا کش لگا کر دھواں فضا میں چھوڑتے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

پرسکوت لہجے میں انہوں نے کہا۔ زاہدہ چچی دل پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئیں۔

''اور مسرتی! اس کا کچھ پتا چلا..... وہ کہاں ہے؟ کس حال میں ہے؟''

''نہیں..... کچھ پتا نہیں چلا..... پتا چل بھی کیسے سکتا ہے جو ہمیں اس کے بارے میں بتا سکتا ہے وہ تو حواسوں میں ہی نہیں..... زاہدہ..... دعا کرو وہ ٹھیک ہو جائے۔ اس کا ٹھیک ہونا بہت ضروری ہے۔ مسرت جہاں اس گھر کی وہ دکھتی رگ ہے جو اکیس سال سے مسلسل رس رہی تھی۔ اب اس عذاب مسلسل سے چھٹکارہ مل جانا چاہئے..... بہت سزا دے چکے ہم اسے..... اور بہت پچھتاوے کما چکے ہیں ہم۔'' بابر چچا کا لہجہ ہار ماننے والوں جیسا تھا۔ وہ ایک غصہ ایک ناراضگی جو مسرت جہاں کے لیے ان کے دل میں تھی وہ تو بیتے برسوں میں وقت کی دھول کے نیچے دب چکی تھی۔ اب صرف محبت تھی۔ اپنی اکلوتی بہن کے لیے دل میں موجود میٹھے نرم سے جذبے تھے۔ زاہدہ چچی خاموش بیٹھی ایک بدلے ہوئے شخص کو دیکھ رہی تھی۔

''تم ہی بتاؤ زاہدہ کیا بہت بڑا گناہ تھا اس کا..... کسی کو پسند کرنا اتنا بڑا جرم تو نہیں۔ رشتہ مناسب نہیں تھا تو انکار کیا جا سکتا تھا' اس طرح کہ فرجاد اور مسرت اس میں اپنے لیے ہتک یا زیادتی محسوس نہ کرتے..... لیکن ابا میاں نے جس طرح کا رویہ فرجاد ملک کے ساتھ روا رکھا اور ہم جس طرح اس کے خون کے پیاسے ہو گئے..... یہ ان دونوں کو ہی بہت ہتک آمیز لگا ہو گا۔ وہ بچی تھی' نا سمجھ تھی' عمر کی جس سیڑھی پر وہ کھڑی تھی وہاں ایسے خواب آنکھیں ضرور دیکھتی ہیں لیکن ہم نے اسے اپنے ہی گھر میں اجنبیت کی دیوار میں چن دیا۔ اس کے ساتھ ایسا رویہ رکھا جیسے وہ چھوت کی مریضہ ہو۔ اس کے ساتھ بات تک کرنی چھوڑ دی۔ ایسے حالات میں اس نے اگر انتہائی قدم اٹھا لیا تو قصوروار اکیلی وہی نہیں..... ہم بھی برابر کے شریک ہیں..... پھر سزا صرف اسی کے لیے کیوں؟'' بابر چچا آج آئینے میں اپنا اصل دیکھ رہے تھے۔ قصور اور سزا کو کسوٹی پر پرکھ رہے تھے کہ کون کتنا گناہ گار ہے۔ اور انہیں مسرت جہاں کے انتہائی قدم اٹھائے جانے میں اپنا قصور بھی دکھائی دے رہا تھا۔

''یہ سب اپنی جگہ ٹھیک! لیکن آپ کی پریشانی اور وہ بھی اس قدر سنگین پریشانی کی وجہ کیا ہے' وہ میں سمجھ نہیں پائی۔''

''زاہدہ! میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ فرجاد ذہنی طور پر بیمار شخص ہے۔ مسرت کے بارے میں ہمیں تب ہی پتا چلے گا ناں جب وہ ٹھیک ہوگا..... اور وہ..... وہ کلینک میں ٹکتا ہی نہیں۔ موقع ملنے پر بھاگنے لگتا ہے..... آج بھی دو گھنٹے مسلسل تلاش کے بعد وہ کلینک کے عملے کے ہاتھ لگا اگر وہ ایسے ہی کسی دن پھر بھاگ گیا تو پھر شاید ہی ہمیں مل سکے..... اگر وہ بھیڑ میں گم ہو گیا تو تمام عمر کے لیے ہمیں تہی داماں کر دے گا۔'' بابر چچا حساس لہجے میں بولے۔

''تو آپ اس کو گھر لے آئیں.....'' زاہدہ چچی نے تجویز دی۔

''کمال ہے! ایک غیر آدمی کو.....'' وہ خاموش ہو گئے۔

''غیر کیوں ہے..... اس گھر کا داماد ہے وہ..... اس گھر کی بہت قیمتی متاع اس کے پاس ہے..... وہ غیر کیسے ہو گیا۔'' زاہدہ چچی کی بات ان کے دل کو لگی۔

''ہاں کہتی تو تم ٹھیک ہو..... اس گھر سے اس کا رشتہ بہت مضبوط ہے پھر وہ غیر تو نہ ہوا۔ لیکن گھر کے باقی سب افراد.....''

''آپ کا کیا خیال ہے مسرتی کی محبت صرف آپ کے دل میں ہی جاگی ہے۔ بابر! اس گھر کا ایک ایک فرد اس کو یاد کرتا ہے۔ برملا نہ سہی..... ڈھکے چھپے انداز میں ہی سہی لیکن اس کا ذکر سب ہی کرتے ہیں۔ سوائے عارب بھائی کے..... آپ اسے گھر لے آئیں..... کسی کو اعتراض نہیں ہوگا..... سب ہی سر آنکھوں پر بٹھائیں گے اور ممکن ہے گھر کا ماحول اور اپنے اردگرد خوشگوار چہروں کو دیکھ کر وہ بھی جلدی ٹھیک ہو جائے..... اتنا تو مجھے یقین ہے کہ وہ ایک بار اگر یہاں آ گیا تو پھر یہاں سے بھاگے گا نہیں۔'' زاہدہ چچی وثوق سے بولیں۔ بابر چچا کو لگا ان کے ذہن سے آدھا بوجھ سرک گیا ہے۔

''ٹھیک ہے! پھر دیر نہیں کرنی چاہئے میں ابھی اماں بی سے بات کرتا ہوں..... بہت جلد اسے ہم یہاں لے آئیں گے۔'' بابر شاہ مطمئن ہوئے تو انہیں اس کو جلدی لانے کی فکر پڑ گئی۔ وہ اٹھ کر اماں بی کے کمرے کی طرف چل دیئے۔

☆.....☆.....☆

چھٹی کی گھنٹی بجی آریان نے ٹیبل پر بکھری چیزیں سمیٹیں اس کا آخری پیریڈ فری ہوتا تھا اور وہ یہ وقت پرنسپل آفس میں بیٹھ کر اخبار وغیرہ کا مطالعہ کر کے گزارتی تھی۔ تھوڑی دیر میں تمام ٹیچرز وہیں آ گئیں۔ اٹینڈنس لگا کر سب ہی آفس سے نکلتی چلی گئیں وہ اور روبیہ بھی سکول کے گیٹ سے باہر نکل آئیں۔ سکول کے سامنے دکانوں کی ایک قطار تھی اور قدرے فاصلے پر ایک چائے کا ہوٹل تھا۔ وہ دونوں سر جھکائے چلی آ رہی تھیں یہ جانے بغیر کے دو انگارہ آنکھیں مسلسل انہیں دیکھ رہی ہیں۔ پہلے روبیہ کو اپنے چہرے پر غیر محسوس سی تپش محسوس ہوئی تو اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ہوٹل کے باہر بچھے ہوئے بنچ پر کالے کمبل میں لپٹا ہوا وہ شخص اس کے لیے بالکل انجان تھا۔ لیکن اس کی متلاشی نظروں کی چبھن روبیہ کو اپنے وجود کے اندر اترتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے آریان کا ہاتھ تھام لیا۔ آریان نے اس کی طرف دیکھا۔

''کیا بات ہے روبی؟''

''رینی.....وہ.....وہ شخص.....'' روبیہ نے دائیں جانب دیکھتے ہوئے کہا تو آریان اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھنے لگی۔ سیاہ کمبل میں منہ سر لپیٹے وہ شخص اس کے لیے بھی اجنبی ہی تھا۔ اس کا چہرہ تقریباً کمبل میں چھپا ہوا تھا۔ صرف آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ انہیں اپنی طرف متوجہ دیکھ کر وہ بنچ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''رینی.....وہ.....وہ اٹھ گیا ہے بنچ سے.....'' روبیہ اس کے اس طرح اٹھنے پر گھبرا گئی۔

''روبی.....تیز تیز قدم اٹھاؤ.....آج انکل بھی نہیں.....'' آریان بولی۔ روبیہ کی ساری توجہ اس سیاہ کمبل والے پر مرکوز تھی جو اب دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا اسی راستے پر آ گیا تھا جدھر سے چل کر وہ آئی تھیں۔ غیر محسوس طریقے سے روبیہ اور آریان کے قدموں میں تیزی آ گئی.....کمرشل ایریا ختم ہو چکا تھا اور رہائشی کالونی شروع ہو گئی۔ دوپہر کا وقت تھا.....چلچلاتی دھوپ میں سب گھروں میں تھے گلیاں تقریباً سنسان تھیں۔ وہ شخص مسلسل ان کے پیچھے آ رہا تھا۔ وہ تیز قدم اٹھاتیں تو اس کے قدموں میں بھی تیزی آ جاتی۔ وہ دھیمے قدموں سے چلتیں تو وہ بھی آہستہ آہستہ چلنے لگتا۔ لیکن ان کا درمیانی فاصلہ اب کم ہوتا جا رہا تھا۔ آریان اور روبیہ کو اب یقین ہو گیا تھا کہ وہ ان کا پیچھا کر رہا تھا۔ وہ دونوں گھبرا رہی تھیں۔

''رینی! یار کیا مصیبت ہے.....یہ کون ہے؟ اب تو ستارہ بیگم کے غنڈے بھی گرفتار ہو چکے ہیں۔'' روبیہ پریشانی سے بولی۔

''تو تم کیا سمجھتی ہو ستارہ بیگم کے پاس غنڈوں کی کمی ہے۔ پتا نہیں کتنے پال رکھے ہیں حرام کی کمائی کھلا کھلا کر.....'' آریان کا خون کھولنے لگا۔ دھیرے دھیرے وہ شخص اب ان کے بے حد قریب آ گیا تھا۔ روبیہ اور آریان کی تو جان ہی حلق میں اٹک گئی۔ وہ اب تقریباً بھاگنے کا سوچ رہی تھیں جب اچانک بہت نرم سی آواز آئی۔

''رانی بیٹا.....'' تیز ہوتے قدم سست پڑ گئے۔ دھڑکنیں جیسے تھم سی گئیں۔ آریان کو شاید اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ رکی نہیں تھی۔

''رانی بیٹا.....'' آواز پھر آئی اور اب کی بار آریان کے قدم رک گئے۔ اس نے گھوم کر اس سیاہ کمبل والے کو دیکھا۔ ایسے تو اسے صرف گھنگھرو بابا پکارتے تھے۔ پھر جیسے وہ جان گئی۔

''گھنگھرو بابا.....'' اس کے ہونٹوں سے ادا ہوا۔

''روبی.....روبی یہی ہیں میرے گھنگھرو بابا.....یہی ہیں میرے دوست، میرے ہمراز' میرے بچپن کے ساتھی.....یہی ہیں گھنگھرو بابا آپ.....آپ ٹھیک تو ہیں ناں.....'' آریان بے تابی سے ان کا ہاتھ تھام کر خود فراموشی کی سی کیفیت میں بولی۔ اس لمحے وہ یہ بھی بھول گئی کہ وہ گھر کی چار دیواری میں نہیں بلکہ گلی میں کھڑی ہے۔ روبیہ بھی خاموش کھڑی اس کو دیکھ رہی تھی۔

''رانی بیٹا! معاف کرنا تمہیں پریشان کیا.....تمہاری خیریت معلوم کرنا بھی ضروری تھا۔ بس اسی لیے چلا آیا۔ منہ اس وجہ سے

چھپا رکھا ہے کہ ستارہ بیگم کے کتے پہچان نہ لیں۔" اسی وقت ایک گاڑی ان کے قریب آ رکی۔ گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص نے بہت غور سے ان کی طرف دیکھا تھا۔ گھنگھرو بابا نے ایک نظر گاڑی کی طرف دیکھا۔

"بس رانی بیٹا! میں اب چلتا ہوں۔" وہ کہہ کر تیز تیز قدموں سے چل پڑے۔ بابر شاہ گاڑی سے اتر آئے۔

"آریان بیٹا! کون ہیں یہ؟" وہ آریان کو ان سے باتیں کرتے ہوئے دیکھ چکے تھے۔

"انکل..... یہ میرے گھنگھرو بابا ہیں....." آریان فخریہ لہجے میں بولی۔ گھنگھرو بابا تھے ہی ایسے کہ جن سے تعلق پر وہ بجا طور پر فخر کر سکتی تھی۔

"تو روکو انہیں! کہاں جا رہے ہیں یہ۔" بابر شاہ تیزی سے گھنگھرو بابا کی طرف بڑھے۔

"ایک منٹ رکیئے پلیز....." بابر شاہ کے پکارنے پر گھنگھرو بابا نے رک کر پلٹ کر ان کی طرف دیکھا اور پھر آریان کی طرف۔

"بابا! آپ گھر چلیں ہمارے ساتھ..... وہاں تفصیل سے بات کریں گے۔" وہ بولی۔

"نہ رانی بیٹا! بی بی بے کل ہوں گی۔ وہ تو کہہ رہی تھیں غلام عباس تمہارے چوکھٹ سے پیر باہر رکھتے ہی میرا انتظار شروع ہو جائے گا..... جلدی آنے کی کوشش کرنا..... بی بی کا کہا رکھنا ہے مجھے..... میں دیر نہیں کر سکتا....."

"گھنگھرو بابا! میں بھی تو آپ کی بی بی کی کچھ لگتی ہوں۔ ناراض ہوں تو میرا نام لے دیجیے گا..... کچھ نہیں کہیں گی۔ اب چل پڑیں۔" آریان ان کا بازو تھام کر گاڑی تک لائی تو انہیں گاڑی میں بیٹھتے ہی بنی۔ گھر پہنچ کر سب سے پہلے کھانے وغیرہ سے فارغ ہوئے۔ پھر بابر شاہ، آریان اور گھنگھرو بابا کو ساتھ لیے ٹی۔ وی لاؤنج میں بیٹھ گئے۔ زاہدہ چچی کو زبردست سی چائے کا آرڈر دینے کے بعد بابر چچا، گھنگھرو بابا سے تفصیل سے گفتگو کرنے لگے۔

"رستم اور کبیر نے پکڑے جانے سے پہلے ستارہ بیگم کو فون کر کے اس گھر اور سکول کا پتا بتا دیا تھا۔ اب ان کے پکڑے جانے کے باوجود ستارہ بیگم کے ہرکارے ہر جگہ چوکس پھر رہے ہیں۔ رانی بیٹا کی خیریت کی طرف سے اطمینان نہیں تھا سو مجھے اپنی جان خطرے میں ڈال کر یہاں آنا پڑا..... بی بی کی بے چینی دیکھی نہیں جا رہی تھی....."

"غلام عباس صاحب! یہی نام بتایا ہے نا آپ نے....." بابر چچا ایک پل کو رکے۔

"جی ہاں....."

"جی غلام عباس صاحب! آریان کی طرف سے آپ بالکل فکر مند نہ ہوں۔ اور اپنی بی بی سے بھی کہہ دیجیے گا کہ آریان اب محفوظ ہے..... اس کے اردگرد جو حصار ہے وہ اتنا کمزور نہیں کہ ستارہ بیگم یا اس کے آدمی وہ حصار توڑ کر آریان تک پہنچ سکیں۔ ہماری اپنی بھی بیٹیاں ہیں اور بیٹیوں کی عزت کی حفاظت کیسے کی جاتی ہے ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔" بابر شاہ کا چٹانوں کی طرح مضبوط لہجہ گھنگھرو بابا کے اندر طمانیت بھر گیا۔ انہوں نے سکون بھرا سانس لیا۔

''مجھے اب کوئی فکر نہیں ہے..... اکیس سال اس بچی کو بہت سنیت سنیت کر رکھا ہے۔ گھنگھرو کی جان چلی جائے غم نہیں لیکن اسے کچھ نہیں ہونا چاہئے۔'' گھنگھرو بابا کا لہجہ اور آنکھیں بھیگنے لگیں۔ ان کا سر جھک گیا۔ بابر شاہ اور آریان کے دل میں ان کے جملے اتر رہے تھے۔ کمرے کے ماحول پر ایک عجیب سی بوجھل خاموشی طاری ہوگئی۔

''آپ کی دعائیں رہیں تو بہت جلد آریان ہی نہیں آپ کی بی بی بھی ان ظالموں کے چنگل سے آزاد ہونگی۔'' بابر شاہ بولے تو گھنگھرو بابا نے ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔

''الٰہی تیرے رنگ..... زمین اور آسمان کا ملاپ ہو جائے گا..... شاہ صاحب! ایک معجزہ ہوگا یہ جو وہاں آباد ہیں ان سب کے لیے انہونی ہوگی۔ بھلا کوٹھے والوں کو کسی نے کب عزت دی ہے.....''

''نہیں غلام عباس صاحب! ہر انسان عزت کا حق دار ہے۔ وہاں بیٹھے لوگ شوق نہیں مجبوری میں ذلت خریدتے ہیں اور عزت بیچتے ہیں۔ آریان کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ کبھی کبھی خاندانی لوگ بھی اس کیچڑ بھری دلدل میں گر جاتے ہیں۔ پھر اگر ہم جیسے لوگ ان کو کسی مشکل سے نجات دلانے کا وسیلہ بن جائیں تو کیا مضائقہ ہے۔'' بابر شاہ سادہ سے لہجے میں بولے۔

''گھنگھرو کی آنکھوں نے بڑے نظارے دیکھے..... ایک ایک چہرے کے کئی کئی پرت..... ذات والوں کی بدذاتی۔ غیرت والوں کی بے غیرتی۔ غرور سے اٹھے سروں کو کٹتے دیکھا..... فخر کرنے والوں کو جھکتے دیکھا پر شاہ صاحب! ایسا کہیں نہیں دیکھا۔ عزت دار وہاں جاتے ضرور ہیں' کچھ روز کے لیے ذات فروشوں کو عزت کے پلنگ پر بھی بٹھاتے ہیں لیکن آپ جانو طوائفیں تو تریڑ کھائے برتن کی طرح ہوتی ہیں۔ ان کی کشش دنوں میں ختم ہو جاتی ہے اور پھر ان عزت داروں کے گھر میں ان ٹوٹے ہوئے برتنوں کے لیے کونسا شوکیس رکھا ہوتا ہے۔ اپنے بکھرے ارمان سمیٹ کر واپس وہیں آجاتی ہیں' جہاں سے عزت کی زندگی کے خواب دیکھتے ہوئے رخصت ہوتی ہیں۔ پر شاہ صاحب! آج تک ایسا کوئی ایسا مرد نہیں دیکھا جو کسی طوائف کو بہن اور بیٹی بنا کر گھر کی چار دیواری کی اماں بخشے۔'' غلام عباس عرف گھنگھرو بابا کے لہجے میں بابر شاہ کے لیے عقیدت ہی عقیدت تھی۔

''بس غلام عباس صاحب! اور زیادہ شرمندہ مت کریں۔ میں کسی میڈل کسی تمغے کی خواہش میں یہ سب نہیں کرنا چاہتا اور نہ ہی مجھے تعریف کا لالچ ہے۔ میں تو بس آریان بیٹی کی روشن پیشانی پر ثبت گدلاہٹ دور کرنا چاہتا ہوں۔ اسے اس کا اصل مقام دلانا چاہتا ہوں اور اس کے لیے مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔''

''میری مدد کی..... پر مجھ جیسا کم مایہ انسان آپ کی کیا مدد کر سکتا ہے؟'' گھنگھرو بابا حیرت سے بولے۔

''آپ اندر کے آدمی ہیں..... یقیناً ستارہ بیگم کی ہر عادت سے واقف اور اندرونی تمام رازوں کو جانتے ہوں گے۔'' بابر شاہ نے کہا۔

''جی ہاں! بڑی بائی جی میری بڑی عزت کرتی ہیں۔ میری ماں مرتے دم تک ان کی وفادار تھی اور مجھے بھی یہی سبق پڑھایا تھا اس

نے.....اس نے مجھے کہا تھا کہ ستارہ بیگم کی زندگی بھر خدمت کرنا..... پر شاہ جی بی بی کی ذات ایسی بیچ میں آئی کہ ماں کا کہا بھول گیا میں۔ ستارہ بیگم سے غداری کرنے لگ گیا۔ پر جی وہ ابھی مجھ پر ویسا ہی اعتبار کرتی ہے جیسا پہلے کرتی تھی۔'' غلام عباس سر جھکائے بولا۔

''تو آپ کے خیال میں کیا وہ آریان اور اس کی امی کو ہمارے حوالے کر دے گی؟''

''ناممکن ہے.....ستارہ بیگم اپنے کوٹھے کے ٹوٹے ہوئے برتن اور پھولوں کی بکھری ہوئی پتیاں بھی باہر نہیں پھینکتیں..... یہ تو پھر دو زندہ وجود ہیں۔ رانی بیٹا میں وہ اپنے مستقبل کے خواب دیکھ رہی ہیں۔ اور بی بی! پچھلے اکیس بائیس سال سے صرف آواز بیچ کر اس کے لیے لاکھوں کی کمائی کا ذریعہ بنی ہوئی ہیں..... آج بھی بہت سے لوگ محض ان کی آواز پر لاکھوں لٹا دیتے ہیں۔ ستارہ بیگم کبھی نہیں چاہیں گی کہ یہ دونوں ان کے ہاتھ سے نکلیں۔

''پھر کیا ہمیں قانونی راستے سے انہیں حاصل کرنا ہوگا.....'' بابر شاہ استفہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

''قانون.....'' بڑی زہر خند مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر مچلی۔'' قانون تو خود بائی جی کے تلوے چاٹتا ہے۔ یہ وردی والے جو دن بھر کمزوروں پر قہر بن کر ٹوٹتے رہتے ہیں۔ رات کی سیاہی میں ستارہ بیگم کے آگے یوں جھکتے ہیں جیسے نیاز مند پیر و مرشد کے آگے۔ اپنا ایمان، اپنی عزت گروی رکھ رکھی ہے انہوں نے.....لیکن آپ ہمت نہ ہاریں۔ کوشش کر کے دیکھتے ہیں۔ ان کی دکھتی رگ کو پکڑیں۔ شاید وہ مان جائے۔''

''کیا مطلب.....؟''

''طوائف کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ جیب دیکھ کر رویے میں ردوبدل کرتی ہے۔ جہاں نوٹ نظر آئے وہاں مسکراہٹ ہوگی اور الفت بھی.....آپ کو ان سے سودا کرنا ہوگا۔ ممکن ہے وہ مان جائے.....''

''ہوں.....ٹھیک ہے.....آپ ہمارے ساتھ ہی چلیے گا.....ایک آدھ دن میں۔''

''نہیں شاہ جی! مجھے اجازت دیں.....بی بی کو جا کر تسلی دینی ہے کہ رانی بیٹا بالکل ٹھیک ہے اور خوش بھی ہے.....بس آپ سے التجا ہے اس کا بہت خیال رکھیے گا.....'' گھنگھرو بابا نے اسے اپنے بازو کے حلقے میں لے کر اس کا سر سینے سے لگایا۔ اس کی پیشانی چومی۔

''آپ کی مجبوری نہ ہوتی تو ہم مزید اصرار کرتے لیکن ایک ماں کی تکلیف کو سمجھتے ہیں۔ اس لیے آپ کو رکنے پر مجبور نہیں کریں گے لیکن آپ یہاں سے جاتے ہوئے مطمئن رہیے۔ آریان کو یہاں کوئی تنگی نہیں ہوگی۔'' بابر شاہ انہیں رخصت کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور ان کے ساتھ ہی گیٹ تک آئے۔

''گھنگھرو بابا نے بہت گرم جوشی سے بابر شاہ سے مصافحہ کیا ایک بار پھر آریان کو پیار کیا اور بھیگی آنکھیں لیے رخصت ہو گئے۔ آریان کی آنکھوں کے گوشے بھی بھیگ گئے۔ لیکن یونہی کسی دکھ کی وجہ سے نہیں ان سے ملنے کی خوشی کی وجہ سے تھی۔

☆.....☆.....☆

دہلیز پر ٹکی آنکھوں میں انتظار کی ریت چبھنے لگی تھی۔ دو دن سے اس نے کوئی محفل بھی اٹینڈ نہیں کی تھی۔ ستارہ بیگم جانتی تھی کہ مامتا کو بیٹی کی تکلیف برداشت نہیں ہو رہی لیکن وہ ہمدردی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ یہاں ہمدردی کر کے خود ہی نقصان اٹھانے والی بات تھی۔ اس نے اگر ذرا سی بھی چاندنی کی دلجوئی کرنی تھی تو جواب میں چاندنی کی التجا اور آرزو یہی ہونی تھی کہ اس کی بیٹی سے دستبردار ہو جائے..... اور ستارہ کے لیے یہ گھاٹے کا سودا تھا۔ اسی لیے اس نے چاندنی کے اس رویے کا زیادہ نوٹس نہیں لیا تھا۔ گھنگھرو بابا بھی کل سے غائب تھا۔ نہیں تو اسی کے ذریعے چاندنی کو سمجھا بجھا لیتی۔ تماش بین بار بار چاندنی کی فرمائش کر رہے تھے اور وہ اس کی ناسازی طبیعت کا بہانہ کیے جا رہی تھی۔

رات ہو گئی لیکن وہ کمرے سے باہر نہیں نکلی۔ کمرے میں ہی اندھیرا کیے بستر پر پڑی رہی۔ طبلوں کی تھاپ پڑنے لگی۔ گھنگھرو پیروں میں بندھنے لگے، لچکتے، مٹکتے، مہکے ہوئے سراپے ادھر سے ادھر سے آ جا رہے تھے لیکن کسی کو فرصت نہیں تھی کہ کوئی اس سے اس کا دکھ پوچھتا۔

''ایک وہ نہیں..... تو یہاں کسی کو بھی میرا خیال نہیں۔ یہ لوگ جو میرے اردگرد بستے ہیں۔ زندہ دل، بے فکرے لوگ..... یہ لچکدار لبوں جیسی لڑکیاں جن کی مائیں خود انہیں غیروں کی آغوش میں دھکیل کر بے غیرتی کے اس سرعام مظاہرے پر کھلکھلا کر ہنستی ہیں۔ یہاں میرا کون ہے..... میں یہاں کس لیے ہوں..... برسوں دامن کو بچائے میں نے کرب سہتے زندگی گزار دی اور اب..... اب میری بیٹی بھی گھنگھرو باندھے گی۔ اس کے ڈھکے چھپے ہوئے سراپے کو ہولناک نظریں برمے کی طرح چھیدیں گی اور میں..... میں کچھ نہیں کر سکوں گی..... یا الٰہی! تیری اس دنیا میں کوئی جائے اماں ہے بھی یا نہیں.....'' اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''بی بی.....'' اندھیرے میں آواز ابھری تو وہ تڑپ کر بستر پر اٹھ بیٹھی۔ اسی پل کمرا روشنی میں نہا گیا۔ مسافت میں دھول دھول ہوتا ہوا غلام عباس اس کے سامنے کھڑا تھا۔

''غلام عباس! اتنی دیر کر دی تم نے..... میں نے تمہیں بتایا بھی تھا کہ یہ انتظار نہیں ہوتا مجھ سے..... بہت بے صبری ہوں میں..... پھر بھی..... پھر بھی تمہیں احساس نہیں ہوا..... اتنی دیر لگا کر آئے.....'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

''بی بی..... بی بی معاف کر دیں پر یوں نہ روئیں..... بی بی..... خدارا..... چپ ہو جائیں۔'' غلام عباس نے آگے بڑھ کر اس کے پیروں پر ہاتھ رکھ دیے۔

''غلطی ہو گئی بی بی! پر رانی بیٹا کے اصرار پر مجھے وہاں کچھ دیر رکنا پڑ گیا تھا۔ میں نے اس سے کہا بھی تھا کہ بی بی منتظر ہوں گی۔ پر اس نے کہا کہ میرا نام لے لینا وہ ناراض نہیں ہوں گی.....'' غلام عباس سر جھکا کر بولا۔ چاندنی نے پیر سمیٹ لیے اس کی آنکھوں سے بہتے آنسو تھم گئے۔

''کیسی ہے وہ..... ٹھیک تو ہے.....!''

''بی بی! ہماری رانی بیٹا کو تو اللہ نے ایسی امان دی ہے کہ کیا کہوں..... شاید فرشتے اگر انسانوں کے روپ میں آئیں تو وہ ایسے ہی ہونگے جیسے وہ لوگ..... انہوں نے رانی بیٹا کو بالکل اپنی بیٹیوں کی طرح رکھا ہوا ہے۔ اس کی ہر ضرورت ہر سہولت کا خیال رکھتے ہیں۔ میں پیسے دینے لگا تو منع کر رہے تھے کہ یہ ہماری بیٹی ہے اور اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھنا ہمارا فرض ہے۔ پر میں نے آپ کا نام لے کر اصرار کیا تو وہ خاموش ہو گئے۔''

''اچھا..... تو وہ..... وہ خوش بھی ہے۔'' چاندنی بے تابی سے بولی۔

''ہاں بی بی! بہت خوش ہے وہ بس آپ کو یاد کر کے اداس ہو گئی تھی۔ بی بی! پتا ہے وہ لوگ کیا کہتے ہیں..... آپ اطمینان رکھیں..... وہ رانی بیٹا کو بائی جی کے چنگل سے آزاد کرا لیں گے خواہ انہیں اس کے لیے کتنا ہی نقصان اٹھانا پڑے.....'' غلام عباس کی بات سن کر چاندنی کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو آ گئے۔

''مولا! تو معاف کر دینا۔ بہت تھڑ دلی ہوں میں..... تکلیف آئی تو شکوہ کر بیٹھی تجھ سے حالانکہ یہ میرا مقام نہیں..... تو' تو بہت بلند ہے اور میں حقیر ذرہ..... میری کیا بساط کے تجھ سے شکایت کروں۔ مجھے معاف کر دینا پالنے والے۔'' وہ دل ہی دل میں اپنے رب سے مخاطب تھی۔ سچی بات یہ تھی کہ غلام عباس کی باتیں سن کر وہ بہت حد تک مطمئن ہو گئی تھی کہ اب آریان کو بظاہر کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن ماں کبھی مکمل طور پر سکون نہیں پا سکتی سو وہ بھی اس کے لیے پریشان تھی۔

☆.....☆.....☆

اماں بی اور گھر کے دوسرے افراد کے ساتھ بات کر کے بابر شاہ کافی حد تک مطمئن ہو گئے تھے۔ فرجاد کو گھر لانے کی مخالفت کسی نے نہیں کی تھی۔ البتہ عارب تایا ابھی بے خبر تھے کہ گھر میں کیا کھچڑی پک رہی ہے۔ اماں بی کے دل کا درد سوا ہو گیا تھا۔ مسرت جہاں کو اٹھارہ سال انہوں نے اپنی آغوش میں سمیٹ سمیٹ کر رکھا تھا۔ پانچ بھائیوں کے بعد کتنی منتوں مرادوں سے انہوں نے بیٹی پائی تھی۔ اس کی ہلکی سی تکلیف پر اماں بی ساری ساری رات جاگ کر گزار دیتیں۔ اس کی پرورش کے دوران وہ گھر، بچوں، میاں حتیٰ کہ اپنے آپ سے بھی غافل ہو گئی تھیں۔ وہی مسرت جہاں جوان کے گلے میں بازو ڈال کر اور ان کے بازوؤں میں جھول جھول کر فرمائشیں کیا کرتی تھی' جب اس گھر کی دہلیز پار کرنے لگیں تو ایک پل کو بھی ماں کی قربانیوں، اس کی محبت کے بارے میں نہیں سوچا ہوگا۔ اگر سوچتیں تو ضرور یہ خیال بھی آتا کہ میری ماں جیتے جی مر جائے گی۔ وہ تو سادات نگر کی ساری محبتیں، ساری رفاقتیں، سارے رشتے بھول کر ایک نئی منزل کی طرف چل پڑی تھیں۔ لیکن شبیر حسین شاہ کے لیے وہ رات ساری زندگی پر محیط ہو گئی۔ انہوں نے خود کو اس امتحان کے قابل نہ سمجھا کہ اس رات کی کالک منہ پر تھوپ کر وہ ایک بار پھر دنیا کا سامنا کرتے۔ سو اس رات کی سیاہی میں ہی مدغم ہو گئے۔ ایسے خاموش ہوئے کہ پھر کبھی نہ بول پائے..... بھری دنیا میں تحقیر اور اذیت کے تیر سہنے کو اماں بی رہ گئیں۔ بیٹوں نے مسرت جہاں کے گھر سے چلے جانے کے بعد چپ سادھ لی۔ سارا جوش، ساری غیرت اپنی موت آپ مر گئی۔ وہ دنیا کے کارخانوں میں اپنے حصے کا کام کرتے رہے۔ سانسیں بھی لیتے رہے لیکن

مسرت جہاں جو زخم ان کے دل پر لگا گئی تھیں۔ وقت بھی اس کا مرہم نہ بن سکا۔

پر اب اکیس سال بعد اس کے ملنے کی امید نظر آئی تو سارے گلے شکوے جیسے کہیں دور جا سوئے۔ ایک خلش تو تھی لیکن اب وہ اتنی اذیت نہیں دیتی تھی۔ اور اماں بی..... وہ تو اپنے جگر پارے سے ملنے کو اتنی بے کل ہو گئی تھیں کہ دل ہی دل میں دعا کر رہی تھیں فرجاد جلدی سے ٹھیک ہو جائے۔ انہیں ان کی مسرت جہاں کا پتا بتا دے۔ وہ ایک بار اسے اپنے سینے سے لگا کر دل میں جلتی ممتا کی آگ ٹھنڈی کر لیں۔ پھر چاہے زندگی ان سے روٹھ جائے۔ شاید وہ ابھی تک اسی امید اور اسی آرزو پر جی رہی تھیں۔ شاید پروردگار نے انہیں مہلت اسی لیے دی ہوئی تھی۔

''بابر شاہ فرجاد کو کلینک سے لے آئے تھے۔ گاڑی گیٹ سے اندر داخل ہوئی تو فرجاد نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

''یہ کہاں لے کر آئے ہیں مجھے.....''

''آج سے تم نے یہیں رہنا ہے ہمارے پاس..... وہ کلینک والے تمہیں تنگ کرتے تھے ناں۔ تمہارے ہاتھ پیر باندھتے تھے زنجیروں سے..... تمہیں زبردستی انجکشن لگاتے تھے۔ میں اس لیے تمہیں یہاں لے آیا ہوں..... یہاں تم آزاد پھرو گے۔ تمہارے پیروں میں کوئی زنجیر نہیں ڈالے گا۔'' بابر شاہ بال مکمل کر کے گاڑی سے نیچے اترے۔ پھر گھوم کر دوسری طرف آئے اور اس کی طرف کا دروازہ کھولا۔

''آؤ.....'' انہوں نے اسے باہر آنے کو کہا تو وہ بغیر مزاحمت کیے خاموشی سے اتر آیا۔ وہ چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ لیکن ان آنکھوں میں کوئی جذبہ، کوئی رنگ نہیں تھا۔ جیسے اس کے لیے یہ کوئی اجنبی جگہ نہ ہو۔ بہت عام سا انداز تھا اس کا۔ بابر شاہ کے ہمراہ وہ لان میں آ گیا۔ شام کا وقت تھا سو سب ہی حسب معمول وہیں بیٹھے ہوئے تھے۔ اماں بی اسے دیکھ کر اضطراری انداز میں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ بابر شاہ نے سب کو تنبیہہ کی ہوئی تھی کہ اس پر ابھی اپنی یا اس کی حقیقت واضح نہ کی جائے۔ اسے بس یہاں گھر کا ماحول ملنا چاہیے۔

''اماں بی..... یہ ہیں میرے دوست..... اور دوست یہ میری اور اب تمہاری بھی اماں بی ہیں۔'' بابر شاہ نے مبہم سا تعارف کروایا۔ فرجاد بہت دھیمے قدموں سے چلتا تقدس کی اس مورت کے قریب آن رکا جنہیں بابر شاہ نے اماں بی کہا تھا۔

''اماں بی.....'' یہ لفظ اسے اپنے ہونٹوں پر بہت غیر مانوس اور اجنبی سے لگے۔ اماں بی کا لرزتا ہوا ہاتھ اس کے سر پر ایک لمحے کو ٹکا اور پھر ان کے پہلو میں جھول گیا۔ کیسی کیفیت تھی جس کا عذاب وہ اپنے دل پر سہہ رہی تھیں۔

''یہ شخص جو خود سے بھی بے گانہ ہے..... ان کی مسرت جہاں کا شریک زندگی ہے..... اس شخص کے خواب مسرت جہاں کی آنکھوں نے دیکھے..... پتا نہیں کتنا عرصہ اس شخص کے ساتھ گزارا ہو گا انہوں نے..... پتا نہیں اب کس حال میں ہو گی وہ؟'' اماں بی کو خود پر شدید غصہ آ رہا تھا۔ کیسی ماں تھیں وہ جو اپنی بیٹی سے اکیس سال تک بے خبر رہیں۔ پتا نہیں یہ سال اس نے ہنس کر گزارے یا رو کر، سکھ میں بتائے یا دکھ میں۔

بابر شاہ نے فرجاد کو کچھ دیر کے لیے سب کے درمیان بٹھایا۔ فیضی چچی اور حدیقہ چچی بہت دلچسپی سے اس گھر کے داماد کو دیکھ رہی

تھیں۔انہوں نے تو پہلی بار دیکھا تھا۔اچھا خاصا ہینڈسم آدمی تھا وہ بس ذہنی طور پر اپ سیٹ ہونے کی وجہ سے خود سے لاپرواہ ہو گیا تھا۔بابر شاہ نے جب دیکھا کہ فرجاد اب تھکن محسوس کر رہا ہے تو وہ اسے لے کر اپنے پورشن میں آ گئے..... جہاں پہلے ہی اس کے لیے کمرہ سیٹ کیا ہوا تھا۔اسے کمرے میں بستر پر لٹا کر زاہدہ چچی کو اس کا خیال رکھنے کا کہہ کر وہ خود کسی ضروری کام سے دوبارہ باہر نکل گئے۔

رات کو عارب تایا کو جب یہ خبر ملی کہ فرجاد ملک کو بابر شاہ گھر لے آئے ہیں تو ایک بار پھر خون کھول اٹھا۔وہ غصے سے تن فن کرتے اماں بی کے پاس پہنچ گئے۔

''اماں بی..... یہ بابر آخر چاہتا کیا ہے..... کیوں سادات نگر میں کوئی ایسا طوفان لانا چاہتا ہے کہ اس آشیانے کا تنکا تنکا بکھر جائے۔''

''کیا ہو گیا..... آرام سے بیٹھ کر بات کرو.....''

''اماں بی! پہلے ایک طوائف زادی کو زبردستی اس گھرانے پر تھوپا اس کے بیٹے نے..... اور بجائے روک ٹوک کے الٹا سب نے اسی کی حمایت کی..... اور اب یہ فرجاد..... اس کو کس خوشی میں یہاں آنے کی اجازت دیدی گئی؟''

''وہ یہاں خود نہیں آیا..... اسے لایا گیا ہے۔''

''وہی وجہ جاننا چاہتا ہوں کہ کس لیے اسے یہاں لایا گیا۔'' عارب شاہ بلند آواز میں بول رہے تھے۔

''اس لیے کہ وہ ذہنی طور پر ٹھیک نہیں۔اس کا ٹھیک ہونا بہت ضروری ہے۔وہ کلینک میں ٹکتا نہیں تھا۔مجبوراً بابر اس کو گھر لے آیا تاکہ اس کے ٹھیک ہونے پر مسرت بچی کے بارے میں پوچھا جائے کہ وہ کس حال میں ہے کہاں ہے؟''

''آخر کس لیے..... جب یہاں سے چلی گئی ہے وہ تو مرے یا جیے ہمیں اس سے کیا؟'' وہ برافروختہ ہوتے ہوئے بولے۔

''اتنے پتھر دل مت بنو عارب! بے شک اس نے جو کیا غلط کیا لیکن اس گھر کی دہلیز چھوڑ کر چلے جانے کے باوجود وہ اب بھی یہاں حق رکھتی ہے۔اب بھی خون کا رشتہ قائم ہے اس سے.....''

''میں ایسے رشتوں کو نہیں تسلیم کرتا جن کو نبھاتے ہوئے عزت اور غیرت کا جنازہ نکل جائے..... جس دن اس نے یہ دہلیز چھوڑی..... ہر رشتہ تو وہ خود توڑ گئی۔کیا باپ کی غیرت، بھائیوں کی ناموس، ماں کی ممتا اس قدر بے وقت اور حقیر تھیں جنہیں وہ روند کر چلی گئی..... معاف کیجیے گا اماں بی اس کے لیے آپ کے دل میں جگہ ہو سکتی ہے لیکن میں اس کے بارے میں سوچنا بھی گوارا نہیں کرتا۔'' عارب شاہ کے لہجے میں نفرت گھلی ہوئی تھی۔اماں بی نے ملامتی نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

''نہ جانے عارب تمہاری فطرت کیسی ہے..... میں یا تمہارے ابا میاں تو ایسے نہیں تھے۔اور اگر آج وہ زندہ ہوتے تو یقیناً مسرت جہاں کے لیے ان کے دل میں بھی میری ہی طرح محبت جاگ اٹھتی۔''

''وہ زندہ ہوتے تب ناں..... انہیں تو آپ کی لاڈلی خود اپنے ہاتھوں قتل کر کے گئی ہے..... اور آپ کتنی آسانی سے ایک قاتل کو

معاف کر رہی ہیں۔ اس لیے کہ وہ آپ کی بیٹی ہے۔ اکیس سال تک اس گھر میں اس کا نام تک نہ لیا گیا اور اب، اب اس شخص کو جس کی وجہ سے سادات نگر طوفانوں کی لپیٹ میں آیا تھا۔ اس گھر میں داماد کی حیثیت دی جا رہی ہے۔ کل کو مسرت جہاں کے لیے بھی اس گھر کا دروازہ کھل جائے گا..... سب کچھ ویسا ہی ہو جائے گا لیکن کیا ابا میاں کی زندگی اتنی ارزاں تھی کہ جسے بالکل نظر انداز کر دیا جائے۔ اماں بی اگر وہ اس گھر میں آئی تو میں اس گھر میں نہیں رہوں گا۔'' عارب شاہ فیصلہ کن لہجے میں کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔ اماں بی سرد سی آہ بھر کر رہ گئیں۔

''ادھر فرجاد جب سے سادات نگر میں آیا تھا وہ بالکل خاموش ہو گیا تھا۔ زیادہ تر وہ اپنے کمرے میں ہی رہتا کبھی کبھار لان میں نکلتا تو ایک گوشے میں بیٹھا رہتا۔ کلینک سے آنے کے بعد سے اسے دورہ بھی نہیں پڑتا تھا۔ بابر شاہ اس کی حرکات و سکنات کا بغور جائزہ لے رہے تھے۔ محض دو تین دنوں میں ہی اس کی آنکھوں میں کچھ چمک آ گئی تھی۔ زاہدہ چچی اس کی خوراک اور دوا کا بہت باقاعدگی سے خیال رکھ رہی تھیں۔ بابر شاہ ایک دن اسے ہیئر کٹنگ سیلون بھی لے گئے تھے۔ بال ترشوانے اور شیو کروانے کے بعد اس کی شخصیت بہت نکھری نکھری لگنے لگی تھی۔ بابر شاہ نے محسوس کیا تھا کہ وہ گھر کے بڑوں کی نسبت بچوں کے درمیان بیٹھ کر خوشی محسوس کرتا ہے۔ گھر کے سب ہی بچے اور نوجوان اس کے قریب رہنے لگے تھے۔ آہستہ آہستہ فواد بھی ان میں شامل ہونے لگے۔ فرجاد ملک کے لیے یہ دنیا بہت نرالی اور اچھوتی سی تھی۔ لڑکیاں اور لڑکے سب اس کے ساتھ یوں فرینک ہو گئے تھے جیسے وہ شروع سے ہی اس گھر کا ایک فرد رہا ہو۔ اس کی ذہنی کیفیت آہستہ آہستہ اعتدال پر آنے لگی تھی۔

آج سب کزنز فواد کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے اور فرجاد کو بھی اپنے پاس بٹھا رکھا تھا۔ پہلے بڑے کزنز کے درمیان بیت بازی کا مقابلہ ہوا..... کافی دیر تک شعر و شاعری ہوتی رہی پھر اپنے اپنے قصے سنانے شروع کر دیئے۔ چھوٹے بچے بور ہونے لگ گئے۔

''فہدی بھائی! ہم بور ہو رہے ہیں.....'' طاہر منہ بسور کر بولا۔ بڑوں کی محفل میں انہیں کیا مزہ آنا تھا۔

''تو پھر کیا کیا جائے.....'' فواد نے مسکرا کر کہا۔

''یہ کیا جائے..... کہ ہمیں کہانی سنائی جائے۔'' باصر نے مشورہ دیا۔

''کہانی..... اوں..... بیٹا کہانی تو عرصہ ہوا پڑھنی چھوڑ دی سو یاد نہیں ہاں..... ایسا کرتے ہیں انکل سے کہتے ہیں کہ وہ تم سب کو کوئی کہانی سنائیں۔'' فواد نے فرجاد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''بالکل ٹھیک.....'' باصر چہک کر بولا اور پھر باصر، اطہر، طاہر اور حسنین نے بھی فرجاد کے گرد گھیرا ڈال لیا۔

''ہاں انکل ہمیں کہانی سنائیں.....''

''کہانی.....'' فرجاد نے ان سب کی طرف دیکھا۔

''جی..... ہم نے آج آپ سے کہانی سننی ہے۔ کوئی بہانا نہیں چلے گا۔'' حسنین نے کہا۔

سنا دیں انکل! ورنہ یہ نمونے آپ کی جان نہیں چھوڑیں گے۔'' انیقہ نے کہا تو فرجاد نے ایک نظر سب کی طرف دیکھا۔

''ٹھیک ہے ننھے منے دوستو! ایک کہانی یاد تو ہے مجھے۔ لیکن تم بور تو نہیں ہو گے۔'' فرجاد نے کہا۔

''نہیں انکل ہم بور نہیں ہونگے لیکن کہانی میں دیو ہونگے ناں۔'' ہارر کا دلدادہ اطہر اشتیاق سے لبریز لہجے میں بولا۔

''ہاں اس کہانی میں ایک شہزادہ ہے اور ایک شہزادی۔ اور دیو بھی ہیں۔'' سب خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔ فواد بہت غور سے فرجاد کو دیکھنے لگا۔ شاید وہ اس کی ذہنی کیپ ایبلٹی کا جائزہ لینا چاہتے تھے۔ فرجاد نے سر جھکا لیا۔ اب صرف چھوٹے بچے ہی نہیں انیقہ، روبیہ، آریان، مہوش، شاذان سب ہی اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''یہ کہانی ایک شہزادی کی ہے ایک انتہائی خوبصورت اور پیاری سی شہزادی کی..... وہ بادشاہ کی اکلوتی بیٹی تھی اور بہت لاڈ پیار میں پلی تھی۔ شہزادی کو پتا ہے کیا عادت تھی؟''

''کیا.....؟''

''وہ ساون میں جھولے جھولا کرتی تھی۔ گیت گایا کرتی تھی۔ اس کی زندگی میں خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔ رنگ ہی رنگ تھے..... پھر ایک دن اس شہزادی کی ملاقات ایک شہزادے کے ساتھ ہوئی۔ لیکن وہ شہزادہ اس کی طرح نہ تو امیر تھا اور نہ ہی لاڈلا.....''

''انکل..... کیا شہزادے بھی غریب ہوتے ہیں.....؟'' باصر معصومیت سے بولا تو فرجاد نے مسکرا کر اس کا گال تھپتھپایا۔

''ہاں! کبھی کبھی شہزادے بھی غریب ہوتے ہیں۔ تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ جس مدرسے میں شہزادی پڑھنے جاتی تھی شہزادہ بھی اسی مدرسے میں پڑھتا تھا۔ شہزادے کو شہزادی کی پیاری پیاری صورت اور اس کا بھولپن بہت اچھا لگا وہ اس سے چپکے چپکے پیار کرنے لگا۔''

''انکل ہمیں تو نہیں پتا پیار کیسے ہوتا ہے؟''

''جب بڑے ہو گے تو سمجھ جاؤ گے۔ فی الحال چپ کر کے کہانی سنو۔'' شاذان نے اطہر کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی۔

''ایک دن موقع پا کر شہزادے نے شہزادی کو بتا دیا کہ وہ اسے بہت چاہتا ہے۔ شہزادی پہلے تو بہت گھبرائی، کسمسائی لیکن آخر کار اس نے شہزادے کی محبت قبول کر لی..... پھر وہ ایک دوسرے سے ملنے لگے۔ شہزادی کا باپ بہت سخت بادشاہ تھا..... شہزادی اس سے ڈرتی بھی بہت تھی لیکن شہزادے کی محبت کی وجہ سے اس میں کچھ ہمت آ گئی۔ اس نے شہزادے سے کہا کہ وہ بادشاہ سے اس کا ہاتھ مانگ لے.....''

''اس کا بھلا کیا مطلب ہوا؟''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ بادشاہ سے درخواست کرے کہ وہ شہزادی کی شادی اس کے ساتھ کر دے۔''

''تو کیا بادشاہ نے ان دونوں کی شادی کر دی۔'' طاہر عجلت میں بولا۔

''تم بیچ میں ٹانگ نہ اڑاؤ تو شاید ہو جائے..... ظالم سماج کی طرح بار بار سامنے آ کھڑے ہوتے ہو.....'' شاذان طاہر کے منہ پر ہاتھ رکھ کر بولا تو فرجاد نے مسکرا کر دونوں کی طرف دیکھا۔

''نہیں بیٹا! ان کی شادی نہیں ہو سکتی تھی شہزادی امیر تھی اور شہزادہ غریب۔ پھر بھی شہزادے سے بادشاہ سے کہا کہ وہ شہزادی کو ہر

طرح خوش رکھ سکتا ہے۔ پر بادشاہ نے شہزادے کو دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دیا۔ شہزادی کے پانچ بھائی جو اصل میں دیو تھے وہ اس شہزادے کے دشمن ہو گئے۔ شہزادہ اپنے گھر چلا گیا چپ چاپ لیکن شہزادی کو بادشاہ کے رویے پر بہت دکھ تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ شہزادے کے ساتھ چلی جائے گی اپنا محل اور ساری دولت چھوڑ کر۔'' فرجاد کی نگاہیں دور خلاؤں کے پار جیسے کسی نکتے پر مرکوز تھیں۔ باہر سے گزرتے ہوئے بابر شاہ وہیں کھڑکی کے قریب رک گئے تھے۔

''پھر کیا ہوا انکل..... کیا شہزادے کو دیوؤں نے مارا؟''

''نہیں..... شہزادہ ان کے ہاتھ ہی نہیں آیا لیکن انہوں نے شہزادی پر ظلم ڈھانے شروع کر دیئے۔ ایک دن شہزادی تنگ آ کر اپنا سب کچھ چھوڑ کر شہزادے کے پاس چلی گئی۔''

''واہ یہ ہوئی نا بات..... بڑی بہادر شہزادی تھی.....'' شاذان خوش ہو کر بولا۔

''ہاں شہزادی بہت بہادر اور حوصلے والی تھی۔ شہزادے نے اس شہزادی کا ملک چھوڑ دیا اور اسے لے کر ایک دوسرے ملک میں اپنے ایک دوست کے پاس چلا گیا..... وہاں جا کر شہزادے نے ایک چھوٹا سا گھر بنایا۔ اور اپنے دوست کے ساتھ کاروبار کرنے لگا۔ ان دونوں کی زندگی میں بہت سکون تھا۔ اور پھر جب انہیں یہ پتا چلا کہ ان کے گھر ایک اور ننھا شہزادہ یا شہزادی آنے والا ہے تو وہ دونوں خوشی سے پاگل ہو گئے..... شہزادہ جی جان سے اس کا خیال رکھتا تھا۔ وہ تھی ہی اتنی پیاری..... لیکن شہزادے کا دوست در پردہ اس کا دشمن بنتا چلا گیا۔ اس کی نیت شہزادے کی دولت پر بھی تھی اور شہزادی پر بھی۔ پھر جب ایک دن وہ کام کے سلسلے میں کسی دوسرے ملک گئے ہوئے تھے۔ شہزادے کے دوست نے سیر کا پروگرام بنایا اور پھر جب سیر کرنے کے لیے وہ کسی پہاڑی علاقے میں گئے تو شہزادے کے دوست نے اسے پہاڑ سے دھکا دے دیا۔

''تو کیا شہزادہ مر گیا اور انکل..... اس ننھے منے شہزادے کا کیا بنا۔'' انا جو بڑی محویت سے سن رہی تھی اسے کہانی میں یہیں دلچسپی محسوس ہوئی۔ فواد اس سارے دورانیے میں نہایت خاموشی سے فرجاد کا جائزہ لیتے رہے۔

''پتا نہیں شہزادہ مر گیا یا بچ گیا..... یہ بھی نہیں پتا کہ ننھا شہزادہ تھا یا شہزادی۔ شہزادے کو تو اپنی شہزادی کی بھی خبر نہیں ہو گی کہ وہ کس حال میں ہو گی۔'' بات ختم کر کے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''انکل کہاں جا رہے ہیں آپ.....''

''میں..... میں جا رہا ہوں..... میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں.....'' وہ یکدم ہی ڈسٹرب نظر آنے لگا تھا۔ اس کے کمرے سے نکلنے کے بعد آہستہ آہستہ سب ہی اٹھ کر چلے گئے تو بابر شاہ اندر داخل ہوئے۔

''فہدی..... کیا ہو رہا تھا بیٹا۔'' وہ کہتے ہوئے فواد کے قریب ہی بیٹھ گئے۔

''ابو..... کچھ خاص نہیں اصل میں انکل جب سے آئے ہیں بالکل خاموش خاموش سے رہتے ہیں۔ سوان کو ذرا انجوائے کرانے

مل بیٹھے تھے کہ شاید ماحول کی خوشگواریت ان کی سوگواری کو کم کر دے۔"

"تو اس نے تم لوگوں کے ساتھ گفتگو میں حصہ لیا یا نہیں۔"

"بچوں کو ایک کہانی سنائی بس۔"

"اس کے بولنے سے کچھ اندازہ لگایا تم نے۔" بابر شاہ نے پوچھا۔

"جی ابو! وہ نائنٹی فائیو پرسنٹ ٹھیک ہو چکے ہیں بس ایک محض خول سا ہے جو انہوں نے اپنے اردگرد چڑھا رکھا ہے۔ جب یہ خول بھی ٹوٹ گیا تو سمجھیں بالکل ٹھیک ہو جائیں گے انشاء اللہ اور ایسا بہت جلد ہوگا۔" فواد پر یقین لہجے میں بولے۔ اس کی کہانی بچوں کے لیے تھی لیکن فواد کو بہت سے کلیو مل گئے انہیں لگا یہ اس کی اپنی کہانی تھی۔

گویا فرجاد کے ساتھ جو حادثہ پیش آیا اس کا ذمہ دار اس کا دوست ہے اور پھپھو کے ساتھ جانے اس نے کیا سلوک روا رکھا ہوگا..... کیا خبر وہ زندہ بھی ہیں یا..... فواد اس سے آگے نہ سوچ سکے۔

"تم کس سوچ میں گم ہو گئے؟ میں تمہیں یہ بتانے آیا تھا کہ ایس پی صاحب دو تین دنوں کے لیے لاہور جا رہے ہیں، اپنے آفیشل کام کے سلسلے میں اور انہوں نے ہمیں بھی ساتھ جانے کو کہا ہے تاکہ آریان والا معاملہ بھی لگے ہاتھوں نمٹا لیا جائے۔" بابر شاہ نے ظاہر ہی نہ کیا کہ وہ فرجاد کی ساری کہانی سن چکے تھے اور مسرت جہاں کے معاملے میں بھی قدرے مایوس تھے۔ اس لیے کہ فرجاد اب ٹھیک ہو بھی جاتا تو انہیں مسرت جہاں کے بارے میں شائد کچھ نہ بتا پاتا۔ بہر حال یہ تو بعد کی باتیں تھیں پہلے جو مسئلہ ان کے سامنے تھا اس کا حل بہت ضروری تھا۔

"تو ٹھیک ہے ابو چلے چلتے ہیں ان کے ساتھ....." فواد نے بھی حامی بھر لی..... رات میں اماں بی کے کمرے میں جب بابر شاہ نے یہی بات تفصیل سے بتائی تو اظہر شاہ بھی ان کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئے۔ اماں بی خوش تھیں کہ آریان کی طرف اب میلی نگاہیں نہیں اٹھیں گی۔ اب وہ ایک گھر کی چار دیواری میں محفوظ ہوگی۔

"اماں بی آریان کے ساتھ ساتھ اس کی والدہ کا بھی رہائی پانا ضروری ہے وگرنہ یہ آزاد ہونے کے باوجود کبھی خوش نہیں رہ سکے گی۔" بابر شاہ نے کہا۔

"اور ابو دوسری بات یہ ہے کہ وہ بھی اس کی طرح بے گناہ ہیں، وہ کوئی پیشہ ور نہیں ہیں۔ ستارہ بیگم ان کی مجبوری کا سودا کرتی رہی ہے....." فواد نے کہا۔

"ہاں..... اب ستارہ بیگم سے دو دو ہاتھ کرنے ہیں۔" اظہر شاہ جوش سے بولے۔ علی الصبح وہ تینوں جانے کو تیار کھڑے تھے۔ سبھی گھر والے انہیں رخصت کرنے گیٹ تک آئے۔ اماں بی نے تینوں کے سروں پر شفقت سے ہاتھ پھیرا، پیشانی چومی اور دعائیں دیں۔ آریان اماں بی کے کندھے سے لگی کھڑی تھی۔ فواد اماں بی سے پیار وصول کرنے کے بعد جانے کے لیے پلٹے پھر کچھ سوچ کر رک گئے.....

رخ موڑ کر شریر نظروں سے آریان کی طرف دیکھ کر بولے۔

''مانا کہ آپ دعائیں نہیں دے سکتیں لیکن دعا کر تو سکتی ہیں۔'' آریان جھینپ گئی۔

''میں دعا کروں گی.....''

''بہت بہت شکریہ..... بڑی نوازش.....'' لہجہ شرارتی اور آنکھوں میں جھلملاتی جوت۔ آریان نے خود کو اماں بی کے پیچھے چھپانے کی کوشش کی۔

''اب آجاؤ.....ایس پی صاحب ہمارے انتظار میں بیٹھے نہیں رہیں گے.....فلائٹ میں بہت کم وقت رہ گیا ہے۔'' اظہر چچا نے ہانک لگائی تو وہ مسکراتے ہوئے سب کو خدا حافظ کہہ کر گیٹ سے باہر نکل گئے.....آریان جانتی تھی کہ وہ ناممکن کو ممکن بنانے نکلے ہیں۔ اماں بی کے ہاتھ میں تسبیح کے دانے اوپر تلے گر رہے تھے اور ہونٹوں پر جانے والوں کے لیے ڈھیروں دعائیں۔

''الٰہی.....تو جانتا ہے میرے بچے ایک نیک کام کی تکمیل کے لیے گھر سے نکلے ہیں۔ تیرا حکم ہے برائی کو روکو، زبان سے ہاتھ سے کسی بھی طرح اور میرے بچے برائی کو روکنے کی خواہش لے کر گئے ہیں۔ مولا! تو ان کی مدد کرنا.....اس بچی کی عزت کا اب تو ہی محافظ ہے۔'' وہ زیرِ لب بڑبڑاتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ آریان بھی باقی سب کے ساتھ واپس ہو لی تھی یہ اور بات کہ اس کارواں رواں فواد، بابر شاہ اور اظہر شاہ کی کامیابی کے لیے دعا گو تھا۔

لاہور پہنچ کر ایس پی صاحب ان تینوں کے ہمراہ پہلے اپنی عارضی قیام گاہ گئے جہاں انہوں نے ان تینوں کی رہائش کا بندوبست کروایا اور پھر سب ہی فریش ہو کر لاہور کے ایس پی زاہد صاحب کے آفس چل پڑے۔ وجہ یہ تھی کہ کامران صاحب سرکاری دورے پر تھے اس لیے انہوں نے اپنے ریسٹ ٹائم میں ان کا معاملہ دیکھنا تھا۔ سو وقت ضائع کیے بغیر وہ انہیں اپنے ہمراہ لیکر زاہد صاحب کی طرف آ گئے۔ وہاں ان کا بہت اچھی طرح استقبال کیا گیا۔ زاہد صاحب پولیس میں ہونے کے باوجود خاصی خوشگوار طبیعت کے مالک تھے۔

''زاہد بھائی! ہم ایک بہت اہم معاملے پر آپ سے ڈسکس کرنا چاہ رہے تھے اسی لیے آپ دیکھ رہے ہیں کہ ابھی لاہور پہنچے ہیں اور بغیر ریسٹ کیے آپ کی طرف آ گئے۔'' کامران نے بات شروع کی۔

''اس کا مطلب ہے کوئی بہت اہم مسئلہ ہے.....''

''جی ہاں..... بہت اہم اور انتہائی نازک بھی لیکن آپ کی پہنچ میں ہے۔ آپ چاہیں تو سلجھ جائے گا۔'' کامران بہت اچھے طریقے سے انہیں اپنے ٹریک پر لا رہے تھے۔

''ارے یار جب اپنی پہنچ میں ہے تو پھر پریشانی کاہے کی.....جلدی سے بتاؤ۔'' زاہد صاحب سیدھے کرسی پر ہو بیٹھے۔ کامران نے ساری بات ان کے گوش گزار کر دی۔

''ہوں.....میرے بھائی معاملہ بڑا ٹیڑھا ہے.....بڑے سبھاؤ سے حل کرنا پڑے گا۔ ستارہ بیگم کا نام تو بڑے اونچے اسٹیٹس کے

لوگوں میں لیا جاتا ہے، بڑی مضبوط معاشرتی ساکھ رکھتی ہے وہ.....اس پر ہاتھ ڈالنا اتنا آسان نہیں۔'' زاہد صاحب سنجیدگی سے بولے۔

''کیا مطلب؟ کیا پولیس اس معاملے میں کوئی قدم نہیں اٹھا سکتی۔''

''ارے بھائی میرے! پولیس کا خیال تو تم اپنے ذہن سے نکال ہی دو.....قانون اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ ہم اس پر ہاتھ ڈال بھی دیں تو اس کا محض ایک فون پورے تھانے کے عملے کی پٹیاں اتروا سکتا ہے.....''

''تو پھر.....'' کامران شش و پنج میں مبتلا ہو کر بولے۔

''تو پھر یہ کہ اس کو کسی قسم کی دھمکی دینے کی بجائے.....اس پر کوئی دباؤ ڈالنے کی بجائے اس سے طریقے سے بات کرنی ہوگی۔'' زاہد صاحب نے کہا

''وہی تو پوچھ رہے ہیں وہ کون سا طریقہ ہے۔'' فواد پہلی بار بولے۔ بابر شاہ اور اظہر اس تمام وقت میں خاموش رہے۔

''یہ اس طرح کہ ہمیں خود کو اس کے رنگ میں رنگ کر اس سے ملاقات کرنی ہوگی، ہم ایک خریدار کی حیثیت سے اس سے متعارف ہوں گے، بعد میں آہستہ آہستہ اس کو اپنی لائن پر لے آئیں گے۔''

''لگتا ہے ستارہ بیگم کی بڑی دہشت ہے لاہور میں۔'' اظہر شاہ طنز سے بھرپور لہجے میں بولے۔ انہیں ایس پی زاہد جیسے عہدیدار کے منہ سے ایک طوائف کے بارے میں اس طرح کی باتیں اچھی نہیں لگیں۔

''دیکھئے جناب! ہم اس سے ڈرتے نہیں لیکن مصلحت سے کام لیتے ہیں، ہم اس پر دباؤ ڈالنا چاہیں تو ڈال سکتے ہیں لیکن جواب میں کیا ہوگا۔ کسی وزیر، کسی مشیر کا بھانجا، بھتیجا، بیٹا اس کے ہاں آنے جانے والا چند لمحوں میں ہی اس کی جان چھڑوا دے گا۔ یہ ایک چین ہے میرے بھائی۔ بڑے بڑے عہدیداروں اور کوٹھے والوں کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے اس لیے یہاں مصلحت سے کام لینا ہماری مجبوری ہے بہرحال آپ کامران کے ساتھ آئے ہیں سو میرے لیے انتہائی محترم ہیں۔ میری کوشش یہی ہوگی کہ پہلی فرصت میں آپ کا کام کیا جائے جس کی خاطر آپ اتنی دور سے یہاں آئے۔''

زاہد صاحب اظہر شاہ کے طنز کو نظر انداز کر کے بہت دھیمے لہجے میں بولے۔

''تو بھائی اس مسئلے پر اب کرنا کیا ہے؟'' کامران نے سوال کیا۔

''کامران آج تو دو تین بہت ضروری کام ہیں.....کل شام دو چار سول کپڑوں میں پولیس والوں کے ہمراہ وہاں چلے چلیں گے، ماحول بھی دیکھ لیں گے اور مناسب وقت دیکھ کر ستارہ بیگم سے بات بھی کر لیں گے۔''

''پھر ہم چلیں.....'' کامران اٹھے تو فواد، بابر شاہ اور اظہر شاہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

''ایز یو لائیک.....لیکن کل شام تیار رہنا۔'' سب سے باری باری مصافحہ کرتے ہوئے انہوں نے کامران سے کہا تو سر ہلاتے ہوئے ان تینوں کے ہمراہ آفس سے باہر نکل آئے۔ بابر شاہ اس دوران کچھ نہیں بولے تھے لیکن سوچوں کا ایک طویل آسمان تھا جس پر ان کا

تخیل محو پرواز تھا۔

☆.....☆.....☆

آج کا دن اپنے جلو میں بہت سی ہلچل لیے آیا تھا۔ ستارہ بیگم کا جوش وخروش دیدنی تھا۔ شہر کے ایس پی صاحب آج اس کے دولت کدے کو رونق بخشنے آرہے تھے۔ صبح صبح انہوں نے فون کر کے اپنی آمد کا بتا دیا تھا اور ستارہ بیگم اچھی طرح جانتی تھی کہ ان اونچے لوگوں کو کس طرح مٹھی میں کیا جاتا ہے۔

''ارے گھنگھرو! جا ذرا نیلو کی طرف۔ سمجھا دیو اسے کہ آج کسی تماش بین نے نہیں آنا۔ کوئی مجرا نہیں ہو رہا۔'' ستارہ بیگم نے پاس سے گزرتے غلام عباس کو روک کر کہا تو وہ حیران سے ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

''بڑی بائی جی! یہ کیسے ہو سکتا ہے برسوں پرانا اصول ٹوٹ جائے گا۔ لوگ ہمارے کوٹھے کا رخ کرنا چھوڑ دینگے۔'' غلام عباس نے کہا۔

''ارے ہم نے یہ اس لیے کہا کہ کوئی عام تماش بین نہ آئے۔ آج خاص پروگرام ہے صرف خاص بندوں کے لیے سمجھا کیا۔'' ستارہ بیگم کا معنی خیز لہجہ ان کی سمجھ میں آ گیا۔

''ٹھیک ہے بائی جی میں جا کے کہے دیتا ہوں۔'' غلام عباس بیرونی سیڑھیوں کی طرف لپکے۔

نیلو کہنے کو تو اس بازار میں ایک پھولوں والی تھی لیکن کس کوٹھے پر کیا ہو رہا ہے..... کس طوائف کا کیا چکر ہے اور کون یہاں سے فرار ہونے کو پر تول رہی ہے، اسے سب خبر ہوتی تھی۔ اب بھی یہ خبر اس نے منٹوں میں سارے بازار میں پھیلا دینی تھی اور نتیجہ ستارہ بیگم کی مرضی کے مطابق ہی نکلنا تھا۔ سو اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد اس نے چندن کو بلا کر کوٹھے کی صفائی، ستھرائی، تزئین و ترتیب اس کے ذمے لگائی۔ سجنو اس کوٹھے کا پرانا سا ہوکار تھا۔ خاص شربت کی ساری سپلائی وہی کیا کرتا تھا۔ ستارہ بیگم نے اسے بھی فون کر دیا۔ آج کی شام وہ کسی طور بھی ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ سو اپنی طرف سے کیل کانٹوں سے لیس ہو کر میدان میں اترنے کی تیاری کر رہی تھی۔ چاندنی کے کمرے میں آ کر ایک پل کو رک کر اس نے ادھر ادھر کا جائزہ لیا۔

''چاندنی! تیرے کو کیا ہے ری..... کیوں منہ سر لپیٹے پڑی ہے؟'' چاندنی کو بستر پر دراز دیکھ کر وہ بولی لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''شام میں ایس پی صاحب آرہے ہیں چند خاص مہمانوں کے ساتھ۔ محفل میں کسی چیز کی کمی نہیں ہونی چاہئے..... بستر چھوڑ اور تیاری کر..... چل اٹھ شاباش۔''

''بائی جی! آج میں محفل نہیں کر سکونگی..... دو تین دن سے مجھے شدید بخار ہو رہا ہے۔'' چاندنی نے اسے ٹالنا چاہا۔

''نہ چاندنی! ایسا نہ کر.....'' اس نے کہا اور پھر کچھ سوچتے ہوئے دوبارہ بولی۔ ''چل ٹھیک ہے زیادہ نہیں پر ایک گیت تو تجھے گانا

پڑے گا۔ ایس پی مٹھی میں آ گیا تو سمجھ لاہور پر راج ہو جائے گا ہمارا۔ دوسرے کوٹھوں والے جلیں گے۔'' ستارہ بیگم خلا میں نظریں جماتے ہوئے بولی۔

''اچھا.....'' چاندنی آزردہ لہجے میں بولی۔ ایک طویل عرصہ ہو چکا تھا اسے یونہی اپنی ممتا کا خون کرتے ہوئے..... ستارہ بیگم ماں نہیں تھی..... بہن نہیں تھی..... کسی کی بیٹی نہیں تھی..... بس ایک طوائف تھی۔ بھلا وہ ایک ماں کے جذبات واحساس کو کیا سمجھتی اور چاندنی کی مجبور ممتا ستارہ بیگم کی خواہشات کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی تھی۔ وہ چپ چاپ سب حکم مانتی رہی تھی صرف اس لیے کہ اس کا کوئی قدم اس کی معصوم بیٹی کے راستے میں کانٹے نہ بچھا دے لیکن شائد وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ اس کا ایسی جگہ پر قیام اس کی بیٹی کی زندگی کا ایک حصہ ہے وہ چاہنے کے باوجود بھی اس کی پہچان بن گئی تھی۔ اس کی جدائی کا زہر پیتے پیتے اس کی روح نیلی ہو گئی تھی لیکن ستارہ بیگم ایک چیل تھی اور آریان ایک ننھا سا چوزہ..... جب تک وہ کسی محفوظ جائے پناہ پر نہیں پہنچ پاتی اسے چین کیسے آ سکتا تھا۔ غلام عباس نے اس کی تسلی تو کر دی تھی لیکن پھر بھی وہ اپنی ممتا کے ہاتھوں مجبور تھی اور پچھلے دو چار دنوں سے بس اس کا ذہن سوچوں کی انہی بھول بھلیوں میں سفر کرتے کرتے تھک گیا تھا۔ وہ اس ماحول سے فرار چاہتی تھی۔ کسی ایسی جگہ چلی جانا چاہتی تھی جہاں اس کے ماتھے کا یہ سیاہ داغ لوگوں کی نظروں میں نہ آتا۔

ستارہ بیگم کمرے سے نکل گئی تو چاندنی بستر پر اٹھ بیٹھی۔ دائیں طرف دیوار میں لگے قد آدم آئینے میں اس نے اپنے مضمحل سراپے پر بھرپور نگاہ ڈالی، بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں اپنی چمک اور رعنائی تقریباً کھو چکی تھیں۔ سیاہ گھنیری زلفوں کے بیچ کہیں کہیں سفید چاندی کے تار دکھائی دے رہے تھے۔ حوادث زمانہ نے اس کی صبیح پیشانی پر چند ریکھائیں کھینچ ڈالی تھیں۔ وہ پھیکی سی ہنسی ہنس دی۔

''گویا میری سزا اب ختم ہونے والی ہے، چڑھتے سورج کے پجاریوں کو ڈھلتے ہوئے سورج کی پھیکی روشنی کہاں بھا سکتی ہے۔'' وہ دل میں خود سے مخاطب تھی۔ اس کی چمک ماند پڑ رہی تھی اور ستارہ بیگم کی جہاندیدہ نظروں نے بھانپ لیا تھا کہ یہ چراغ اب کم روشنی دے رہا ہے سو اس کا نعم البدل اس نے آریان میں تلاش کر لیا۔

''تمہاری سزا ختم نہیں ہوئی چاندنی بی بی بس اس کی نوعیت بدل گئی ہے۔'' چاندنی کے دماغ نے سرگوشی کی۔

''کیا مطلب؟'' وہ جیسے تڑپ اٹھی۔

''ہاں! اصل سزا تو اب شروع ہوئی ہے۔ تم بجھ رہی ہو اس لیے اب اس کوٹھے کے ایک سٹور میں تمہارے لیے تھوڑی سی جگہ بنائی جائے گی جہاں زندگی کے آخری ایام نوے فیصد طوائفوں کی طرح تم خون تھوکتے اور بیماریوں سے برسرِ پیکار ہو کر گزار دو گی..... لیکن چاندنی! تمہاری جگہ کون لے گا..... آریان..... آریان لے گی تمہاری جگہ..... اس کے پیروں میں گھنگھرو ہونگے اور زلفوں میں پھول۔ اب تمہاری جگہ وہ تماش بینوں کی ننگی نظروں کا سامنا کرے گی۔'' دماغ ایک حقیقت کا نشتر اس کی روح میں اتار رہا تھا اور وہ تڑپ رہی تھی۔

''نہیں! ایسا نہیں ہوگا..... میں..... میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔''

''پھر کیا کرو گی تم؟'' دماغ استہزائیہ انداز میں بولا۔

''کچھ بھی..... کچھ بھی کر گزروں گی لیکن، آریان کو یہاں سے بچاؤں گی.....'' چاندنی کرب میں ڈوبی آواز میں بڑبڑائی۔

''میں ستارہ بیگم کی ہر بات مانوں گی۔ بس اس سے التجا کروں گی کہ آریان کا پیچھا چھوڑ دے۔ وہ جہاں ہے اسے وہیں رہنے دے، اس کے بدلے میں، میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ وہ مصمم ارادہ کرتے ہوئے بستر سے اٹھی، گالوں پر پھسل آنے والے بے بس آنسو بے دردی سے ہتھیلی سے رگڑ ڈالے۔ آئینے سے حرف نظر کرتی وہ کپڑوں کی الماری کی طرف بڑھی، شام کو محفل تھی نا اور اسے آنے والے خاص مہمانوں کا خاص انداز سے سواگت کرنا تھی۔ اپنے مرجھائے ہوئے پھولوں جیسے گالوں کو غازے سے تروتازہ کرنا تھا۔ اپنے سراپے کو قیامت خیز بنانا تھا، اسے بھولنا تھا کہ وہ ایک ماں ہے۔ بس وہ ایک طوائف ہے اور طوائف کبھی ماں، بہن، بیٹی نہیں ہوتی۔

سورج ڈھل چکا تھا۔ اردگرد کے کوٹھوں پر آبادی ہونے لگی تھی۔ گھنگھروؤں اور طبلے کی صدائیں ہوا کے دوش پر چکرانے لگی تھیں لیکن خلاف معمول ستارہ بیگم کا کوٹھا آج خاموشیوں کی زد میں تھا۔ اردگرد والے آج بڑے خوش تھے کہ ستارہ بیگم کے کوٹھے کی ویرانی ان کے کوٹھوں پر رونق بڑھانے کا باعث بن گئی تھی۔ خوش تو ستارہ بیگم بھی تھی لیکن اس کی خوشی کی وجہ کچھ اور تھی۔ سارا کوٹھا آئینے کی طرح چمک رہا تھا، ہال کمرے میں سرخ قالین بچھے ہوئے تھے اور چاروں طرف دیواروں کے ساتھ ساتھ گدے بچھا کر گاؤ تکیے لگائے گئے تھے۔

ہال کے وسط میں چھت پر لگے فانوس کی روشنی نے عجیب سا جادوئی تاثر بنا دیا تھا۔ آنے والے مہمانوں کی دلبستگی کا ہر طرح سے سامان کر رکھا تھا ستارہ بیگم نے..... چاندنی آج ایک طویل عرصے بعد تیار ہوئی تھی۔ سفید کمخواب کے غرارے پر سرخ قمیض پہنے بڑا سا سرخ اور سفید کنٹراسٹ کا دوپٹہ اوڑھے لمبے بالوں کی چٹیا میں موتیے کے پھول گوندھے ہوئے اور ہاتھوں، کانوں اور گلے میں پھولوں کے گہنے پہنے ہوئے وہ کوئی اپسرا لگ رہی تھی۔ ستارہ بیگم نے بڑھ کر اس کی بلائیں لیں اور بولیں۔ ''ے چاندنی تو تو اب بھی قیامت ہے ری..... تیرے کو کتنا سمجھایا۔ آجا ہماری لائن پر۔ ارے لگ جاتی نا دھندے سے تو دولت تیرے گھر کی باندی ہوتی، پر تو تو سدا کی جھلی رہی اے۔ اب رانی بٹیا کو سمجھا دے ہوں پر او، تیری بھی استاد ہے ری۔ کوئی بات نہیں۔ غلام عباس جا کر لے آوے گا اسے۔ ہم خود سمجھا لیویں گے۔'' ستارہ بیگم اپنی بات مکمل کر کے آگے بڑھ گئی اور چاندنی جیسے پتھر کے مجسمے کی طرح وہیں گڑی کی گڑی رہ گئی۔

''یہ نظریں..... یہ آدم خور نظریں کھا جائیں گی اسے..... میری بیٹی کو کھا جائیں گے یہ سب لوگ مل کر..... یہ اسے جینے نہیں دینگے۔'' وہ سکتے کی سی کیفیت میں کھڑی تھی لیکن وجود کے اندر جیسے زلزلے برپا تھے۔ وہ مردہ قدموں سے چلتی واپس اپنے کمرے میں لوٹ آئی، اس کی روح کسی پتے کی طرح لرز اٹھی تھی۔

میرے مولا! میری سزا معاف کر دے..... میرے پالنے والے تو جانتا ہے ایک چھوٹی سی خطا کی تھی لوگ تو کتنے بڑے بڑے گناہ کر کے بھی تیری زمین پر گردن اکڑا کر چلتے ہیں۔ ارے میں تو جیتے جی مرتی رہی ہوں۔ پچھتاووں کی آگ میں جل جل کر خاکستر ہوتی رہی ہوں۔ کب تک سزا دے گا مجھے..... کب تک خزاؤں کی زد میں رہے گا میرا وجود..... اے رحیم و کریم! ایک ہی بار موت کیوں نہیں دے دیتا مجھے۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے۔ پتہ نہیں کتنا رو چکی تھی وہ کہ آنکھوں کے سوتے بھی خشک ہو گئے تھے مگر شائد اس کے

آنسو بھی اس کی طرح بے قیمت تھے۔ اوپر والے کو ان آنسوؤں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ بستر پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی۔ سر جھکائے کسی گہری سوچ میں گم..... جب ستارہ بیگم نے دروازہ سے اندر جھانکا۔

''چاندنی! مہمان آنے والے ہیں..... تیار رہنا۔'' اس نے جواب میں نہ سر اٹھایا تھا اور نہ ہی کوئی بات کی تھی۔ ستارہ بیگم بھی اس کے جواب کا انتظار کرنے کی بجائے اپنی بات کر کے ہال کمرے کی طرف جانے لگی۔ اسی پل بیرونی جانب سے غلام عباس آتا دکھائی دیا۔

''مہمان آ گئے بڑی بائی جی۔'' اس نے آ کر بتایا۔

ستارہ بیگم پر جوش انداز میں تیزی سے دروازے تک آئی۔ ایس پی صاحب کے ہمراہ چار افراد اور بھی تھے۔ ستارہ بیگم نے ان کے اندر داخل ہوتے ہی ہاتھ میں پکڑے پھول ان کے قدموں میں رکھ دیئے۔

☆.....☆.....☆

زندگی بھی بعض اوقات کیسے کیسے رنگ دکھاتی ہے۔ جس گھر کی دہلیز پر پاؤں رکھنے پر اسے دھکے اور ٹھوکریں ملی تھیں، جہاں کے در و دیوار نے اس کی تضحیک کی تھی، جن رشتوں نے اس کی ذات کو اس کا جرم قرار دے کر تسلیم نہیں کیا تھا آج وہ ان سب کے درمیان تھا۔ ان کے قریب اتنا کہ ہر رشتے سے منسلک شخص کا قرب اسے میسر آ گیا تھا یہاں تک کہ اماں بی کی پیاسی نگاہوں میں بھی اس نے اپنے لیے ایک محبت بھرا سوز پایا تھا۔ ان سب کی توجہ اور محبتیں پا کر یقیناً وہ خود پر نازاں ہوتا لیکن اب وہ خود کو مجرم سمجھ رہا تھا۔ آج بہت دنوں بعد اسے تنہائی میسر آئی تو پنڈورا کا پٹارہ اس کے سامنے کھل گیا۔ وہ تنہائی کی وحشت سے گھبرا کر خود میں ہی پناہ ڈھونڈنے لگا۔

''وہ جو میری خاطر اس عالیشان گھرانے کی عزت قدموں تلے روند کر میرے ساتھ ہمسفری کے خواب دیکھتے ہوئے دہلیز پار گئی۔ میں نے کیا کیا اس کے لیے..... کانٹے ہی کانٹے بچھا دیئے اس کی راہوں میں۔ اپنی محبت میں اندھا ہو کر میں نے اس پر بھی زندگی تنگ کر دی۔ خدا جانے کہاں ہوگی وہ..... کس حال میں ہوگی؟ اس کی کوکھ میں پلنے والی میری نشانی اس دنیا میں سانس بھی لے پائی ہوگی یا.....'' پہلی بار ان سوچوں نے اس کے وجود روح کو جھنجھوڑ ڈالا۔

یہ سب بچے جو میرے اردگرد اپنی محبتوں کا حصار کیے ہوئے ہیں جانتے ہیں کہ میں ان کے لیے غیر نہیں۔ ان کا اپنا ہوں۔ ایک ایسا رشتہ میرے وجود سے وابستہ ہے جس سے برسوں اس گھر کے مکینوں نے نظریں چرائی ہیں۔ یہ بچے میرے وجود میں اسی رشتے کی آسودگی ڈھونڈتے ہیں اور میں..... میں ان سب کی محبتوں کے آگے ہارنے لگتا ہوں۔ زندگی کے روز و شب میرے لیے محض اذیت کے سوا کچھ نہیں۔ محبتیں بچپن سے میرے لیے بس ایک حسین خواب رہی ہیں شاید یہ بچے جانتے ہیں کہ میں ہر زنجیر توڑ سکتا ہوں لیکن محبت کی زنجیر نہیں توڑ سکتا۔ تبھی تو میرے پیروں میں محبتوں کی بیڑیاں ڈال دی ہیں انہوں نے..... لیکن نہیں..... مجھے ان زنجیروں کو توڑنا ہوگا اس لیے نہیں کہ ان سب کو دکھ پہنچاؤں اس لیے کہ ان سب کو ان کے ایک گمشدہ حصے سے ملانے کے لیے..... مجھے یہاں سے جانا ہوگا، میں اسے تلاش کروں گا.....''

وہ خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑا رہا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ اس وقت سادات نگر کے ہر مکین کی نگاہیں اسی پر جمی ہیں۔ ہر ایک کی سوچ کا محور اس وقت اسی کی ذات ہے۔ وہ سب اس کی ذات سے ایک امید وابستہ کیے ہوئے ہیں۔ مسرت جہاں، اس گھر کا روشن چراغ جو ایک طویل عرصہ پہلے فرجاد ملک کے خانہ دل میں ضیاء بکھیرنے کی چاہ لیے سادات نگر کی دیواروں کو اندھیروں کے حوالے کر گیا تھا۔ وہی مسرت جہاں جو ماں باپ کی آنکھوں کا تارہ تھیں، جو بھائیوں کی جان تھیں، وہی مسرت جہاں جنہوں نے محض چند دن اپنے پیار کرنے والوں کا دوسرا روپ دیکھ کر دلبرداشتہ ہو کر ایک انتہائی قدم اٹھایا تھا اور ان کے اس قدم نے شبیر حسین شاہ کی جان لے لی تھی۔ وہی مسرت جہاں آج بھی ایک کسک بن کر سادات نگر کے مکینوں کے دلوں میں آباد تھیں۔ اور فرجاد ملک وہ واحد شخص تھا جو ان سب کو ان کے بارے میں بتا سکتا تھا لیکن یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ بھی ویسا ہی بے خبر اور لاعلم ہے جیسے وہ سب۔

سبھی کو اس کے صحیح ہونے کی جلدی تھی اور وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ جب یہ سب جان لیں گے کہ وہ ٹھیک ہو چکا ہے تو ان سب کا پہلا سوال مسرت جہاں کے بارے میں ہی ہوگا اس کے دماغ میں سوچیں کسی لاوے کی طرح پک رہی تھیں۔

اس سے پہلے کہ سب جان جائیں کہ میری ذہنی کیفیت اعتدال پر آ چکی ہے۔ مجھے یہاں سے جانا ہوگا..... جتنی محبتیں سمیٹنی تھیں سمیٹ لیں۔ جتنی رفاقت میسر آنی تھی آ چکی۔ مجھ جیسے حرماں نصیب کے لیے یہ تھوڑا بھی بہت زیادہ ہے۔ میری منزل سادات نگر نہیں، مسرت جہاں کا حصول ہے، اسے پا کر، ان سب سے ملا کر ہی میں اپنی اور سب کی نظروں میں سرخرو ہو سکوں گا۔ جانے اتنے طویل عرصے خود فراموشی کی کیفیت میں، میری مسرت جہاں پر کیا بیتی ہوگی۔ وہ مجھے فریبی، دھوکے باز سمجھتی ہوگی۔ شاید اس نے یہ بھی سوچا ہو کہ میں کوئی آوارہ، بدقماش شخص ہوں جو محض چند دن اس کے ساتھ رنگین لمحات گزار کر اپنے راستے ہو لیا۔ اس کی معصوم آنکھوں میں اپنی ہمراہی کے خواب سجا کر بیچ راستے میں چھوڑ گیا لیکن وہ ملے گی تو اسے سب کچھ بتاؤں گا..... اکیس سال خوابیدہ ذہن کے ساتھ گزارے ہیں میں نے۔ میں نے جان بوجھ کر اسے نہیں چھوڑا جس کی محبت پانے کے لیے میں تڑپا رہا تھا اسے جان بوجھ کر کیسے چھوڑ سکتا تھا۔'' وہ جیسے خود کو تسلی دے رہا تھا۔

''میں یہاں سے چلا جاؤں گا تو ان سب کی سوالیہ نگاہیں بھی دکھائی نہیں دیں گی۔ بس ایک دو دن..... پھر میں چپ چاپ یہاں سے چلا جاؤں گا بالکل اسی طرح جیسے اکیس سال پہلے مسرت جہاں چپ چاپ یہاں سے چلی گئی تھی۔''

اس نے دل ہی دل میں پختہ ارادہ کر لیا۔ صرف دو دن بعد یہاں سے جانے کا فیصلہ کر چکا تھا کہ اس نے سوچ لیا تھا کہ اب وہ یہاں صرف اسی صورت میں آئے گا جب اس کے ہمراہ مسرت جہاں ہوں گی اور اگر ایسا نہ ہو سکا تو وہ اس دنیا کی بھیڑ میں ایسے کھو جائے گا کہ پھر خود کو بھی تلاش نہ کر سکے۔

☆.....☆.....☆

سبک ہوا کے نرم لمس سے جھومتے درخت اور پودے، آسمان پر پھیلا بادلوں کا رتھ اور دور غروب ہوتے ہوئے سورج کی نارنجی کرنیں جنہوں نے بادلوں کو بھی شفق کی سرخی عطا کر دی تھی۔ سبھی کچھ زندہ تھا، جاندار اور خوبصورت لیکن وہ سب اس وقت ان چیزوں کے حسن سے بالکل بے نیاز تھے۔ سادات نگر کا لان اس وقت وہاں کے مکینوں سے آباد تھا۔ بچے بھی، بڑے بھی سبھی موجود تھے۔ سوائے انیقہ کے جو چائے بنانے کے خیال سے اٹھ گئی تھی۔ سادات نگر کے مکینوں میں یہ خوبی ضرور تھی کہ پریشانی کے وقت سب ایک دوسرے کا آسرا سہارا بن جاتے تھے۔ اس سے پریشانی ختم تو نہیں ہوتی لیکن اس کی سنگینی بہت کم ہو جاتی ہے۔ اس وقت بھی سب ہی پریشان تھے لیکن اپنی دانست میں ایک دوسرے کی پریشانی دور کرنے کو مل بیٹھے تھے۔

''شینا بچی! یہ عارب کل سے دکھائی نہیں دیا۔ کیا کہیں گیا ہوا ہے؟'' بڑی اماں نے شینا پھپھو سے پوچھا جو ان کے دائیں طرف لان چیئر پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ بڑی اماں کے پوچھنے پر انہوں نے ان کی طرف دیکھا تو وہ خاموش سی ہو کر ان کو دیکھنے لگیں۔ ایک طویل عرصہ ہو چکا تھا انہیں ان خاموش نگاہوں کو پڑھتے اور ان کی بے بسی کا مفہوم سمجھتے ہوئے۔

''جی اماں بی! وہ گھر پر نہیں ہیں۔ دو تین دنوں سے بہت عجیب رویے سے پیش آ رہے تھے۔ کل ایک دو دوست آ گئے تو ان کے ساتھ کہیں چلے گئے ہیں کہہ رہے تھے چند دن لگ جائیں گے۔'' شینا پھپھو کے لہجہ میں محسوس کی جانے والی آزردگی نے بڑی اماں کا دل دکھا دیا۔

''پتہ نہیں بچی! یہ ایسا کیوں ہے۔ ارے تو تو میری سب سے پیاری بیٹی ہے پر تیری اچھائیاں اس کور بین کو کیوں نہیں نظر آتیں۔''

''اماں بی! آپ کیوں دل پر لگاتی ہیں۔ اب تو عرصہ ہو گیا عادت سی پڑ گئی ہے۔'' شینا پھپھو زخمی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر بولیں۔

''یہ خبر نہیں سادات نگر کی خوشیاں کہاں کھو گئیں۔ سکھ اور شانتی جیسے ہم سے منہ ہی موڑ گئی ہے، اب تو ہواؤں کی تیزی سے بھی خوف آتا ہے۔ کل سے میرے بچے سفر پر نکلے ہوئے ہیں۔ دل بہت پریشان ہے۔ اللہ ان کی حفاظت کرے۔ اپنی امان میں رکھے۔'' بڑی اماں کے لہجے میں اندیشے گھلے ہوئے تھے۔

''اماں بی! وہ ایک نیک مقصد کو لیکر گھر سے نکلے ہیں۔ اللہ ان کی حفاظت کرنے والا ہے۔ بس مجھے طاہر کے پاپا کی طرف سے خدشہ ہے غصے کے تیز ہیں کہیں کچھ کر نہ بیٹھیں۔'' فیضی چچی سرسراتے لہجہ میں بولیں۔

''یہ بات تو ہے۔ چاچو کا غصہ تو اللہ معاف کرے..... خلاف توقع بات پر کتنی بری طرح بھڑک اٹھتے ہیں وہ۔'' شاذان نے مزید دہشت گری ایٹ کرنے کی کوشش کی۔

''اگر ایسی بات ہے تو اظہر بھائی کو جانا ہی نہیں چاہئے تھا۔ غصے پر کنٹرول نہ کر سکے تو بہت برا بھی ہو سکتا ہے۔'' حدیقہ چچی نے بھی اپنی سیٹ سنبھال لی۔ اتنی دیر میں انیقہ بھی چائے لیکر آ گئی تھی۔ سب کو چائے سرو کر کے اپنا کپ ہاتھ میں لیے وہ آریان کے قریب پہنچے گھاس پر براجمان ہو گئی۔

''کیا بحث چل رہی ہے۔'' آریان کے کان کے پاس منہ لے جا کر اس نے سرگوشی میں پوچھا۔

''بابر انکل اور اظہر انکل کی باتیں ہو رہی ہیں۔'' آریان نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

''بڑی اماں اگر جو اظہر چچا نے وہاں کوئی ہنگامہ کر دیا پھر.....'' شاذان بولا۔

''آئے ہائے خیر کے کلمات منہ سے نکالو بچے.....اتنے برے لوگوں کے بیچ جا کے پھنسے ہوئے ہیں۔ اللہ نہ کرے جو کوئی فساد کھڑا ہو۔ اظہر کو جانا ہی نہیں چاہئے تھا۔''

''اماں بی! آپ کیوں ہلکان ہوئی جا رہی ہیں۔ اظہر بچہ تو نہیں۔ سمجھدار، ذمہ دار آدمی ہے' معاملہ فہم ہے۔ کیا حالات کی نزاکت کا علم نہیں اسے۔ اس کا اٹھایا ہوا کوئی بھی الٹا قدم آریان اور اس کی مظلوم ماں کے لیے کوئی مصیبت بھی لا سکتا ہے۔''

شینا پھپھو نے بھی اماں کی پریشانی رفع کرنے کی کوشش کی۔

''ارے بچی معاملہ فہمی اپنی جگہ پر جب وہ کسی بات پر اڑ جاتا ہے تو پھر ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ ضد میں بالکل اپنے مرحوم باپ پر پڑا ہے۔ خدانخواستہ وہاں کوئی بات مرضی کے خلاف ہو گئی تو فساد کھڑا کر دے گا۔ ارے میرے تو دل کو ہول اٹھنے لگے ہیں.....خدا خیر کرے۔'' بڑی اماں حقیقتاً انتہائی پریشان ہو گئی تھیں۔

''اماں بی! حوصلہ کریں، اللہ سے دعا مانگیں کہ وہ ہماری مدد کرے۔ آریان اور اس کی امی ظالموں کے چنگل سے نکل آئیں۔'' زاہدہ چچی بڑی اماں کا ہاتھ تھام کر نرمی سے بولیں۔

''ہاں بابر بتا رہا تھا کہ وہ لوگ بہت برے ہیں۔ وہ اتنی آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ہم پوری کوشش کریں گے لیکن ممکن ہے آریان کی ماں کو وہ لوگ نہ آنے دیں۔ ارے بچی میں نے تو اسی لیے اس سے کہا تھا کہ اکیلا نہ جا۔ ساتھ اظہر، شاکر میں سے کسی کو لے جا۔ اتنے خطرناک لوگوں کے تو سائے سے بھی بچنا چاہئے۔'' بڑی اماں بولیں لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھیں کہ ان کے ان چند جملوں نے آریان پر کیا اثر کیا تھا۔ وہ تو کل سے پریشان تھی ہی لیکن امید کی ایک ننھی سی کرن نے مایوسی کے اندھیروں کو گدرایا ہوا تھا اور اب بڑی اماں کی بات نے امید کی اس ننھی سی کرن کا بھی گلا گھونٹ دیا، اس کی پلکیں نم ہونے لگیں۔

''ماں! ساری زندگی یونہی گھسٹتے رہنا ہے تمہیں بھی اور مجھے بھی کوئی نہیں جو ہمیں بچا سکے۔ ہمیں جینے کا حق دلا سکے۔'' آنسو پلکوں کی منڈیروں سے چھلکنے کو تھے وہ یک دم اٹھ کر اندر چلی گئی۔

''اسے کیا ہوا.....؟'' حدیقہ چچی نے بھنوئیں اچکا کر عجیب ناگوار لہجے میں کہا۔

''بچی ہے۔ پریشان ہے اپنی ماں کے لیے شائد میری کوئی بات اچھی نہیں لگی۔'' بڑی اماں دھیمے لہجے میں بولیں۔

''آپ نے ایسا کیا کہہ دیا۔'' وہ ہٹ دھرمی سے بولیں۔

''حدیقہ بچی! ضروری نہیں کہ کسی کو طعنوں کے تیروں سے ہی زخمی کیا جائے۔ بعض اوقات بگڑے ہوئے زخموں پر نرم روئی کا

پھوہا بھی چبھتا ہے۔ میں آریان کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ بڑی صبر اور برداشت والی بچی ہے۔ میرے لفظ اس کو ناگوار نہیں گزرے ہوں گے ہاں کوئی بات اس کے دل کو لگی ہوگی۔ انیقہ، روبیہ بچی تم دونوں اس کے پاس جاؤ۔ اس کی دلجوئی کرنے کی کوشش کرو۔'' بڑی اماں کسی ماہر نبض شناس کی طرح نہایت مہارت سے آریان کے رویے کی جانچ کرتے ہوئے بولیں۔ انیقہ اور روبیہ اٹھ گئیں۔

''خیال کرنا بیٹا! کوئی دکھ دینے والی بات نہ منہ سے نکالنا۔ تمہارے مضبوط لہجے اس کی ہمت بڑھائیں گے۔''

''جی بڑی اماں!'' وہ سر ہلاتے ہوئے اندر کی جانب بڑھ گئیں۔ فیضی چچی بھی اٹھ کھڑی ہوئیں

''تم کہاں چل دیں فیضی۔'' بڑی اماں نے ان سے استفسار کیا۔

''اماں بی دل بہت پریشان ہے، ان کی طرف سے جی گھبرا رہا ہے، ان کی خیریت اور کامیابی کے لیے اللہ کے حضور دعا کروں گی۔'' وہ بات مکمل کر کے اپنے پورشن کی طرف بڑھ گئیں۔ شینا پھپھو پہلے ہی عصر کی نماز کے لیے اٹھ کر جا چکی تھیں۔

''میرا خیال ہے مجھے بھی چلنا چاہیے۔'' حدیقہ چچی بھی اٹھ کھڑی ہوئیں غالباً ماحول میں اب ان کی دلچسپی کی کوئی چیز باقی نہیں رہی تھی اور آج انہوں نے خلاف توقع طنز اور تشنیع بھی کم ہی کیا تھا۔ ان کے چلے جانے کے بعد اماں بی وہاں اکیلی رہ گئی تھیں، ان کی پرسوچ نگاہیں خلا میں جمی ہوئی تھیں اور ہاتھوں کی انگلیاں تیزی سے تسبیح کے دانوں پر متحرک تھیں۔

انیقہ اور روبیہ جب کمرے میں داخل ہوئیں تو منظر حسب توقع تھا۔ آریان بیڈ کے ایک طرف سکڑی سمٹی سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی، ہلکی ہلکی لرزش اس کے وجود پر طاری تھی جس سے انہیں اندازہ ہو گیا کہ وہ رو رہی ہے۔ وہ دونوں تیزی سے آگے بڑھیں روبیہ اس کے قریب بیڈ پر بیٹھ گئی جبکہ انیقہ نیچے بیٹھ گئی۔ اس کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر وہ تھوڑا آگے کو جھکی۔ آریان کے بھیگے گالوں کو دیکھا اور پیچھے ہو گئی۔

''رینی آپی! موسم بہت خوشگوار سہی لیکن آج برسات دیکھنے کو دل نہیں چاہ رہا۔'' انیقہ کا اشارہ اس کے آنسوؤں کی طرف تھا لیکن وہ خاموش رہی کچھ نہ بولی۔

''اینی ہم ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں نا..... ہم دوست ہیں نا۔'' روبیہ اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر بولی۔ جواب میں آریان شدت گریہ کے باعث بول تو نہ سکی لیکن اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تو پھر اپنے ان قیمتی آنسوؤں کو ضائع مت کرو..... مجھے بتاؤ کس بات نے تمہیں اتنی تکلیف دی۔ کیا بڑی اماں کی بات سے.....'' روبیہ نے بات ادھوری چھوڑ کر آریان کی طرف دیکھا۔

''نن..... نہیں..... انہوں نے تو ایسا کچھ نہیں کہا۔'' آریان نے تردید کی۔ روبیہ اور انیقہ کے آجانے سے جیسے اسے کچھ حوصلہ ملا تھا لیکن اس کی آنکھیں ہنوز بھیگی ہوئی تھیں۔

''پھر..... پھر بتاؤ تو سہی اینی شاید تم نہیں جانتیں کہ تمہارا اس طرح رونا ہمیں کتنی اذیت دے رہا ہے۔'' روبیہ انتہائی سنجیدگی سے بولی۔ آریان نے اس کی طرف دیکھا۔

''روبی! مجھے کسی کی بات نے دکھ نہیں دیا۔ پتھروں کے بیچ محبوس تھی میں، پھولوں کا لمس پا کر بہت نازک ہوگئی ہوں شائد اسی لیے آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ روبی! میری ماں..... میری ماں کس قدر عظیم ہے اور کتنی دکھی بھی..... میں نہیں بتا سکتی، لوگوں کی نظروں میں وہ طوائف ہے لیکن کوئی میرے دل سے پوچھے کہ اس کا تقدس اس کی روح کی پاکیزگی کیسی ہے۔ روبی وہ محبت کے قابل ہے لیکن اسے ٹھوکریں مل رہی ہیں، اذیتیں اس کا مقدر ہیں۔ پتہ نہیں فواد، بابر انکل اسے ان ٹھوکروں سے بچا بھی سکیں گے یا.....'' آریان ایک بار پھر سسک اٹھی۔

''اینی! میں اتنا جانتی ہوں کہ وہ تمہاری ماں ہیں تو ہمارے لیے انتہائی قابل احترام، تمہیں ان کے تقدس کا ثبوت دینے کی ضرورت نہیں۔ جس ماں نے تمہارے حصے کا بھی کرب جھیلا وہ کوئی بری عورت نہیں ہوسکتی اور پروردگار پر یقین رکھو برائی کبھی بھی نیکی کی راہ نہیں روک سکتی۔'' روبیہ اسے تسلی دیتے ہوئے بولی۔

''اور اینی آپی! یہ جو ہمارے بابر چچا ہیں نا..... یہ اول تو کسی کام میں ہاتھ نہیں ڈالتے اور اگر ذمہ لے لیں تو پھر جب تک اس کام کو انجام تک نہ پہنچائیں سکون کا سانس نہیں لیتے اور خیر سے ہمارے ضدی بھیا بھی کچھ ایسے ہی ہیں۔ اس لیے ہر فکر و پریشانی چھوڑ دیں۔ بس دعا کریں کہ اللہ میاں یہ مشکل ہم سب پر آسان کردے۔'' انیقہ ہلکے پھلکے انداز میں بولی۔

''ہاں اینی! اس وقت گھر کا ہر فرد اپنی اپنی جگہ دعا گو ہے۔ سب پروردگار سے خیریت اور کامیابی کے لیے دعا گو ہیں۔ تم بھی دعا کرو انشاء اللہ آنے والے دن اذیتوں سے رہائی کے دن ہوں گے۔ خوشیاں تمہارے حصے میں بھی آئیں گی اور وہ عورت جو تمہاری ماں ہے اور ایک عمر سے کرب کے زندان میں مقید ہے اس کو بھی آزادی ملے گی۔ جب رات بہت تاریک ہوجائے نا تو سمجھ لینا چاہئے کہ اس کے پہلو سے روشنی طلوع ہونے والی ہے اور اب یہی روشنی تمہارا مقدر بننے والی ہے۔'' روبیہ کے لفظ آریان کے زخموں پر مرہم کا کام دے رہے تھے۔ اس کی آنکھوں کے کنارے خشک ہونے لگے۔ دل بھی کچھ پرسکون ہوگیا شائد رونے سے اندر کا سارا غبار نکل گیا تھا۔ دھڑکنیں دھل گئی تھیں اور سانسوں پر طاری بوجھ بھی ہلکا پڑ گیا تھا۔ اس نے روبیہ کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں تھام کر وفور عقیدت سے آنکھوں کو لگا لیا۔ سادات نگر کے مکینوں کی دعاؤں میں اس کی دعائیں بھی شامل ہوگئیں۔

☆.....☆.....☆

''فہدی! اب بس کرو چلو اب..... پہلے ہی کافی لیٹ ہوگئے ہیں ہم۔'' بابر شاہ نے گھڑی پر ایک نظر ڈال کر فواد کو مخاطب کیا جو آئینے کے سامنے کھڑے ٹائی کی ناٹ درست کر رہے تھے۔ اس وقت وہ اظہر شاہ، بابر شاہ اور ایس پی کامران ریسٹ ہاؤس کے ایک کمرے میں موجود تھے۔ مغرب کی اذان میں کچھ ہی وقت باقی تھا۔ وہ سب ایس پی خاور ملک کی طرف جانے کے لیے تیار تھے۔ فواد نے ناٹ ٹھیک کرنے کے بعد ہینڈ بیگ ہاتھ میں لیا اور وہ سب کمرے سے نکل آئے۔ اظہر شاہ اور بابر شاہ نے گاڑی کی پچھلی نشستیں سنبھال لیں۔ فواد فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئے جبکہ ایس پی کامران ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان ہوگئے، ابھی انہوں نے گاڑی اسٹارٹ نہیں کی تھی کہ

موبائل کی بیل بج اٹھی۔ایس پی کامران نے کوٹ کی جیب سے موبائل نکالا،آن کر کے کان سے لگایا،کال خاور ملک کی تھی۔

''یار کامران! کہاں رہ گئے ہو تم لوگ! میں کتنی دیر سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں.....وہ لوگ ہمارے منتظر ہونگے، میں انہیں فون کر کے اپنی آمد سے مطلع کر چکا ہوں۔''

''بس خاور بھائی! ہم نکلنے ہی والے تھے۔'' کامران نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے پھر جلدی پہنچو.....؟'' ایس پی خاور ملک نے ریسیور رکھ دیا۔کامران نے گاڑی اسٹارٹ کی اور قدرے تیز رفتاری سے بیک کرتے ہوئے گیٹ سے باہر نکال لے گئے۔معروف شاہراہوں پر مناسب حد تک تیز رفتار ڈرائیونگ کرتے ہوئے تقریباً دس منٹ میں وہ ایک عالیشان بنگلے کے سامنے موجود تھے۔بہت بڑے آہنی گیٹ کے سامنے بیٹھا ہوا گن بردار چوکیدار انہیں گاڑی روکتے دیکھ کر چوکس ہو گیا تھا۔کامران نے گاڑی بالکل اس کے قریب روکی۔

''صاحب کو بلاؤ.....'' کامران نے بغیر کسی تمہید کے حکمیہ لہجے میں کہا۔

''آپ کون ہیں؟'' چوکیدار گہری نظروں سے ان چاروں کو دیکھنے لگا۔

''اپنے صاحب سے کہو کہ کامران صاحب آئے ہیں۔'' کامران قدرے کرخت لہجے میں بولے تو چوکیدار کچھ مرعوب سا ہو کر پلٹا۔اسی پل آہنی گیٹ کے قریب لگا بغلی دروازہ کھلا اور اس میں سے ایس پی خاور ملک برآمد ہوئے غالباً انہوں نے گاڑی رکنے کی آواز سن لی تھی۔وہ بھی بالکل تیار تھے البتہ کوٹ پہننے کی بجائے ایک بازو پر ڈال رکھا تھا۔پچھلی سائیڈ کا دروازہ کھول کر وہ اظہر شاہ کے ساتھ بیٹھ گئے اور دروازہ بند کر دیا۔

''ہم اس وقت ایک گھنٹہ لیٹ ہو چکے ہیں کامی۔'' ایس پی خاور ملک نے کامران کو مخاطب کیا جنہوں نے ان کے بیٹھتے ہی گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔

''تو کیا آپ نے ان کے ساتھ ٹائم فکس کر رکھا تھا؟''

''ہاں میں نے فون پر ان سے وقت لے لیا تھا اور وہاں سبھی ہمارے منتظر ہوں گے۔''

''کیا مطلب؟ ہم کیا وہاں تماش بین بن کر جا رہے ہیں۔'' اظہر شاہ تنک کر بولے۔

''ارے صاحب! ہمارا وہاں جانے کا مقصد کیا ہے یہ تو صرف ہم جانتے ہیں نا۔وہ تو یہی جانتے ہیں کہ شہر کا ایس پی آج ان کے کوٹھے پر جا رہا ہے۔'' ایس پی خاور ملک نے مسکراتے ہوئے کہا۔گاڑی اس وقت نسبتاً پرسکون ایریا سے گزر رہی تھی۔کامران مشتاقی سے ڈرائیونگ کر رہے تھے۔

''کامی! تمہارے نزدیک اس مسئلے کو کس طرح ہینڈل کیا جائے، تم نے اس پر کوئی ہوم ورک کیا؟''

''کیا مطلب خاور بھائی؟ میں سمجھا نہیں۔''

''بھئی یہاں تک تو معاملات اور حالات کسی حد تک درست رہے ہیں لیکن اب معاملہ صرف ہمارے درمیان نہیں رہے گا۔ اب دوسرا فریق بھی اس میں شامل ہو جائے گا اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ اب آگے کیا کرنا ہے کچھ اس بارے میں سوچا..... وہاں جا کر کیا کرنا ہے کیا کہنا ہے؟''

''ملک صاحب! کہنا کیا ہے جس مقصد کے لیے آئے ہیں اسے پورا کرنا ہے بس دو لفظی بات ہی تو کرنی ہے، ہم کونسا کسی مباحثے میں شرکت کرنے جا رہے ہیں۔'' اظہر شاہ مضبوط لہجے میں بولے۔

''شاہ جی! مقصد کے حصول کے لیے تگ و دو بھی تو کی جاتی ہے ہم جس کام کے لیے جا رہے ہیں وہ اتنا معمولی نہیں ہے جتنا آپ سمجھ رہے ہیں اور نہ ہی یہ دو لفظوں میں نمٹنے والی بات ہے۔'' خاور ملک معاملے کی گہرائی اور الجھاؤ کو بخوبی سمجھ رہے تھے۔

''اتنا غیر معمولی بھی نہیں ہے ملک صاحب! بھلا ہم چار پانچ مرد مل کر ایک عورت کو نہ ہینڈل کر سکیں گے۔''

''شاہ جی! آپ شائد اس قسم کی عورتوں کے بارے میں معلومات نہیں رکھتے، وہ کوئی مجبور و بے بس، حالات کی چکی میں پسنے والی مظلوم عورت نہیں' بازار حسن کی سب سے مشہور نائکہ ہے۔ بڑے بڑے بیوروکریٹس اس کی ایک جنبش ابرو پر کچھ بھی کر گزرنے کو تیار ہو جائیں۔'' خاور ملک بولے۔

''لیکن اس کی پہنچ سے ڈر کر ہم پیچھے تو نہیں ہٹ سکتے..... گھی اگر سیدھی انگلیوں سے نہ نکلا تو انگلیاں ٹیڑھی بھی کی جا سکتی ہیں۔''

''اظہر صاحب! جوش سے نہیں ہوش سے کام لیں۔ آپ کوئی نوجوان یا غیر ذمہ دار شخص تو نہیں کہ معاملے کی سنگینی اور نزاکت کو نہ سمجھ سکیں۔ اس وقت گیند ستارہ بیگم کے کورٹ میں ہے سو ہمیں نہایت طریقے سے چلنا پڑے گا، ہمیں مسئلے کو حل کرنا ہے اس میں مزید پیچیدگیاں پیدا نہیں کرنیں۔''

''تو میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں کہ بجائے اس عورت سے ڈرنے کے اپنا مدعا اس کے سامنے بیان کر دینگے، سیدھی طرح مان گئی تو ٹھیک ورنہ پھر کوئی اور طریقہ استعمال کرنا پڑے گا۔''

''دیکھئے! ہم اس عورت سے ڈر نہیں رہے اور نہ ہی اپنا مدعا بیان کرنے کی ہمیں جلدی ہے۔ پہلے اسے رام کر کے اپنے ٹریک پر لانے کے بعد اصل مقصد پر آئیں گے تو ہمیں کامیابی حاصل ہوگی۔ آپ ایک کاروباری شخص ہیں یہی سمجھ لیں کہ ہم یہاں ایک ڈیل کرنے جا رہے ہیں۔ ایک ٹینڈر پاس کروانا ہے لیکن اس ٹینڈر کے اور بھی کئی امیدوار ہیں سب سے زیادہ ٹینڈر کا مالک دلچسپی لے رہا ہے۔ ایسی صورت میں ہمیں بہت سوچ سمجھ کر چلنا ہے کہ ہر امیدوار کو کک آؤٹ کر کے مالک اپنی دلچسپی کو پس پشت ڈال کر وہ ٹینڈر ہمارے حوالے کر دے۔ ایک بزنس مین سمجھ سکتا ہے کہ یہ کس قدر مشکل ڈیل ہے، ہم اسے نہ تو مجبور کر سکتے ہیں اور نہ ہی طاقت کے زور پر اپنی بات منوا سکتے ہیں پھر یہی ہے کہ معاملہ کمیونی کیشن کے ذریعے حل ہو اور اگر اس سچویشن میں آپ کچھ سخت کہیں گے تو معاملہ الٹ بھی ہو سکتا ہے۔'' خاور ملک نے انہیں رسانیت سے سمجھایا۔

''مجھے سمجھ نہیں آرہی ملک صاحب! کہ سیدھا صاف راستہ ہے پھر ہمیں پیچیدہ بل کھائے ہوئے راستے پر چلنے کی کیا ضرورت ہے۔''

''یہی تو بات ہے نا! شاہ جی کہ یہاں پیچیدہ راستے میں ہمارے لیے نسبتاً کم دشواریاں ہیں۔''

''ملک صاحب! کیا اس سلسلے میں آپ کے اختیارات بھی کچھ نہیں کر سکتے۔ بالفرض محال اگر ہمیں قانون کا راستہ اختیار کرنا پڑے تو کیا تب بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

''قانون..... کونسے قانون کی بات کر رہے ہیں، اظہر صاحب؟ ہم جیسے بظاہر بااختیار لوگ انہی اختیارات کی ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ مجبور..... ہم سے اسی قانون کی آڑ میں غیر قانونی کام لیے جاتے ہیں۔ ان اونچی کرسیوں پر بیٹھنے والوں نے قانون کو کھیل بنا رکھا ہے۔ ان کے ہاتھ میں ڈوریاں ہیں اور قانون کے اصول کٹھ پتلیاں۔ جیسے چاہیں نچا دیں۔ اور یہ ستارہ بیگم اور اس جیسی کئی بڑی نائیکائیں ہم سے زیادہ بااختیار ہوتی ہیں کہ قانون بنانے والے ان کے تلوے چاٹتے ہیں، ہم ان پر ہاتھ ڈال بھی دیں تو اگلے دن اوپر سے ان کی سفارش آجائے گی، ان کے بڑے بڑے لنکس ہماری پیٹیاں تو اتروا سکتے ہیں لیکن ہم ان کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے۔''

خاور ملک کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

''حیرت ہے! ایک بیوروکریٹ ہو کر آپ اس طرح کی بات کر رہے ہیں۔ آپ چاہیں تو کیا نہیں ہو سکتا، پورے شہر کے حاکم ہیں آپ۔''

''نہیں اظہر صاحب! حاکمیت تو دور کی بات ہم تو خود حکم کے غلام ہیں، ہم جیسے بیوروکریٹس کو تو ستارہ بیگم جیسی عورتیں چٹکی میں مسل دیں۔ آپ کیا سمجھتے ہیں ایک اسلامی مملکت میں جہاں کھلے عام گناہ کبیرہ کی دعوتیں دی جاتی ہیں، قحبہ خانے اور ریڈ لائٹ ایریا ہیں، یہ سب ہماری یا ہمارے قانون کی نگاہوں میں نہیں ہیں، ایسی بات نہیں ہم سب کچھ جانتے ہیں، کہاں کیا ہو رہا ہے لیکن ان لوگوں کے پاس کچھ ایسے قانونی جواز ہوتے ہیں جن کی بناء پر ہم ان پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے پھر ان لوگوں کی پشت پناہی کرنے والوں کی بے حساب طاقت کے سامنے بھی ہمارا اپاہج قانون نہیں ٹک سکتا۔ یہ اگر اتنا آسان ہوتا تو یہ کوٹھے آپ کو آباد نہ دکھائی دیتے..... یہ انہی اونچے ایوانوں کے مالکان کے دم قدم سے ہیں۔'' ایس پی خاور ملک نے ایک تلخ حقیقت بیان کی۔

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہم سب نے ایک طوائف کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے ہیں، ہم اس کی پہنچ سے خوف زدہ ہو گئے ہیں، لعنت ہے ہمارے مرد ہونے پر۔'' اظہر شاہ کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔ ایس پی خاور ملک نے ایک نظر ان کے چہرے کے طنزیہ تاثرات پر ڈالی اور گویا ہوئے۔

''یعنی آپ کا خیال ہے کہ کسی قسم کا ہنگامہ کر کے اپنا مقصد حاصل کیا جائے..... یہی کہنا چاہتے ہیں ناں آپ..... لیکن سوری ٹو سے اظہر صاحب! یہاں مردانگی آزمانے کا نتیجہ مائنس زیرو کے سوا کچھ نہیں نکلے گا بہر حال میرا مقصد تو آپ کو سمجھانا تھا، آگے آپ لوگوں کی مرضی.....'' خاور ملک کے لہجے میں ناراضگی تھی۔ اظہر شاہ سے بات کرنے کے بعد انہوں نے ڈرائیونگ کرتے کامران کو مخاطب کیا۔

''کامی..... میرا خیال ہے میرا تم لوگوں کے ساتھ جانا بھی کچھ زیادہ فائدہ مند نہیں ہوگا اور میری کچھ ایسی ضرورت بھی نہیں، گاڑی روکو میں واپس جانا چاہتا ہوں۔''

''ارے خاور بھائی! ناراض نہ ہوں..... جیسے آپ بہتر سمجھیں گے اور کرینگے ہم بھی وہ کرینگے۔'' کامران سنجیدگی سے بولے

''میں ناراض نہیں..... لیکن میں اپنے کیریئر کو داؤ پر لگانا نہیں چاہتا۔ اب تک کے بے داغ کیریئر پر کوئی دھبہ لگ جائے، کم سے کم یہ مجھے منظور نہیں پھر میرا خیال ہے کہ یہ معاملہ ان کا یا ستارہ بیگم کا ہے یہ آپس میں جیسے چاہیں گے ڈیل کرلیں گے۔'' خاور ملک حقیقتاً اظہر شاہ کی ضد سے نالاں تھے۔

''نہیں ملک صاحب! ہم آپ کے توسط سے جا رہے ہیں اس لیے آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔ آپ اس مسئلے پر ہماری مدد کا وعدہ کر چکے ہیں اس لیے پلیز کول ڈاؤن..... اور اظہر یار تم بھی تحمل سے کام لو..... ابھی کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا ہے محض مفروضے قائم کیے جا رہے ہو۔ دیکھو جھگڑا یا ہنگامہ کسی مسئلے کا حل نہیں ہوسکتا۔ اس وقت ہم حاجت مند ہیں سو ہمیں جھکنا پڑے گا اگر وہ کچھ سخت سست سنائے بھی تو چپ کر کے سن لیں گے۔ اس لیے کہ مسئلہ دو افراد کی زندگی کا ہے۔ کچھ دیر کے لیے اپنے آپ کو جھکا لینے میں کوئی ہرج نہیں۔'' بابر شاہ پہلے خاور ملک سے اور بعد میں اظہر شاہ سے مخاطب ہوئے۔

''لیکن بھائی!.....'' اظہر شاہ نے کچھ کہنا چاہا۔

''اظہر..... تمہیں میری بات پر یقین ہے یا نہیں، ابھی تو ہم اس عورت سے ملے ہی نہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ پہلی بار ہی میں مان جائے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہمیں یہاں چند بار آنا پڑے۔ تو یار! آئیں گے۔ ہر ممکن طریقے سے کوشش کریں گے کہ یہ معاملہ بہ احسن و خوبی نمٹ جائے اور اگر ایسے نہ حل ہوا تو پھر تمہارے طریقے پر چلنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہے گا۔'' بابر شاہ بہت دھیمے لہجے میں بولے اور ان کے الفاظ کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا۔ اظہر شاہ مان گئے۔

''ٹھیک ہے جس طرح آپ مناسب سمجھیں۔'' ان کا لہجہ اور چہرے کے تاثرات بھی کسی حد تک نرم پڑ گئے۔ بابر شاہ نے طمانیت بھری سانس لے کر سیٹ کی پشت سے سر ٹکا دیا۔ خاور ملک کے تنے ہوئے اعصاب بھی کچھ ڈھیلے پڑ گئے۔ اس تمام عرصے میں فواد کچھ نہیں بولے تھے، ان کا ذہن مسلسل ادھیڑ بن میں تھا وہ حالات کی نزاکت کو پوری طرح سمجھ رہے تھے اور یہ بھی جان رہے تھے کہ جو مسئلہ انہیں درپیش ہے اس کا حل بے انتہا تحمل، بردباری اور سوجھ بوجھ سے ہی ہوسکے گا۔ ذرا سی بے احتیاطی، ذرا سا اشتعال سارے کیے کرائے پر پانی پھیرنے کو کافی تھا۔

آریان اور اس کی ماں ستارہ بیگم کی ملکیت تھیں۔ وہ چاہتی تو انہیں آزاد کر دیتی۔ چاہتی تو ان کی قیمت لے لیتی یا پھر ایسا بھی ہو سکتا تھا کہ وہ کسی قیمت پر ان دونوں کو نہ جانے دیتی کہ بہر حال وہ دونوں اس کے کاروبار کی بنیادی اکائیاں تھیں۔ بابر شاہ نے اظہر شاہ کو تو سمجھا بجھا دیا تھا لیکن وہ متفکر تھے اس لیے کہ کوٹھے کا ماحول اور وہاں بسنے والوں کی ذہنیت کو وہ بہت اچھی طرح سمجھتے تھے۔ وہاں پہنچ کر بھی

اظہر شاہ کی طرف سے انہیں فکر لگی رہتی تھی کہ مزاج کے خلاف کوئی بھی بات سن کر وہ ہتھے سے اکھڑ سکتے تھے بہر حال اوکھلی میں سر دے کر موسلوں سے ڈرنے والوں میں سے تو وہ بھی نہ تھے۔اب جو ہونا تھا اسے فیس کرنا تھا۔

گاڑی چند ایک خوبصورت کوٹھیوں کے قریب سے گزر کر سڑک کے ایک طرف رک گئی۔

''یہاں سے پیدل آگے جانا پڑے گا، گاڑی آگے نہیں جا سکتی۔'' خاور ملک اپنی جانب کا دروازہ کھولتے ہوئے بولے تو وہ سب بھی گاڑی سے نیچے اتر آئے، سڑک کے دائیں طرف قدرے کشادہ گلی تھی۔خاور ملک اس گلی کی طرف چل پڑے تو باقی سب بھی ان کی تقلید میں آگے بڑھنے لگے۔فواد نے بازار حسن کا صرف نام ہی سنا تھا۔پہلی بار ایسی جگہ آئے تھے، انہیں یہ جگہ کوئی غیر معمولی نہیں دکھائی دی۔دو منزلہ تین منزلہ مکانوں کی آمنے سامنے بنی قطاریں کہیں سے کشادہ اور کہیں سے تنگ گلیاں کافی آگے آنے کے بعد وہ دوبارہ دائیں جانب مڑ گئے۔بائیں ہاتھ پان سگریٹ بیڑی کی دو تین دکانیں تھیں یہ گلی پچھلی گلیوں کی نسبت قدرے وسیع تھی اور لوگوں کی آمد و رفت بھی تھی۔قدم قدم پر پھول بیچنے والے ہاتھوں میں پھولوں کی لڑیاں لیے کھڑے تھے اور ہر نو وارد کی طرف لپکتے تھے۔مغرب کی اذان ہو چکی تھی، مکانوں کے اوپری چوبارے روشن ہو چکے تھے۔

''بابو..... پھول تو لے لو.....'' ایک عورت جلدی سے آگے بڑھی اور اس نے پھولوں کی لڑیوں والا ہاتھ کامران کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔

''نہیں چاہئیں.....'' کامران سنی ان سنی کر کے آگے بڑھے۔

''ارے بابو! دیکھ تو لے..... دیکھتا کاہے کو نہیں رے..... نیلو نام ہے ہمکا.....'' خالص بازاری لہجہ اور انداز وہ نظر انداز کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔فواد کی زیرک نگاہیں اردگرد کے ماحول کا جائزہ لے رہی تھیں، بازار کی چہل پہل اور رونق دو چند تھی۔کچھ فاصلے پر چند آدمی کھڑے بڑی تولتی ہوئی نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔سرخ اور میرون کلر کے مفلر گلے میں ڈالے، مونچھوں اور بالوں کو تیل سے چپڑے، پان سے رنگے ہونٹوں والے، انگلیوں میں بیڑیاں دبائے ایک دوسرے سے سرگوشی میں باتیں کرتے فواد کو پہلی نظر میں ہی وہ کوئی تیسری دنیا کی مخلوق دکھائی دیئے۔وہ جن معنی خیز نظروں سے ان سب کو دیکھ رہے تھے ان نظروں کا مطلب سمجھ کر فواد کو کوفت ہونے لگی۔ان کے آگے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے اور محرک وہ چھبیس ستائیس سالہ جوان تھا جس نے ان کے بالکل قریب آ کر خاور ملک کو سلیوٹ جھاڑا تھا۔خاور ملک نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔

''سر ہم.....'' اس نے کچھ کہنا چاہا مگر ملک صاحب نے اس کی بات کاٹ دی۔

''گدھے..... یہ کوئی جگہ ہے جہاں سلیوٹ جھاڑ رہے ہو..... نان سینس۔'' خاور ملک نے خشک لہجے میں کہا۔

''سوری سر.....'' نو وارد کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔

''سوری کا بچہ.....'' وہ دانت کچکچا کر بولے اور ساتھ ہی دزدیدہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔کافی لوگ ان کی طرف متوجہ ہو گئے

تھے۔خاص طور پر وہ تینوں دلال جو غالباً شکار پھانسنے کی نیت سے وہاں کھڑے تھے بڑی ٹٹولتی ہوئی نظروں سے ان سب کو دیکھ رہے تھے۔

''باقی تینوں کہاں ہیں.....؟'' بہت دھیمے انداز میں خاور ملک بولے۔

''سر وہ اس وقت بی۔سی اور ڈی پوائنٹ پر الرٹ ہیں۔'' نووارد سرکاری زبان میں بولا۔

''گڈ! ہم اوپر جا رہے ہیں تم اصغر کو ساتھ لو اور دروازے کے آس پاس ہی رہنا۔''

''جی سر.....'' نووارد نے ان کی بات کے اختتام پر سلیوٹ مارنے کے لیے ہاتھ اوپر اٹھا لیکن خاور ملک کی کاٹ کھانے والی نظروں سے گڑبڑا کر سر کھجاتے ہوئے وہاں سے ہٹ گیا۔

''ملک صاحب! یہ سب کیا ہے؟'' بابر شاہ نے پوچھا۔

''سکیورٹی! جس جگہ ہم اس وقت موجود ہیں یہاں دکھائی کچھ دیتا ہے اور اصل میں ہوتا کچھ اور ہے۔ بے شک ہم یہاں جھگڑے کے لیے نہیں آئے لیکن پھر بھی ہر پہلو پر غور کرنا چاہیے''۔ خاور ملک سرخ لکڑی کے جالی دار دروازے کے سامنے پہنچ کر رک گئے۔

''لیجیے جناب! ہماری منزل آ گئی۔ آیئے۔'' ایس پی خاور ملک نے دروازہ کھولا اور سیڑھیوں پر قدم رکھا۔ سیڑھیوں کے شروع میں بائیں طرف ایک دروازہ تھا جو غالباً نچلی منزل کے اندر داخل ہونے کا راستہ تھا لیکن اس دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ سب آگے پیچھے قدم اٹھاتے زینہ طے کرتے چلے گئے سیڑھیوں کے اختتام پر ایک چار پانچ فٹ لمبی چوڑی بالکونی تھی۔ بالکونی میں کھڑے غلام عباس کو دیکھ کر بابر شاہ کی نگاہوں میں شناسائی کی رمق جاگی۔ وہ آج بھی اسی حلیے میں تھا جس میں انہوں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ ان کی طرف بڑھنے کی بجائے ہاتھ کے اشارے سے سلام کرتا تیزی سے اندر کی طرف بڑھ گیا۔ وہ پانچوں بالکونی میں ایک پل کو رکے اور پھر لکڑی کے ایک بہت بڑے منقش دروازے کے کھلے پٹ سے اندر داخل ہو گئے۔ یہ ایک بہت بڑا کمرہ یا لاؤنج تھا جس کی چاروں دیواروں میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بند دروازے تھے یہ لاؤنج یا کمرہ قدرے گولائی کی شکل لیے ہوئے تھا اور اس کے وسط میں گہرے نیلے رنگ کا قالین بچھا ہوا تھا جبکہ چاروں اطراف نہایت قیمتی صوفے گولائی میں بچھائے گئے تھے۔ چھت کے وسط میں لگا فانوس ست رنگی روشنیوں سے منور تھا۔ ابھی انہیں اندر آئے ایک آدھ منٹ ہی گزرا ہوگا کہ ایک تیکھے نقوش کی گدرائے ہوئے جسم کی مالک خوبصورت عورت ان کی طرف تیزی سے آتی دکھائی دی۔ سلیولیس ہاف بلاؤز کے ساتھ بلیک شیفون کی ساڑھی اس کے گندمی رنگ کو عجیب سی تازگی بخش رہی تھی۔ شولڈر کٹ بالوں کو مصنوعی رنگ دیا گیا تھا لیکن اس پر سج رہا تھا اپنے بے باک حلیے کے باوجود وہ بری نہیں لگ رہی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر اپنے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے پھول سب سے آگے کھڑے خاور ملک کے قدموں میں رکھ دیے۔

سواگت کا یہ انوکھا اور دلنشیں انداز ایک پل کو ان سب کو بہت اچھا لگا۔ فواد نے کوٹھوں کے بارے میں بہت عجیب و غریب باتیں سنی تھیں لیکن اس وقت ان کا مشاہدہ کچھ اور کہہ رہا تھا۔

''زہے نصیب! آج تو اپنے بھاگوں پر رشک آ رہا ہے کہ ہمارے غربت کدے میں شہر کے بادشاہ نے قدم رکھ دیا۔'' اس کا لہجہ

دلنشیں تھا اور انداز من موہنے والا۔

''آپ یقیناً ستارہ بیگم ہیں۔'' خاور ملک نے تائید طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھا، انہیں اپنی یہ پذیرائی اچھی لگی تھی۔

''جی ہاں! کنیز کو ستارہ بیگم کہتے ہیں.....'' وہ خوشگوار لہجے میں بولی اس کی نظریں ایس پی خاور ملک کے چہرے سے پھسل کر ان کے ہمراہ آنے والے چہروں کو ٹٹول رہی تھیں۔ یہ چہرے یہاں آنے والے چہروں سے بالکل مختلف تھے۔

''آیئے..... اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔'' وہ انہیں اپنے ہمراہ لیے ہوئے آگے بڑھی۔ بابر شاہ اتنی دیر میں اس کی شخصیت کو کسی حد تک کھنگال چکے تھے اور ان کا خیال تھا کہ بظاہر ستارہ بیگم جس قدر شائستہ دکھائی دے رہی ہے اس قدر ہے نہیں۔ کوٹھوں کی روایات میں بناوٹ کی ادائیت تو ہمیشہ سے زندہ رہی ہے کہ یہاں بسنے والوں کو ہر نئے آنے والے کے لیے بچھ بچھ جانا ہوتا ہے خواہ دل میں اس کے لیے کتنی ہی نفرت چھپی ہو۔ محبت اور نفرت کا بھی عجیب ہی سلسلہ ہوتا ہے یہاں.....

وہ پانچوں ستارہ بیگم کے ساتھ چلتے ہوئے لاؤنج میں ہی موجود ایک اور دروازے سے اندر داخل ہو گئے غالباً یہ ہال کمرہ مجرے وغیرہ کے لیے آراستہ کیا گیا تھا۔ پورے کمرے میں سرخ قالین بچھے ہوئے تھے، دیواروں میں بنے ہوئے طاقوں میں برقی چراغ روشن تھے اور چاروں طرف دیواروں کے ساتھ ساتھ گدے بچھے ہوئے تھے جن پر نفاست سے گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے۔ فواد نے آگے بڑھنے سے پہلے جوتے اتارنے چاہے تو ستارہ بیگم نے منع کر دیا۔

''ارے برخوردار! تشریف لے آیئے..... کن تکلفات میں پڑ گئے.....'' فواد اس کی بات سن کر اندر آ گئے، اس قدر صاف ستھرا، جگمگاتا ہوا ماحول..... وہ مسحور سے چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ ستارہ بیگم اور وہ نیچے گدوں پر براجمان ہو گئے۔ غلام عباس بھی ان کے ہمراہ ہی کمرے میں آیا تھا لیکن وہ ایک طرف دیوار کے ساتھ خاموش کھڑا تھا۔

''ارے گھنگھرو! کاہے کو ایسے خاموش کھڑا ہے آج تو قسمت جاگ گئی ہماری..... ارے ہمارے کوٹھے پر بڑے بڑے لوگ آئے ہیں، کوئی چائے، کوئی بسکٹ، کوئی شربت، کوئی پینے پلانے کا انتظام کرو.....'' ستارہ بیگم اپنے مخصوص معنی خیز انداز میں بولی۔

''نہیں ستارہ بیگم! کوئی تکلف مت کیجیے گا.....'' خاور ملک نے جلدی سے کہا۔

''ارے ایس پی صاحب! کیسی باتیں کرتے ہیں آپ۔ اس میں تکلف کیسا؟ ارے ہم تو مہمانوں کو سر آنکھوں پر بٹھانے والے لوگ ہیں، میلے تن والے سہی لیکن دل کے بادشاہ ہیں۔ خاطر مدارت سے ہمیں روک کر آپ ہماری مہمان نوازی کی روایت تو نہ توڑیے۔''

''آپ اس قدر مصر ہیں تو ایک ایک گلاس ٹھنڈا پانی پلا دیجیے، آپ کی روایت بھی برقرار رہے گی اور ہماری بات بھی۔'' خاور ملک پینے پلانے کا مطلب اچھی طرح سمجھ گئے تھے۔

''آپ بہت ہوشیار ہیں ایس پی صاحب! چلیے یونہی سہی.....'' ستارہ بیگم مسکرا دی اور پلٹ کر غلام عباس سے مخاطب ہوئی۔

گھنگھرو! مہمانوں کے لیے شربت کا ہی انتظام کرو۔'' غلام عباس ستارہ بیگم کی بات سن کر باہر نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی ستارہ

بیگم دوبارہ ان کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''جی جناب..... حکم کیجئے..... کیا سنیں گے، گیت سنیں گے یا غزل..... یا پھر ناچ دیکھیں گے۔ ہر فرمائش پوری کرنے کا سامان موجود ہے.....'' وہ بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں تکلف اور حجاب کم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ وہ سب اس کی ایک ایک ادا کو سمجھ رہے تھے۔ ایس پی کوئی چھوٹی موٹی آسامی نہیں ہوتا، پورے شہر کا حاکم ہوتا ہے اور اس وقت وہ حاکم اس کے دام میں آنے والا تھا، وہ گھاگ کھلاڑی تھی اور میدان میں کھیلنے کے ہر گر سے واقف تھی اس آسامی کو پھانسنے سے اس کے لیے یقیناً بہت آسانیاں پیدا ہو جاتیں۔ ایس پی خاور ملک بھی جان رہے تھے کہ وہ انہیں لہجوں اور اداؤں کے تار عنکبوت میں جکڑنے کی کوشش میں ہے۔

''نہیں، ستارہ بیگم..... ہم سننے کے لیے نہیں آئے۔ اس پروگرام کو پھر کبھی پر رکھیں ہم تو سنانے آئے ہیں۔''

''ایس پی صاحب! یہ سننے سنانے کا سلسلہ تو چلتا رہے گا آپ کی بھی سنیں گے لیکن آپ کوئی فرمائش تو کریں یقیناً ہم آپ کو مایوس نہیں کریں گے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''نہیں ستارہ بیگم..... آج پہلے آپ کو سننا پڑے گا۔'' خاور ملک کا لہجہ کچھ عجیب سا تھا۔ ستارہ بیگم کے مسکراتے ہونٹ سکڑ گئے، آنکھوں میں الجھن کے تاثرات در آئے۔ وہ عجیب مخمصے کی کیفیت میں ان کی طرف دیکھنے لگی۔

''ایس پی صاحب! یقیناً کوئی بہت خاص بات ہے۔ ایسی ہی بات تھی تو آپ مجھے حکم کرتے میں خود آپ سے کانٹیکٹ کر لیتی۔''

''ستارہ بیگم! کام ہمارا تھا سو ہمیں خود یہاں آنا تھا۔ ضرورت ہماری تھی جو ہمیں آپ کے در تک لے آئی.....''

''ایسا کیا کام تھا..... ایسی کیا ضرورت تھی جو شہر کے حاکم کو ہمارے دروازے تک لے آئی، ہم جیسے بے اماں لوگوں کو بھاگیہ وان کر دیا..... آپ کے قدموں نے تو ہماری توقیر بڑھا دی ایس پی صاحب.....''

''ستارہ بیگم ہم نے سنا تھا کہ آپ اپنے دروازے پر آنے والے کا پھولوں سے سواگت کرتی ہیں، پھول محبت کی علامت ہوتے ہیں، آپ کی شخصیت میں چھپی محبت کو آج ہم نے دیکھ بھی لیا، بہت اچھا لگا ہمیں جب آپ نے ہمارے قدموں میں پھول نچھاور کیے۔'' خاور ملک بولے۔

''یہ تو آپ کی ذرہ نوازی ہے وگرنہ ہمیں کون اس قدر اہمیت دیتا ہے۔'' اس کا لہجہ ٹوٹا ہوا تو نہیں تھا لیکن کچھ آزردگی جھلکتی تھی۔

''آپ کی اسی محبت اور شائستگی سے حوصلہ پا کر میں اپنی عرض آپ کے سامنے بیان کروں گا، اس یقین کے ساتھ کہ آپ میری عرض کو توجہ سے سنیں گی۔''

''ایس پی صاحب! جان اور ایمان کے سوا جو مانگیں گے حاضر ہوگا۔ جتنی میری بساط ہے اس سے بڑھ کر ثابت کروں گی۔ آپ کہیں میں سن رہی ہوں۔'' ستارہ بیگم سنجیدہ لہجے میں بولی۔

''ستارہ بیگم! بہت بڑی بات کہہ دی ہے آپ نے..... سوچ لیجئے اس بات پر قائم رہنا پڑے گا آپ کو.....'' خاور ملک بولے

''آزما کر دیکھ لیجیے۔ پھروں گی نہیں اپنی بات سے۔'' ستارہ بیگم ثابت قدم تھی۔

''تو پھر ستارہ بیگم یوں سمجھ لیجیے ہم آپ سے آپ کا کلیجہ مانگنے آئے ہیں۔'' خاور ملک گھمبیر لہجے میں بولے۔

''دیکھیے ایس پی صاحب! میں نے پہلے ہی آپ سے کہہ دیا تھا کہ جان اور ایمان کے علاوہ جو کچھ مانگیں گے حاضر ہوگا۔ آپ مجھ سے کلیجہ مانگ رہے ہیں..... اگر میں کلیجہ آپ کو دے دوں گی تو پھر جیوں گی کیسے؟'' اس کا لہجہ قدرے خوشگوار تھا۔

''لیکن اگر آپ کو زندگی کی ضمانت دے دی جائے تو کیا پھر آپ ہماری فرمائش پوری کریں گی۔''

''بالکل..... پھر تو کوئی عار نہیں..... لیکن ایک منٹ ایس پی صاحب..... آپ نے اپنے ساتھ آنے والوں کا تو تعارف ہی نہیں کرایا۔'' ستارہ بیگم کی بات پر خاور ملک بھی جیسے ہوش میں آ گئے۔ مسئلے کی باریکیوں پر سوچتے اور پھر ستارہ بیگم کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے وہ بالکل ہی بھول گئے تھے کہ اس وقت ان دونوں کے علاوہ چار نفوس اور بھی وہاں موجود ہیں جو یکسر خاموش بیٹھے ان کی گفتگو سن رہے ہیں۔ ابھی خاور ملک کچھ بولنے لگے تھے کہ دروازہ کھلا اور غلام عباس ہاتھ میں ٹرے لیے اندر داخل ہوا جس میں اورنج جوس کے گلاس رکھے ہوئے تھے۔ اس نے سب کو پیش کیا۔

''بائی جی..... بی بی پوچھ رہی ہیں کہ محفل کب ہونی ہے۔ کیا سازندوں کو بھیجوں؟'' غلام عباس ہاتھ میں خالی ٹرے تھامے کھڑا پوچھ رہا تھا۔

''نہیں گھنگھرو! چاندنی کو منع کر دو۔ بیمار تھی وہ..... اسے کہہ دو کہ محفل نہیں ہوگی اور ہاں ہم ضروری بات کر رہے ہیں اس لیے ذرا خیال رکھنا ادھر کوئی نہ آئے۔'' ستارہ بیگم نے کہا تو غلام عباس نے ذرا کی ذرا نگاہیں اٹھا کر بابر شاہ کی طرف دیکھا اور 'جی اچھا بائی جی' کہہ کر باہر نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی ستارہ بیگم دوبارہ خاور ملک کی طرف متوجہ ہوئی۔

''جی ایس پی صاحب! آپ ان کا تعارف کروانے لگے تھے۔''

''اصل میں ستارہ بیگم! کام تو انہی کو تھا..... آپ سے ملنے کے لیے بڑی دور سے آئے ہیں یہ میں تو بس اس شہر میں ان کی میزبانی کے فرائض سرانجام دے رہا ہوں اسی لیے ان کے ساتھ چلا آیا۔'' خاور ملک نے کہا تو ستارہ بیگم نے دلچسپی سے ان چاروں کی طرف دیکھا۔

''کہاں سے آئے ہیں یہ سب؟'' اس نے پوچھا

''راولپنڈی سے.....'' خاور ملک کے بتانے پر جوس کا گلاس ہونٹوں کی طرف لے جاتے لے جاتے ستارہ بیگم کا ہاتھ رک گیا۔ اس نے گہری نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔ پنڈی شہر کا نام سن کر بہت ہلکا سا تاریک سایہ اس کے چہرے پر لہرا کر معدوم ہو گیا تھا اور یہ سایہ صرف بابر شاہ اور خاور ملک کی زیرک نگاہیں ہی دیکھ پائی تھیں یقیناً اس کا ذہن بڑی تیزی سے کڑیاں ملا رہا تھا لیکن وہ جہاندیدہ عورت تھی اس لیے اپنے اندر اٹھنے والی الجھنوں اور سوالوں کو بڑی خوبصورتی سے چھپا کر مسکرا دی۔

''ہوں.....'' وہ مبہم انداز میں بڑبڑائی۔ ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال بڑی شدت سے ابھرا تھا کہ راولپنڈی میں ہی تو آریان بھی موجود تھی اور وہیں اس کے دونوں جاں نثار اس وقت حوالات کی دال روٹی کھا رہے تھے۔ یہ سب کون ہیں۔ ان سب کا اتنی دور اس سے ملنے کے لیے آنا حیرت کا باعث ہی تھا۔ نہ تو وہ فلم اسٹار تھی اور نہ ہی کوئی سیاستدان کہ لاہور میں بیٹھی ہوئی اور پنڈی، پشاور تک ڈنکا بجتا، اسے ان لوگوں کا آریان کے ساتھ کوئی لنک کوئی جوڑ محسوس ہو رہا تھا۔

''یہ کامران ہیں میرے چچازاد بھائی اور اس وقت پنڈی میں ایس پی کی پوسٹ پر تعینات ہیں۔'' خاور ملک نے تعارف شروع کیا۔

''ایس پی صاحب! پہلے یہ بتا دیں آپ کی فیملی میں اور کتنے ایس پی ہیں؟'' وہ بظاہر خوشدلی سے بولی لیکن دل و ذہن اس وقت بہت سی سوچوں کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے۔

''بس فی الحال تو ہم دو ہی ہیں بہر حال یہ ہیں بابر شاہ اور یہ اظہر شاہ دونوں ٹرانسپورٹر ہیں اور یہ بابر شاہ کے فرزند فواد شاہ حال ہی میں ایم بی بی ایس کرنے کے بعد آج کل اپنے کلینک میں مصروف ہوتے ہیں۔'' خاور ملک کے تعارف کروانے پر ستارہ بیگم کی چمکدار آنکھوں میں دلچسپی پیدا ہو گئی۔

''ٹھیک! اب یہ بتا دیجئے کہ یہ سب مجھ سے کس وجہ سے ملنا چاہتے تھے۔'' ستارہ بیگم نے پوچھا تو ایک لمحے کے لیے خاور ملک خاموش ہو گئے۔ ستارہ بیگم کی منتظر نظریں خاور ملک کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں۔

''اصل میں مجھے مناسب الفاظ نہیں مل رہے جن کے ذریعے میں اپنا مدعا بیان کروں۔'' خاور ملک بولے تو ستارہ بیگم کی آنکھوں میں بڑے عجیب سے تاثرات در آئے۔

''ایسی کیا بات ہے ایس پی صاحب..... آپ ہچکچائیں مت۔ جو بھی بات ہے کھل کر کہیں۔''

ستارہ بیگم کے کہنے پر خاور ملک نے بابر شاہ کی طرف دیکھا وہ بھی انہی کی طرف متوجہ تھے غالباً انہوں نے بابر شاہ کو بات کرنے کا اشارہ کیا تھا کہ ستارہ بیگم کے سوال کے جواب میں وہ اپنے مخصوص نرم لہجے میں گویا ہوئے۔

''ہم آریان کے بارے میں کچھ بات چیت کرنے آئے ہیں..... وہ اس وقت ہمارے پاس ہے۔''

''ہوں..... پھر.....'' اس کی آنکھوں میں چبھتا ہوا تاثر لو دینے لگا۔

''ہم اس لیے حاضر ہوئے تھے کہ آپ کے بندے آریان کو پریشان کرتے ہیں، پچھلے کچھ دن تو وہ بہت ڈری سہمی سی رہی، ان دونوں آدمیوں نے صرف اسے ڈرایا دھمکایا ہی نہیں بلکہ ہمارے گھر پر دھمکی آمیز فون آتے رہے۔ فواد کے کلینک میں بھی انہوں نے توڑ پھوڑ کی اسے زخمی بھی کیا۔ ہمیں مجبوراً انہیں لاک اپ میں بند کروانا پڑا۔ آپ سے صرف ایک استدعا ہے کہ اپنے بندوں کو سمجھا دیں کہ وہ بچی کو تنگ کرنا چھوڑ دیں یقیناً ان دونوں کے کچھ اور ساتھی بھی وہاں موجود ہیں۔'' بابر شاہ نے تفصیل سے اپنا مدعا بیان کیا۔

''ہوں! تو آپ چاہتے ہیں کہ میں انہیں واپس بلوا لوں.....'' وہ عجیب سے انداز میں بولی۔

''جی ہاں.....'' ان کے جواب پر وہ کچھ دیر کو خاموش ہوگئی پھر کچھ لمحے کے توقف کے بعد اسی نے بوجھل سکوت کا پردہ چاک کیا۔

''شاہ صاحب! وہ چڑیا اس علاقے کی آب و ہوا، سرد و گرم کی عادی ہے آپ کے ماحول میں نہیں رہ پائے گی۔ میں تو آپ کو ایماندار سمجھتی تھی کہ میری امانت کو لوٹانے کی بات کرینگے آپ تو اسے بالکل ہی الگ کرنا چاہتے ہیں۔''

''ستارہ بیگم! وہ آپ کے ماحول کی عادی ہی تو نہیں ہے اگر عادی ہوتی یہاں کی عیش و آرام کی زندگی اسے پسند ہوتی تو وہ کبھی اس جگہ کو چھوڑ کر نہ جاتی اور اب بھی وہ یہاں واپس نہیں آنا چاہتی۔ اسی لیے ہم آپ سے اس مسئلے پر ڈسکس کرنے آئے ہیں کہ مل بیٹھ کر کوئی حل نکال لیا جائے۔'' بابر شاہ رسانیت سے بولے۔

''شاہ صاحب! کیسی بچوں جیسی باتیں کر رہے ہیں آپ۔ وہ یہاں اگر واپس نہیں آنا چاہتی تو ہمارے پاس سو طریقے ہیں اسے یہاں واپس لانے کے۔ اس کی ماں ہمارے پاس ہے جس کی زندگی ہی یہیں گزر گئی وہ اسے چھوڑ کر کہاں جائے گی۔ بے وقوف کو ابھی دنیا کی ٹھوکریں نہیں پڑیں عقل ٹھکانے آجاتی۔'' ستارہ بیگم نے بات کرتے کرتے آخری الفاظ بالکل ہی خود کلامی کے سے انداز میں کہے۔ اس کے انداز میں قدرے ناگواری در آئی تھی۔

''ستارہ بیگم! میرا خیال ہے ان کی بات سن لینے میں کوئی ہرج بھی نہیں۔'' خاور ملک نے جیسے اسے رام کرنے کی کوشش کی۔

''ایس پی صاحب! جو یہ کہنا چاہ رہے ہیں میں سمجھ گئی ہوں لیکن میں اس سلسلے میں ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ یہ..... یہ جو کچھ آپ دیکھ رہے ہیں ناں یہ عالیشان مکان، یہ قیمتی فرنیچر یہ سونے کے زیور..... یہ مہنگے لباس یہ سب میری محنت کی کمائی نہیں اور نہ ہی اس کوٹھے کی ناچنے والیوں میں اتنا دم خم ہے یہ سب کچھ چاندنی کے وجود سے ہے۔ اس کی آواز محض آواز نے لوگوں کو ایسے سحر میں جکڑ رکھا ہے کہ جو ایک بار اس کی آواز سن لیتا ہے وہ بار بار سننے کی چاہ میں یہاں کے چکر لگاتا ہے۔ یہاں لوگ مجرا دیکھنے سے زیادہ اسے سننے آتے ہیں، اس کی آواز میں چھپے درد نے میرے لیے خزانوں کے منہ کھول دیئے۔ اسی کی بدولت آج میرا نام بازارِ حسن کی گنتی کی نائیکاؤں میں ہوتا ہے اور آریان..... آریان ہو بہو اپنی ماں کی کاپی ہے وہی شکل و صورت وہی آواز وہی انداز پھر آپ خود ہی بتائیں میں اس سے کس طرح دستبردار ہو جاؤں۔''

''یعنی محض اپنے عیش و آرام کی خاطر آپ اس کو ایک غلط کام پر اکسائیں گی اس کی خداداد صلاحیتوں سے ناجائز فائدہ اٹھائیں گی، یہ تو صریحاً خود غرضی ہوئی ناں۔'' اظہر شاہ پہلی بار بولے۔ ستارہ بیگم نے خشمگیں نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

''آپ غالباً اظہر شاہ ہیں وہ ایک لمحے کے توقف کے بعد بولی۔ اظہر صاحب میں یہ سب اپنے عیش و آرام کے لیے کر رہی ہوں یا چاہے خود غرضی کے تحت۔ اس میں بے جا مداخلت مجھے پسند نہیں۔ آپ مجھے کچھ بھی سمجھتے رہیں خود غرض، مطلب پرست، سنگدل جو بھی مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن بہر حال میں آریان کو چھوڑ کر یہ سب آسائشات نہیں کھونا چاہتی اور نہ ہی کنگال ہونا چاہتی ہوں.....''

''لیکن ستارہ بیگم! ایک محض آریان کے نہ ہونے سے کیا فرق پڑ جائے گا۔'' کامران بولے۔

''ہاں فرق تو کچھ خاص نہیں پڑے گا۔ بس میں کنگال ہو کر روڈ پر آ جاؤں گی.....اور یہ لوگ جو مجھے بڑی بائی جی..... بڑی بائی جی کہتے نہیں تھکتے۔ میرے آگے پیچھے پھرتے ہیں کل کو ان کی ٹھوکریں میرا مقدر ہوں گی اور بھلا کیا فرق پڑتا ہے۔'' ستارہ بیگم تلخ لہجے میں بولی۔

''لیکن ستارہ بیگم! آپ کسی کو اس کی مرضی کے خلاف کوئی کام کرنے پر مجبور کریں گی تو یہ اس کے ساتھ ظلم ہوگا۔ آریان یہاں واپس نہیں آنا چاہتی۔ ہم نے اسے چار دیواری کا تحفظ فراہم کیا ہے، رشتوں کا مان دیا ہے اور وہ اس میں خوش ہے پھر آپ کس لیے اسے یہاں رہنے اور اس ماحول میں رچنے بسنے پر مجبور کر رہی ہیں۔'' بابر شاہ بولے۔

''دیکھئے صاحب! یہ کوٹھا ہے عزت داروں کے لیے ایک گالی اور ہم جیسوں کی جائے پناہ۔ یہاں کوئی اپنی خوشی سے نہیں بیٹھا۔ چاندنی ہے نا۔ بڑی خوبصورت گائیکہ ہے اس کی آواز میں درد اور سوز ایسا ہے کہ اگر اڑتا پرندہ سن لے تو وہ بھی ٹھہر جائے۔ یہ درد یہ سوز اس کی آواز میں کیسے پیدا ہوا۔ دکھوں سے، ایک طویل عرصے سے وہ اس کوٹھے کی زینت ہے اپنی خوشی سے نہیں مجبوری سے..... چھمیا ہے رقص کرتی ہے تو لگتا ہے کائنات جھوم اٹھتی ہے۔ وہ بھی یہاں رہتی ہے۔ ہنستی ہے بولتی ہے پر میں جانتی ہوں وہ ایک عرصے سے دل سے ہنسنا بھول چکی ہے۔ یہ عورتیں جو یہاں رہتی ہیں نا امان میں ہیں۔''

''ستارہ بیگم.....! میں.....'' بابر شاہ نے کچھ کہنا چاہا۔

''ابھی میری بات پوری نہیں ہوئی شاہ صاحب! ہماری دنیا آپ لوگوں کی دنیا سے بہت مختلف سہی، آپ لوگ ہماری دنیا کو غلاظت کا ڈھیر کہتے ہیں۔ یہاں رہنے والے بھی جیتے جاگتے انسان ہی ہیں لیکن یہاں بسنے والوں کے حصے میں آپ کی مہذب دنیا کی صرف نفرت ہی آتی ہے۔ یہاں اجلے کپڑوں والے شریف زادے آتے ہیں تو محض دل بہلانے کے لیے۔ ایک کھلونے سے بھی گئی گزری اوقات ہے ہماری لیکن ہمارے بھی کچھ قاعدے کچھ قانون ہیں، کچھ اصول ہیں، یہاں آنے والا ہماری مرضی سے چلتا ہے اپنی من مانی نہیں کر سکتا لیکن آپ کی دنیا میں حیوان کھلے بندوں پھرتے ہیں، بھیڑوں کے بھیس میں بھیڑیے پھرتے ہیں۔ بڑے سے بڑا گناہ کر کے بھی شرمسار نہیں ہوتے۔ عزت کو عزت نہیں سمجھا جاتا پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ آریان کو چار دیواری کا تحفظ نہیں ملا۔ یہاں اس کی ماں ہے جو اس کا انتظار کر رہی ہے' یہ کملا گھنگھرو ہے جسے یہاں کے سب لوگ اس کا لے پالک باپ کہتے ہیں۔ لے پالک باپ کی اصطلاح پر وہ خود ہی مسکرانے لگی۔ کیا یہ رشتے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ آپ اس کی خوشی کو رہنے دیں اور اسے واپس بھجوا دیں یہ ہمارے اور آپ کے حق میں اچھا ہوگا۔'' ستارہ بیگم نے بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''اور اگر وہ نہ آنا چاہے.....'' بابر شاہ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''تو ہمارے پاس بہت طریقے ہیں اسے لانے کے۔ آپ بیچ میں مداخلت نہ کیجئے گا۔ ہم خود اسے لے آئیں گے۔''

''ستارہ بیگم! پلیز ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچئے۔ آپ کے پاس لڑکیوں کی کمی تو نہیں۔'' کامران نے کہا۔

''ہاں! کمی تو نہیں لیکن آریان جیسی کوئی نہیں۔ ارے سب کہتے ہیں ستارہ بیگم تو بھاگیہ وان ہے۔ بازارِ حسن کا تاج اس کے پاس

ہے۔ میں اپنی راجدھانی سے کیسے دستبردار ہو جاؤں۔ یہ ارد گرد بسنے والی سینکڑوں طوائفیں اور بڑی بڑی نائیکائیں آریان پر نظریں گاڑے بیٹھی ہیں اور میری تو وہ ملکیت ہے پھر میں نے اس کا سودا کر رکھا ہے اور ہمارے ہاں زبان کی کتنی اہمیت ہے یہ شاید آپ نہ جانتے ہوں۔''

''ستارہ بیگم! زبان تو آپ نے ہمارے ساتھ بھی کی ہے۔ قول تو ہمیں بھی دیا ہے۔'' خاور ملک نے ستارہ بیگم کی بات کاٹتے ہوئے جلدی سے کہا تو وہ بڑے عجیب انداز میں مسکرا دی۔

''ایس پی صاحب! آپ کی فہم کی تو میں پہلے ہی قائل ہو چکی ہوں۔ بہت ہوشیار ہیں آپ جانتے ہیں کس کو کہاں اور کیسے لپیٹنا ہے، لفظوں سے کھیلنا خوب آتا ہے آپ کو تو پھر ٹھیک ہے میں نے آپ کے ساتھ زبان کی ہے ناں تو کہیں زبان کاٹ کر آپ کے سامنے رکھ دوں یا سینہ چیر کر کلیجہ نکال کر پیش کروں لیکن مجھے معاف کر دیں میں آریان کو نظر انداز نہیں کر سکتی اور پھر اس کی ماں بھی کبھی اس کے بغیر رہنا گوارا نہیں کرے گی۔'' ستارہ بیگم حتمی انداز میں بولی۔

''تو ستارہ بیگم ہم آریان کے ساتھ ساتھ اس کی ماں کو بھی تو یہاں سے لے جانے آئے ہیں۔'' بابر شاہ نے کہا تو ستارہ بیگم نے ایک جھٹکے سے ان کی طرف دیکھا۔

''آپ کیا ستارہ بیگم کو بالکل ختم کرنے آئے ہیں، ایسی ہی بات ہے تو یہ سامنے ٹیبل پر خنجر رکھا ہے، گھونپ دیجئے میرے سینے میں لیکن چاندنی اور آریان کو میں نہیں چھوڑ سکتی۔''

''ستارہ بیگم! آپ نے خود کہا کہ وہ مجبور ہیں یہاں اپنی خوشی سے نہیں بیٹھی ہوئیں۔ وہ مجبور ہیں لیکن آپ تو بااختیار ہیں جسے چاہیں قید کر لیں جسے چاہیں آزاد کر دیں پھر یہاں آپ اپنے اختیارات کو کیوں نہیں استعمال کر رہیں۔''

''میں بااختیار کب ہوں..... میں بھی مجبور ہوں..... پیٹ کا جہنم بھرنا ہے مجھے، تن ڈھانکنا ہے اپنا..... زندگی کی گود میں بچی کھچی سانسیں سکون سے گزارنی ہیں۔ ساری زندگی خوشحال گزار کر میں اب بڑھاپا لوگوں کے ٹھڈے ٹھوکریں کھا کر نہیں گزارنا چاہتی۔''

''ستارہ بیگم..... محض اپنی ذات کے لیے آپ ان کی مجبوریوں کا سودا کرتی رہیں گی۔ کیا آپ کا ضمیر آپ کو اس بات پر ملامت نہیں کریگا۔'' بابر شاہ کا لہجہ چبھتا ہوا سا تھا۔ ستارہ بیگم نے بڑے انداز سے نگاہیں اٹھا کر ان کی طرف دیکھا، ہلکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آ جمی۔

''ہم جیسوں کے پاس ضمیر ہوتا ہی کہاں ہے شاہ جی! بکنے والے کیا جانیں غیرت، ضمیر، خودداری اور انا جیسے دلفریب لفظوں کو۔ یہ تو آپ کی مہذب دنیا کی میراث ہیں لیکن کیا میں یہ پوچھنے کی جسارت کر سکتی ہوں آپ کس رشتے سے انہیں اپنے گھر میں رکھیں گے..... آریان بچی ہے..... اس ماحول کی غلاظت کا ابھی اس پر ایک چھینٹا بھی نہیں پڑا۔ عزت سے بسانا چاہیں گے تو بس جائے گی..... لیکن اس کی ماں..... اس کو کس حیثیت سے لے جانا چاہتے ہیں۔'' بہت گہرے ذو معنی لہجے میں اس نے پوچھا۔

''شاہ صاحب! اس ماحول کی بڑی گہری چھاپ ہے اس پر۔ گھنگھروؤں کی جھنکار کو لوری کی طرح سن کر سونے کی عادی ہے

وہ..... لاکھوں دھبے لگے ہوئے ہیں اس کے دامن پر ان دھبوں کو کیسے مٹائیں گے آپ..... انگلیاں اٹھیں گی..... بہت سی آوازیں اور نگاہیں اس کا تعاقب کریں گی، یہاں کی یادیں کبھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑیں گی، مہذب دنیا کے سنگی رویوں سے کیسے بچائیں گے اسے۔'' ستارہ بیگم بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

''یہ ہمارا مسئلہ ہے ستارہ بیگم..... آریان کے سر پر ہاتھ رکھ کر میں نے اسے اپنی بیٹی کہا ہے اور اس کی ماں میرے گھر میں میری بہن کی حیثیت سے رہے گی۔ میں تو اتنا جانتا ہوں کہ اگر ایک طرف ایک کٹورہ آب زم زم ہو اور اس کے مقابل کیچڑ اور گندگی کا جوہڑ یہ تقویٰ اور ایمان کی بات ہے کہ محض ایک قطرہ زم زم پورے تالاب کو پاک کر دے گا ہم اس کے گرد عزت کا حصار قائم کر دینگے۔ اتنا قوی اور مضبوط حصار کہ جس سے ٹکرا کر تمام آوازیں دم توڑ دیں گی۔ اس عزت اور شرافت کی چار دیواری سے گزر کر کوئی میلی نظر اس کے دامن تک نہیں پہنچ پائے گی اور اس کی آغوش میں سمٹ کر وہ یہاں سے کہیں زیادہ سکون کی نیند سوئے گی۔'' بابر شاہ آج ستارہ بیگم کے ہر سوال کا جواب دینے پر تلے ہوئے تھے۔

''شاہ صاحب! آپ کا جذبہ قابل قدر سہی۔ زندگی گزر گئی ستارہ بیگم کی ان کوٹھوں پر کبھی کسی مرد نے کسی طوائف کو بیٹی یا بہن جیسے مقدس رشتے کا مان نہیں دیا لیکن آریان اور چاندنی ہی کیوں..... اس کوٹھے پر اور بھی تو کئی مجبور لاچار عورتیں ہیں ان میں سے کسی کو بیٹی یا بہن کیوں نہیں بناتے آپ..... کسی طوائف کو عزت دینا ہی مقصود ہے ناں..... تو پھر آریان یا اس کی ماں کی شرط ہی کیوں؟ وہ تو کوئی بھی ہو سکتی ہے۔'' ستارہ بیگم محض انہیں الجھا رہی تھی۔ درحقیقت اس کا ذہن بہت تیزی سے اس ساری سچویشن پر سوچ رہا تھا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ اس کے سامنے موجود لوگ ریت کی دیوار نہیں جو اس کے لہجے کی سختی سے ہی گر جائے۔

''آپ نے درست فرمایا ستارہ بیگم! ہمارے نزدیک یہاں موجود سبھی عورتیں ہی لائق تعظیم ہیں یقیناً آپ بھی!..... لیکن آریان اور اس کی ماں کے سلسلے میں، میں صرف یہ وضاحت کروں گا کہ وہ از خود پناہ کے لیے ہمارے پاس آئی تھی۔ عزت سے جینا چاہتی ہے وہ اور اس کی ماں بھی۔ ہمیں اس نے اپنی ماں کے ماضی کے بارے میں تفصیل سے بتایا ہے ہم سب لوگوں کی مدد تو نہیں کر سکتے لیکن اس دلدل سے نکلنے کے لیے جس نے سب سے پہلے ہمارا ہاتھ پکڑا ہے اسے تو بچا سکتے ہیں تا کہ انسانیت پر اس کا اعتبار قائم رہ سکے۔'' بابر شاہ نے کہا۔

''شاہ صاحب! سب باتیں درست..... لیکن میری بات اب بھی وہی ہے میں آریان اور اس کی ماں کو کسی بھی صورت نہیں چھوڑ سکتی۔'' ستارہ بیگم اسی طرح اپنی ہٹ پر قائم تھی۔

''کیسے نہیں چھوڑ سکتیں، ہم ہر قیمت پر انہیں یہاں سے لے کر جائیں گے۔'' اظہر شاہ جو بڑی دیر سے اس طویل بحث سے جھنجھلائے بیٹھے تھے یکدم ہی چلا اٹھے۔ ستارہ بیگم کی آنکھوں میں شعلے سے دہک اٹھے۔ اس نے جلتی سلگتی ہوئی نظریں اظہر شاہ پر گاڑ دیں۔

''کیا مطلب ہے آپ کا؟..... کہنا کیا چاہتے ہیں آپ..... کون سی قیمت پر؟'' وہ برافروختہ ہوتے ہوئے بولی۔

''اظہر یار..... کیا کر رہے ہو؟ تحمل سے یار..... کیوں کیے کرائے پر پانی پھیرنے پر تل گئے ہو۔'' بابر شاہ نے اظہر شاہ کے

کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے انہیں ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

''بھائی حد ہوتی ہے کسی بات کی..... اتنی دیر سے سن رہا ہوں فضول میں جھنجھٹ پھیلائے بیٹھی ہیں یہ..... سیدھی صاف بات ہے جب وہ یہاں نہیں رہنا چاہتیں تو یہ آخر کس قانون کے تحت انہیں حبس بے جا میں رکھے ہوئے ہیں۔ یہ کیا خدا ہے جو ان کی سانسوں پر اختیار رکھتی ہیں بس اب میری برداشت سے باہر ہو گیا ہے میں دیکھتا ہوں یہ کیسے نہیں جانے دیتیں انہیں۔'' اظہر شاہ بالکل ہی آؤٹ ہو گئے تھے۔

''ہوں..... ٹھیک ہے کوشش کر دیکھیں..... یہ ستارہ بیگم کا کوٹھا ہے کسی حلوائی کی دکان نہیں جہاں بندر بانٹ شروع ہو جائے اور ذرا اس لفظ ہر قیمت کی وضاحت تو کریں۔'' وہ بڑے مطمئن انداز میں ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھی ہوئی تھی، اپنے اختیارات کی حدود جانتی تھی اسی لیے بہت پرسکون تھی۔

''ستارہ بیگم چھوڑیئے آپ انہیں..... آپ میرے منہ کو دیکھئے.....'' خاور ملک کو اظہر شاہ کا یوں معاملے کو بگاڑنا اچھا نہیں لگا تھا۔

''آپ کے منہ کو دیکھ کر ہی برداشت کر گئی ورنہ ستارہ بیگم کے سامنے اونچی زبان بولنے والا ابھی ماں کے شکم سے باہر نہیں آیا۔'' وہ آتشیں لہجے میں بولی، سلگتی ہوئی نگاہیں ہنوز اظہر شاہ کے تنے ہوئے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

''تو پھر بتائیں اظہر شاہ صاحب! کونسی قیمت پر آپ انہیں یہاں سے لے جائیں گے؟ اگر طاقت کی بات کر رہے ہیں تو اس کا امتحان بھی ہو جائے گا اور اگر دولت کی بات کر رہے ہیں نا تو آپ کی سات پشتیں بھی نیلام ہو جائیں تو ستارہ بیگم کی ملکیت میں آئی ہوئی چیز کو نہیں خرید سکتے..... ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے سامنے ٹیبل پر پڑی ڈبیہ اٹھا کر انہیں دکھائی اور بولی۔

''یہ محض ایک ڈبیہ ہے سگریٹ کی خالی ڈبیہ۔'' یہ میری ملکیت ہے اگر میں اس کی قیمت پانچ کروڑ لگا دوں تو کیا خرید سکیں گے؟ ہونہہ جانے دیجئے اظہر شاہ صاحب! یوں جذبات میں آ کر اپنا نقصان بھی مت کریں اور ہمارا وقت بھی نہ برباد کریں۔'' وہ استہزائیہ انداز میں بولی تو اظہر شاہ بھڑک اٹھے۔

''اب پھر تم اپنی سی کوشش کر دیکھو اور میں اپنی سی..... میدان چھوڑ کر بھاگوں گا نہیں لیکن تمہیں سبق ضرور سکھا جاؤں گا۔''

''اظہر یار چپ کر جاؤ..... دیکھو میں تمہارا بڑا بھائی..... بابر شاہ..... تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں خدا کے لیے خاموش ہو جاؤ۔'' بابر شاہ نے باقاعدہ ان کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔

''نہیں بھائی! یہ عورت اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہے..... غلاظت کے ڈھیر پر بیش قیمت کپڑے پہن کر بیٹھ جانے سے کیا یہ ملکہ بن گئی ہے۔ بڑی پہنچ ہے نا اس کی اسے کہیں جہاں تک جا سکتی ہے جائے۔'' اظہر شاہ کسی طور ٹھنڈے نہیں ہو رہے تھے۔ ستارہ بیگم کی آنکھوں میں بھی خون اتر آیا۔

''گھنگھرو.....'' اس نے بلند آواز میں کہا تو غلام عباس جھٹ سے دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔

''جلال حسین کو بلا کر لاؤ.....'' وہ خونی نظروں سے اظہر شاہ کو گھورتے ہوئے بولی۔ تو غلام عباس ایک ثانیے کو ماحول کا جائزہ لیکر

جلدی سے باہر نکل گیا۔

''بابر صاحب! یہ کیا ہو رہا ہے کچھ سمجھائیے انہیں..... ہم یہاں کوئی جھگڑا کرنے نہیں آئے، اچھا خاصا سلوک اور طریقے سے مسئلہ حل ہونے والا تھا۔ بیچ میں یہ کیا ہنگامہ شروع ہو گیا ہے؟'' خاور ملک ناراض سے لہجے میں بولے۔

''چاچو پلیز! کچھ دیر برداشت کریں یقیناً مسئلہ حل ہو جائیگا۔ بس اب کوئی جھگڑے والی بات نہ کیجئے گا۔'' فواد بھی بول پڑے۔

''ارے مسئلہ ہی تو حل نہیں ہو رہا، اتنی دیر سے خاموش بیٹھا یہی تو دیکھ رہا ہوں۔ نئی سے نئی بات سننے کو مل رہی ہے..... اب اپنا آپ دکھانا ہی پڑے گا۔ دیکھا نہیں محترمہ نے کرائے کے غنڈوں کو بلایا ہے ذرا ہم بھی تو دیکھیں یہ آخر ہیں کیا چیز.....'' اظہر شاہ کرخت لہجے میں بولے۔

''ستارہ بیگم! آپ ہی پلیز تھوڑا تحمل سے کام لیں۔'' خاور ملک نے کہا۔

''آخر کس لیے؟..... کیا سوچ کر انہوں نے اس طرح کی باتیں کیں؟ ستارہ بیگم کو کیا انہوں نے کوئی لاچار عورت سمجھا تھا۔ میری جگہ پر آ کر میرے سامنے بیٹھ کر اس طرح میری توہین کرنے کا حق انہیں کس نے دیا؟''

''اظہر یار اب تم خاموش رہنا۔ ہمیں بات کرنے دو اور ستارہ بیگم ان کی طرف سے میں معافی کا خواستگار ہوں۔ براہ کرم غصہ تھوک دیجئے ہم پرامن طریقے سے اس مسئلے پر بات کرتے ہیں۔'' بابر شاہ بولے۔

''میڈم! ہم آپ کی شرائط تسلیم کر کے آپ کی مرضی سے آریان اور اس کی والدہ کو یہاں سے لے جائیں گے آپ پلیز ہمیں اپنی مرضی بتائیں۔'' فواد نے کہا تو ستارہ بیگم نے ان کی طرف توجہ سے دیکھا۔

''برخوردار! تم کافی سلجھے ہوئے اور سمجھدار معلوم ہوتے ہو..... میری مرضی صرف یہ ہے کہ میں تنگی میں زندگی نہیں گزارنا چاہتی، اتنے سالوں میں جو کچھ میں نے بنایا ہے جو نام، جو شخصیت جو شہرت میں نے حاصل کی ہے وہ میں گنوانا نہیں چاہتی۔'' وہ فیصلہ کن انداز میں بولی۔

''تو کیا آپ یہ سب کچھ شوق میں کر رہی ہیں۔'' فواد نے پوچھا

''ہاں پہلے تو مجبوری تھی لیکن اب شوق سے کر رہی ہوں۔'' ستارہ بیگم نے کہا

''اس لیے کہ میں محتاج اور دست نگر ہو کر نہیں جی سکتی۔''

''اور ستارہ بیگم! اگر آپ کے اس شوق کی تکمیل کر دی جائے پھر۔'' خاور ملک بول پڑے۔

''کیا مطلب؟ میں کچھ سمجھی نہیں۔'' وہ حیرت سے بولی۔

''میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ کو ہر سہولت فراہم کر دی جائے تاکہ آپ کسی کی محتاج نہ رہیں تو کیا پھر آپ ہماری ڈیمانڈ پوری کریں گی۔'' خاور ملک کے کہنے پر ستارہ بیگم کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔

''ہوں..... اس نے پرخیال انداز میں ہنکارا بھرا۔ اسی پل غلام عباس دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔

''بڑی بائی جی! جلال حسین آ گئے ہیں..... کیا حکم ہے؟''

''نہیں گھنگھرو! ان سے کہہ دو سب ٹھیک ہے۔'' ستارہ بیگم نے ایک نظر خاموش بیٹھے اظہر شاہ پر ڈالی جن کے چہرے کے تاثرات کو کرخت تھے لیکن جانے کیا سوچ کر وہ خاموش بیٹھے تھے۔ غلام حسین نے عجیب سی نظروں سے پہلے ستارہ بیگم کی طرف اور پھر سب پر ایک نگاہ ڈالتا وہاں سے چلا گیا۔

''جی ایس پی صاحب! آپ کیا کہہ رہے تھے۔'' وہ دوبارہ ایس پی کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ ہماری بات مان جائیں۔'' خاور ملک نے کہا

''ایس پی صاحب! کیسے مان جاؤں..... آپ تو میرے ساتھ بالکل ہی دشمنی پر اتر آئے ہیں۔ ستارہ بیگم کا کوٹھا ہی ویران کرنے چلے ہیں۔ میں کیسے آپ کی مان جاؤں.....'' اس کا انداز تو نرم تھا لیکن ہٹ اپنی جگہ اسی طرح قائم تھی۔

''ستارہ بیگم! گھر آئے ہوؤں کا مان رکھا جاتا ہے اور آپ ہیں کہ ضد پر اڑی ہوئی ہیں۔'' خاور ملک کا لہجہ دوستانہ تھا۔

''یہ بھی خوب کہی آپ نے..... حضور مان دوستوں کا رکھا جاتا ہے دشمنوں کا نہیں اور آپ تو میرے ساتھ دشمنی کر رہے ہیں۔ مجھے بالکل خالی دامن، خالی ہاتھ کر کے بھکارن بنانے پر تلے ہوئے ہیں، آپ کی مان کر تو میں ذلیل و خوار ہو کر رہ جاؤں گی۔'' ستارہ بیگم انکاری انداز میں گویا تھی۔

''اور اگر کوئی ایسا حل نکالا جائے کہ آپ کی جان چھوٹ جائے..... آپ بھی عزت کی زندگی گزاریں تو.....''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے.....؟ یہ ناممکن ہے۔'' ستارہ بیگم بہت عجیب تاثرات اور عجیب کیفیات کا شکار تھی۔ وہ ایس پی خاور ملک کی بات کچھ سمجھ بھی رہی تھی اور کچھ نہیں بھی۔

''کیوں ناممکن ہے..... آپ اقرار تو کریں طریقہ ہمارے پاس ہے۔ راستہ ہم آپ کو دکھاتے ہیں۔'' خاور ملک مستعد سے ہو کر بیٹھ گئے۔ ستارہ بیگم کے نرم لہجے اور رویے نے امیدوں کے چراغ روشن کر دیئے۔

''کون سا راستہ؟'' وہ قدرے حیرت سے بولی۔

''ایک بنگلہ اور جو کچھ آپ اس پیشے سے کماتی ہیں، اس کے بدلے ایک ہی بار آپ کو اتنا دے دیا جائے کہ آپ باقی زندگی نہایت سکون کے ساتھ گزار سکیں تو کیا یہ سودا مہنگا ہوگا؟'' خاور ملک نے دولت کی جھلک دکھائی جو ہر طوائف کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔

''آپ اس کو کچھ بھی کہہ لیں بازار کی زبان یا کاروباری ڈیلنگ لیکن ہمارا مدعا صرف یہی ہے کہ ہم ان دو زندگیوں کا بھلا چاہتے ہیں۔'' خاور ملک سمجھ رہے تھے کہ بغیر چارے کے یہ شکار پھنسنے والا نہیں ہے اور اب وہ آہستہ آہستہ ٹریک پر آ رہی تھی۔

''ہوں..... تو کیا کر سکتے ہیں آپ؟'' اس کے سوال میں چھپا معنی وہاں موجود سبھی کی سمجھ میں آ گیا۔

''ستارہ بیگم ٹینڈر آپ کے ہاتھ میں ہے اور کاروباری نقطۂ نظر سے بولی لگانے کا پہلا حق آپ کا ہے۔'' خاور ملک خالصتاً

کاروباری انداز میں بولے۔

''دیکھ لیجئے گا ایس پی صاحب! میری ڈیمانڈ ہوسکتا ہے آپ پوری نہ کر پائیں۔'' ستارہ بیگم ہنوز مسکرا رہی تھی۔

''آپ ڈیمانڈ بتائیں، ڈیل بعد میں کی جائیگی، ہم بارگیننگ کے اصولوں سے ناواقف نہیں۔''

''اوکے..... پچاس لاکھ.....'' اس کے منہ سے نکلنے والے الفاظ نے اس کی توقع کے مطابق سامنے موجود سبھی افراد کو قدرے متفکر کر دیا۔

''کیوں ایس پی صاحب!''

''ستارہ بیگم! یہ رقم بہت زیادہ ہے غالباً آپ کو اندازہ نہیں کہ بابر صاحب جو بنگلہ آپ کے نام کر رہے ہیں اس وقت اس کی مالیت کم از کم چالیس لاکھ ہے۔ اس طرح تو آپ کی ڈیمانڈ کروڑ کو پہنچ رہی ہے میرا خیال ہے یہ بہت زیادہ ہے۔''

''ابھی تو اظہر شاہ صاحب کہہ رہے تھے کہ ہر قیمت پر انہیں یہاں سے لے جائیں گے اور اب محض پچاس لاکھ ان کے لیے بہت زیادہ ہو گئے۔ چلیئے پانچ لاکھ کم کر دیجئے۔''

''ستارہ بیگم یہ تو کچھ زیادہ کم نہ ہوا..... میری خاطر آپ کو کچھ رعایت کرنی چاہئے۔ میرا منہ ہی رکھ لیجئے۔'' خاور ملک نے دوسرا راستہ اپنایا۔ ستارہ بیگم مسکرا دی۔

''آخری بات چالیس لاکھ نہ ایک روپیہ کم نہ زیادہ.....''

''ستارہ بیگم آپ کی طرف سے ڈیمانڈ رکھ دی گئی۔ میں بالکل غیر جانبدار فریق ہوں۔ اب فیصلہ میں کرتا ہوں..... کیا آپ سب کے لیے قابل قبول ہوگا۔'' خاور ملک نے تائید طلب نگاہوں سے سب کی طرف دیکھا۔

''ٹھیک ہے..... جیسے آپ کہیں۔'' ستارہ بیگم دھیمی آواز میں بولی۔

''تیس لاکھ روپے کیش۔'' خاور ملک نے فیصلہ سنا دیا۔

''ایس پی صاحب! غیر جانبداری کا دعویٰ کر کے بھی آپ شاہ صاحب کی سائیڈ لے گئے بہر حال آپ کا مان رکھنا پڑیگا۔ مجھے آپ کا فیصلہ منظور ہے لیکن میری ایک شرط ہے۔''

''وہ کیا.....''

بنگلے کی ملکیت کے کاغذات اور تیس لاکھ کیش ایک ہفتہ یعنی سات دن بعد مجھے مل جانا چاہئے۔ ایک دن بھی اوپر ہو گیا تو یہ ڈیمانڈ ایک کروڑ ہو جائے گی۔'' ستارہ بیگم حتمی انداز میں بولی۔

''ہمیں منظور ہے۔'' خاور ملک کسی کے بولنے سے پہلے ہی کہہ اٹھے۔

''ان سے بھی پوچھ لیجئے۔'' ستارہ بیگم نے بابر شاہ، اظہر شاہ کی طرف اشارہ کیا۔

''ہاں ٹھیک ہے ہمیں منظور ہے، آج سولہ ستمبر ہے ٹھیک تیئس ستمبر کو سورج غروب ہونے تک آپ کو رقم اور بنگلے کی رجسٹری مل جائے گی۔'' بابر شاہ نے کہا۔

''تو پھر ٹھیک ہے اس وقت تک اس کوٹھے پر کوئی ناچ، گانا، کوئی مجرا نہیں ہوگا کیونکہ بات طے پا چکی ہے اور اب چاندنی آپ کی امانت ہے۔ آپ کی چیز ہے، پیسے دے جائیے گا اور اپنی چیز لے جائیے گا لیکن یاد رہے صرف سات دن ہیں آپ کے پاس۔ اگر آپ نہ آئے تو یہی سب کچھ دوبارہ شروع ہو جائے گا اور اس کے بعد پھر شائد یہ سب کچھ کبھی ختم نہ ہو۔''

''ایسا نہیں ہوگا۔ آپ اطمینان رکھیں، سات دن کافی ہیں ارینجمنٹ کے لیے، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں بابر صاحب۔'' خاور ملک پہلے ستارہ بیگم اور پھر بابر شاہ سے مخاطب ہوئے۔

''جی ملک صاحب۔'' بابر شاہ نے مختصراً کہا۔

''اوکے تو پھر ڈن.....'' خاور ملک نے ستارہ بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے ڈیل کا اختتام کیا۔

''ڈن.....'' ستارہ بیگم نے بھی مہر تصدیق ثبت کر دی۔ بابر شاہ، فواد، خاور ملک، کامران اور اظہر شاہ سبھی کے چہروں پر اطمینان جھلکنے لگا تھا۔

''پھر ہمیں اجازت دیجئے.....'' خاور ملک اٹھ کھڑے ہوئے۔

''آخری بات! آپ میں سے کوئی بھی چاندنی کو لینے نہیں آئے گا صرف اس لڑکے کو بھیج دیجئے گا۔'' ستارہ بیگم نے ہاتھ سے فواد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ یہی آ جائے گا۔ جانے سے پہلے ایک بات کہنا چاہوں گا ستارہ بیگم! مجھے خوشی ہے کہ آپ نے ایک اچھا فیصلہ کیا یقیناً بہت سی زندگیاں اس ایک فیصلے سے پرسکون ہو جائیں گی۔ خاور ملک نے یہ کہہ کر باہر جانے کے لیے قدم آگے بڑھا دیئے۔

''ایس پی صاحب! بہت مشکل فیصلہ ہے یہ۔ زندگی بھر کی خوشیاں اور رفاقتیں آپ کی جھولی میں ڈال دیں۔ طوائف ہوں بکنے اور بیچنے کی عادت ہے، خوشیاں بھی بیچ کر ان کی قیمت وصول کر لی۔'' وہ قدرے مضمحل دکھائی دے رہی تھی، وہ سب کمرے سے باہر نکل گئے۔

''گھنگھرو.....اے گھنگھرو.....'' ستارہ بیگم نے آواز دی۔

''جی بڑی بائی جی.....''

''ایک پٹیالہ تو بنا دے رے اور ہاں چاندنی سے کہہ دے کہ تیرے وارث آ گئے ہیں تجھے لینے۔ بدائی کی تیاری کر لے۔ اسے جا کے بتا دے کہ اب کچھ دن یہاں محفلیں نہیں ہوں گی اور کیا خبر یہاں پھر کبھی محفلیں ہوں یا نہ ہوں..... یہ کوٹھا ویران ہو گیا اے گھنگھرو..... تیری بائی جی بک گئی..... بڑی مہنگی تھی تیری بی بی.....اسے خریدتے خریدتے ستارہ بیگم خود بک گئی اے۔'' وہ تھکی تھکی آواز میں کسی تکیے سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئی۔

''بڑی بائی جی..... کیا کہہ رہی ہیں آپ..... میں کچھ سمجھا نہیں۔''

''صبر کر..... سمجھ جائے گا..... خود ہی سمجھ جائے گا۔ بس تو اتنا کام کر سازندوں کو، استاد نواب کو کہہ دے ایک ہفتے کی چھٹی ہے۔ چھمیا اور بالکو کو بھی کہہ دے کہ مجرا نہیں ہوگا اور اب جا۔'' ستارہ بیگم نے اتنا کہہ کر آنکھیں موند لیں تو غلام عباس خاموشی سے باہر نکل گیا۔

☆.....☆.....☆

مغرب کی اذان سے کچھ پہلے چاندنی بستر سے اٹھ گئی تھی۔ سفید کمخواب کا غرارہ سوٹ پہنے لمبے بالوں میں موتیے کے پھولوں کی لڑیاں گوندھے وہ بے حد خوبصورت لگ رہی تھی۔ اس عمر میں بھی اس کا حسن بے مثال تھا۔ اذانیں ہو گئیں لیکن بائی جی کی طرف سے بلاوا نہیں آیا۔ غلام عباس کسی کام سے اس کے دروازے کے سامنے سے گزرا تو اس نے پکار لیا۔

''غلام عباس۔''

''جی بی بی!'' وہ اندر آ گیا۔

''کیا بات ہے۔ بائی جی کے مہمان نہیں آئے کیا؟'' چاندنی نے پوچھا

''آ گئے ہیں بی بی.....''

''تو پھر ابھی تک بلاوا کیوں نہیں آیا۔''

''وہ بی بی! بائی جی نے منع کر دیا ہے کہ آج محفل نہیں ہوگی۔ وہ مہمانوں سے کوئی خاص بات کر رہی ہیں.....''

''کیا کوئی خطرناک قسم کے لوگ ہیں۔'' چاندنی کو آریان کی فکر پڑ گئی۔ ''کہیں پھر ستارہ بیگم اس کا سودا تو نہیں کر رہی۔''

''ارے نہیں بائی جی! وہ تو بڑے سلجھے ہوئے اور پڑھے لکھے دکھائی دے رہے ہیں۔''

''غلام عباس! کس دنیا میں رہتے ہو۔ ارے یہاں جو جتنا سلجھا ہوا دکھائی دیتا ہے، اندر سے اسی قدر حیوان ہوتا ہے۔''

''پتہ نہیں بی بی! میں کیا جانوں۔'' غلام عباس کہہ کر خاموشی سے باہر نکل گیا۔

چاندنی ستارہ بیگم کی طرف سے کھٹک گئی تھی۔ وہ ایک بار پہلے بھی اس کی بے خبری میں آریان کا سودا کر چکی تھی اور اب شائد اس نے کوئی اور موٹی آسامی پھانسی تھی۔ پتہ نہیں یہ مشکلیں یہ پریشانیاں کب ختم ہوتی تھیں۔ اذیتوں کے اس سفر میں اس کی روح تک آبلہ پا ہو چکی تھی لیکن دور تک بس کرب کا لق و دق صحرا تھا اور وہ منزل بے نام و نشان تھی اور اس کی جستجو رائیگاں لیکن اس بار وہ ستارہ بیگم کو دکھا دے گی کہ ایک ماں اپنی اولاد کے لیے کسی بھی حد سے گزر سکتی ہے۔ وہ اپنی جان دے دے گی لیکن ستارہ بیگم کو اس کے مذموم ارادوں میں کامیاب نہیں ہونے دے گی۔ بہت دیر گزر گئی تھی اردگرد کے کوٹھوں سے گھنگھروؤں کی جھنکار کی صدائیں بلند ہونے لگی تھیں لیکن ستارہ بیگم کا کوٹھا بالکل خاموش تھا۔ آج تو رقاصائیں مشق بھی نہیں کر رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے ان کے پیروں کے گھنگھرو بھی اس سناٹے سے سہم گئے تھے، جانے کتنے پل گزر گئے، چاندنی کے بالوں میں لگے ہوئے موتیے کے پھول مرجھا کر پھیکے پڑ گئے پھر دوبارہ غلام عباس کمرے میں آیا۔

''بی بی..... بڑی بائی جی کہہ رہی ہیں کہ آپ آرام کریں..... کچھ دن اب مجرا نہیں ہوگا۔''

''کیا مطلب؟ ان کی طبیعت تو ٹھیک ہے کیا اوپر سے تو کوئی حکم نہیں ہوا؟''

''نہیں بی بی! نہ اوپر سے حکم ہوا ہے اور نہ ہی وہ بیمار ہیں بس یونہی انہوں نے کہا ہے کہ ایک ہفتہ تک یہاں کوئی محفل نہیں ہوگی۔''

''کمال ہے..... ستارہ بیگم کوٹھے کے اصول سے کیسے ہٹ گئی..... بہرحال یہ بتاؤ مہمان بیٹھے ہیں یا چلے گئے.....'' چاندنی نے پوچھا۔

''ابھی ابھی گئے ہیں.....'' غلام عباس نے بتایا۔

''غلام عباس..... آج ایک بات بتاؤ.....''

''جی بی بی! پوچھیں.....''

''تمہارا استاد کون ہے جس سے تم نے سبق پڑھا ہے..... اب تو سمجھا دو۔'' چاندنی کے ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ تھی۔

''سمجھ جائیں گی بی بی! بہت تھوڑا وقت رہ گیا ہے سمجھ جائیں گی.....''

''غلام عباس سالوں گزر گئے ہیں پر میرا سوال بھی وہیں ہے اور تمہارا جواب بھی ادھورا۔ کیا تمہارے استاد نے یہی سکھایا ہے کہ اپنی بی بی کے ہر سوال کا ادھورا جواب دینا۔'' چاندنی آج جیسے اس سے اگلوانے پر تلی ہوئی تھی۔

''نہیں بی بی! استاد نے مجھے تو پورا سبق پڑھایا تھا پر نا اہل ہوں نا..... بار بار بھول جاتا ہوں..... وہ مجھے پیار سے سمجھاتا ہے تو میں اڑ جاتا ہوں اور جب ناراض ہوتا ہے تو میں بھی روٹھنے لگتا ہوں، مدت ہوگئی اسی روٹھنے، ماننے میں، پر بی بی آپ میرے استاد کو کچھ نہ کہیں جی! ادھورا تو میں خود ہوں..... اس میں بھلا میرے استاد کا کیا دوش۔'' غلام عباس کی نظریں خلا میں جمی ہوئی تھیں۔

''لیکن غلام عباس! کیا تمہارے استاد نے کبھی تم سے منہ موڑا۔''

''ہاں جی! جب میرے اندر کا غلام عباس نافرمانی پر اتر آیا تھا تو استاد نے بہت ڈانٹا تھا۔ اس نے مجھ سے منہ موڑ لیا تو مانیں میری تو دنیا اندھیر ہوگئی تھی، مجھے راتوں کو نیند نہیں آتی تھی، جن گھنگھروؤں کے ساتھ میں کھیلتا رہتا تھا، وہ بھی مجھے زہر لگنے لگتے پھر ایک دن وہ خود ہی میرے پاس آ گیا اس نے بڑے پیار سے مجھے اپنے پاس بٹھایا اور سمجھایا۔

''بیٹا غلام حسین! پھولوں کی آرزو کرنا گناہ نہیں ہوتا لیکن جب تم یہ خواہش کرو کہ ٹہنی سے توڑ کر وہ پھول ہاتھ میں لے لو اس کی خوشبو سے صرف تم ہی محظوظ ہو تو یہ خود غرضی ہے اور جہاں خود غرضی ہو وہاں ایمان نہیں ہوتا۔ اپنے اندر کے انسان کو بے لگام نہ ہونے دو اور بی بی میں استاد کی ناراضگی کی وجہ جان گیا۔ اس کے بعد میں نے اپنے اندر کے غلام عباس کو کبھی منہ نہیں لگایا۔ اس دن کے بعد پھر میرا استاد بھی مجھ سے ناراض نہیں ہوا۔'' غلام عباس ایک محویت کے عالم میں بولا۔ چاندنی کو اس وقت وہ کسی اور جہاں کا باسی نظر آیا۔

''غلام عباس! میرا دل کہتا ہے کہ تم اس جگہ کے لیے نہیں تھے..... تم یہاں کے بسنے والوں جیسے نہیں ہو۔''

''نہیں بی بی! میرا تو خمیر ہی اسی مٹی سے اٹھا ہے..... پہلا سانس یہیں لیا ہے میں نے۔ پر اب لگتا ہے استاد مجھے یہاں نہیں

رہنے دے گا۔ وہ مجھے یہاں سے بہت دور جانے کو کہتا ہے۔ پر ابھی میرے پیروں میں بیڑیاں ہیں جس دن یہ بیڑیاں کٹ گئیں میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔'' غلام عباس بات ختم کر کے کمرے سے نکل گیا اور چاندنی حیرت سے کھلے دروازے کو دیکھنے لگی جہاں سے ابھی ابھی وہ باہر گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

گاڑی راولپنڈی کی حدود میں داخل ہوگئی، ڈرائیونگ کے فرائض فواد سرانجام دے رہے تھے۔

''شاہ صاحب! آپ کا مسئلہ تو حل ہوگیا۔ میرا خیال ہے کہ اب آپ کو میری مزید مدد کی تو ضرورت نہیں ہوگی اور ان دو آدمیوں کے بارے میں بھی بتا دیجئے کہ ان کا کیا کرنا ہے۔'' ایس پی کامران بابر شاہ سے بولے۔

''بہت بہت شکریہ ملک صاحب! آپ کی بدولت ایک بہت بڑا مسئلہ خوش اسلوبی سے حل ہوگیا حالانکہ اظہر صاحب تو گڑبڑ کر چلے تھے.....'' کامران نے مسکراتے ہوئے کہا تو بابر شاہ بھی مسکرا دیئے۔

''فواد میاں مجھے لیاقت باغ روڈ پر اتار دینا ایک دو کام نمٹانے ہیں۔'' کامران نے کہا۔

''انکل! آفس یا گھر نہ ڈراپ کر دوں آپ کو؟'' فواد نے پوچھا۔

''نہیں میں گاڑی منگوا لوں گا موبائل ہے میرے پاس! آپ لوگ بھی کافی تھکے ہوئے ہوں گے۔ آرام کریں جا کر.....ابھی ایک مسئلہ نمٹا ہے ایک بہت بڑا چیلنج آپ کے سامنے ہے۔'' گاڑی لیاقت باغ روڈ سے گزر رہی تھی۔ ایک جگہ گاڑی روک کر فواد نے ایس پی کامران ملک کو نیچے اتارا۔

''ایک بار پھر بہت بہت شکریہ ملک صاحب! اور ان دونوں کو بھی چھوڑ دیں۔ بابر شاہ نے کہا۔

''شاہ صاحب! تکلیف جانے دیں۔ ہمارے آپس میں کچھ ایسے گئے گزرے تعلقات بھی نہیں اور وہ دونوں بھی آزاد کر دیں۔ کامران ملک نے شیشے کے قریب منہ لے جا کر بابر شاہ سے کہا اور خدا حافظ کہہ کر پیچھے ہٹ گئے۔

حقیقتاً اس تمام وقت میں ان دونوں ایس پیز کزنز کی کاوشیں قابل ذکر تھیں۔ فواد بھی ان تین دنوں میں شدید اعصابی دباؤ کا شکار رہنے کی وجہ سے عجیب سی تھکاوٹ کا شکار تھے۔ گاڑی سادات نگر کے گیٹ سے اندر آئی تو شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ سادات نگر روشنیوں سے منور تھا اور اس وقت لان بالکل خالی تھا یقیناً سب ہی اپنے اپنے پورشنز میں تھے۔ گاڑی سے اتر کر وہ اماں بی کے کمرے کی طرف بڑھے اسی وقت انیقہ کسی کام سے باہر نکلی، ان تینوں پر نظر پڑتے ہی وہ مارے خوشی کے چلا اٹھی۔

''ماما.....اینی آپی.....چاچو آ گئے۔'' اور پھر کیا تھا ان کے اماں بی کے کمرے تک پہنچتے پہنچتے گھر کے سبھی افراد بھی وہیں آ گئے تھے۔ اماں بی بستر پر نیم دراز تسبیح میں مصروف تھیں۔ بابر شاہ اور اظہر شاہ کو ایک ساتھ کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ اٹھ بیٹھیں۔

''بسم اللہ! آ گئے میرے بچے۔ اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔'' اماں بی نے کہا۔ بابر شاہ اظہر شاہ اور پھر فواد نے اماں بی کے سامنے

سر کر کے ان کا پیار اور دعائیں لیں۔ کمرا بھانت بھانت کی آوازوں سے بھرنے لگا۔

''فہدی بھائی! آپ ٹھیک تو ہیں ناں..... ہم سب بہت پریشان تھے۔ یہ اپنی آپی بھی بہت پریشان تھیں۔'' انیقہ نے خصوصی طور پر کچھ گھبرائی، سہمی سمٹائی، امید و بیم کی کیفیت میں گرفتار آریان کے بارے میں کہا۔ فواد نے اس کی طرف دیکھا تو وہ انہی کی طرف متوجہ تھی۔ فواد نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک تشفی آمیز اشارہ سا کیا۔

''یار کیا ہے بیٹھنے تو دو..... کم سے کم..... سانس تو لینے دو۔'' بابر شاہ کچھ گھبرا کر بولے تو یکدم کچھ افراد نے ایک طرف ہٹ کر اماں بی کے بیڈ پر ان کے بیٹھنے کے لیے جگہ بنائی۔

''توبہ کتنی پریشانی ہو رہی تھی۔ شکر ہے خیر خیریت سے آ گئے۔ میں تو اظہر کی طرف سے فکر مند تھی۔''

''کیوں! میں کیا فیڈر میں دودھ پیتا ہوں۔'' فیضی چچی کی بات پر اظہر چچا ناگواری سے بولے۔

''یار پہلے مسئلے کا سوچو..... اظہر وہ چوہدری اسرار اب بھی ہینو خریدنے کو تیار ہو جائے گا۔

''کونسی والی 7264۔''

''اٹھارہ لاکھ دے رہا تھا وہ کیش..... پر شاکر نے کہہ دیا کہ بائیس لاکھ ہونے چاہئیں۔'' اظہر شاہ نے بتایا۔

''میرا خیال ہے اس سے بات کر لو اگر اب بھی خریدنے کو تیار ہو تو اٹھارہ میں ہی بیچ ڈالو اور ہاں مری روڈ پر جو میرا پلاٹ ہے وہ بھی کم از کم بیس لاکھ میں تو نکل ہی جائیگا۔ پہلی فرصت میں کسی پراپرٹی ڈیلر سے بات کرو ایک ہفتہ بہت کم ہے۔'' بابر شاہ، اظہر کو تفصیل سمجھاتے ہوئے بولے۔

''ارے کچھ ہمیں بھی تو پتہ چلے کیا کھچڑی پک رہی ہے۔'' زاہدہ چچی آگے کو جھک کر بابر چچا کی باتیں سننے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''بابر مسئلے کا بتاؤ کیا بنا؟ حل ہوا یا نہیں.....'' شینا پھپھو نے پوچھا۔

''شینا آپی! مسئلہ سمجھیں حل ہو گیا ہے۔ اس عورت نے تیس لاکھ روپے کی ڈیمانڈ کی ہے۔ بس رقم اکٹھی کرنے میں ایک دو جھنجھٹیں ہیں۔ آپ دعا کریں۔'' بابر شاہ کچھ پرسکون لہجے میں بولے۔ اسی وقت ان کی نظر آریان پر پڑی جو ایک طرف خاموش کھڑی تھی۔ وہ اٹھ کر اس کے قریب چلے آئے اور محبت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

''آریان بیٹا! پریشان مت ہونا، بہت جلد تم اور تمہاری امی ایک دوسرے سے ملیں گی، صرف ایک ہفتہ بعد وہ تمہارے پاس ہوں گی، تم اب اس گھر کو اپنا گھر سمجھ کر رہو، کچھ بھی سوچنے کی ضرورت نہیں، یہ گھر جس طرح مہوش، انیقہ اور روبیہ کا ہے بالکل ویسے ہی تمہارا بھی ہے۔ یوں سمجھو اب کوئی فکر نہیں رہی، اذیت کی رات کٹ گئی ہے۔'' بابر چچا کی پر شفقت باتوں پر آریان کی پلکیں نم ہونے لگیں۔

''کیا یہ حقیقت ہے یا کوئی خواب۔ کیا وہ محفوظ ہو گئی، کیا اس کی امی بھی اس عقوبت خانے سے نجات پا لیں گی..... یہ سب کچھ اسے بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔ اس نے جھلملاتی نظروں سے پہلے بابر شاہ اور پھر فواد کی طرف دیکھا۔ جن کی نظروں میں محبت کے دیئے روشن تھے۔

''ارے بیٹا! یہ تو بتایا ہی نہیں کہ کیسے مانی وہ.....'' اماں بی نے بابر چچا سے پوچھا۔

''بہت مشکل سے اماں بی.....وہ تو مان ہی نہیں رہی تھی.....اتنی مشکل سے منایا اسے۔''

''ارے خاک منایا جیب سے دے کر منایا تو کیا منایا۔ مجھے بولنے دیتے میں دیکھتا کیسے نہیں مانتی۔'' اظہر چچا بولے۔

''رہنے دو تم تو آریان بیٹا اور اس کی امی کے ساتھ ساتھ ہمارا بھی بھٹا بٹھانے والے تھے۔ تمہاری سلطان راہی والی بڑھکوں نے سب کی مٹی پلید کروا دینی تھی۔'' بابر شاہ نے مسکرا کر کہا۔

''اب ایسی بھی طاقتور عورت نہیں تھی وہ۔ بس آپ کا منہ مار گیا مجھے ورنہ دیکھ لیتا میں اسے کتنے پانی میں تھی وہ اور وہ اس کے پالتو غنڈے۔'' اظہر چچا بولے۔

''یعنی ہمارا خدشہ درست تھا انہوں نے وہاں جا کر فساد کیا نا.....اماں بی میں ٹھیک ہی پریشان ہو رہی تھی۔'' فیضی چچی بسورتے ہوئے بولیں۔

''تمہاری یہی عادت مجھے اچھی نہیں لگتی، فضول کے شکوک وشبہات میں پھنسی رہتی ہو اور خدا کے واسطے کوئی چائے کا کپ پلا دو۔ تھکے ہوئے آئے ہیں سفر سے پر کسی کو ذرا خیال نہیں۔'' اظہر چچا مصنوعی ناراضگی سے بولے۔

''میں لاتی ہوں چائے.....'' شینا پھپھو باہر چلی گئیں۔

''کیا بات ہے بھابھی مقسوم دکھائی نہیں دے رہیں۔'' بابر چچا نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''بھائی آیا تھا اس کا زوار دو تین دن کے لیے لے گیا ہے اسے۔'' اماں جی نے بتایا۔ سبھی آپس میں خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ خاص طور پر بابر چچا اور فواد کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کئی من بوجھ ان کے سینے پر سے سرک گیا تھا اور آریان کے لیے بھی یہ لمحے بہت خوش کن تھے۔ آزادی کے احساس نے اس کے وجود کے اندر ایک نئی روح پھونک دی تھی۔

☆.....☆.....☆

آنے والے چار پانچ دن بہت مصروفیت کے تھے۔ فواد کلینک کی طرف سے بالکل بے نیاز ہو کر رقم کا بندوبست کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ فرجاد ملک ان گزرے دنوں میں بالکل گوشہ نشین تھا۔ کبھی کبھار لان کے کسی گوشے میں بیٹھا دکھائی دیتا تو سارے بچے اسے گھیر لیتے۔ اس کے اردگرد بیٹھ کر گپیں لگاتے۔ کہانیاں سنتے۔ وہ بھی بچوں کے درمیان کچھ لمحے خوشگوار گزار لیتا۔ زیادہ تر اپنے کمرے میں ہی رہتا۔ فواد نے بھی اسے زیادہ ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ وہ ٹھیک ہو رہا تھا اس لیے اس کا تنہا بیٹھ کر اپنی یادوں کو کھنگالنا ضروری تھا۔

آج ستارہ بیگم کا دیا ہوا وقت پورا ہو رہا تھا، رقم کا بندوبست ہو چکا تھا، صبح کے نو بج رہے تھے جب بابر چچا فواد کے ہمراہ اماں بی کے کمرے میں آئے۔ اماں بی ہاتھ میں کوئی وظائف کی کتاب لیے پڑھنے میں مشغول تھیں جبکہ آریان اور شینا پھپھو ان کے کمرے کی جھاڑ پونچھ میں لگی ہوئی تھیں۔

''اماں بی! فہدی جا رہا ہے، دعا کیجئے گا۔'' بابر چچا نے انہیں مخاطب کیا تو انہوں نے کتاب پر سے نگاہیں ہٹا کر ان کی طرف دیکھا۔ فواد نے اپنا سر ان کے آگے کیا تو انہوں نے کتاب ایک طرف رکھ کر دونوں ہاتھوں میں ان کا چہرہ تھام لیا، پیشانی پر کپکپاتے ہونٹ رکھے اور پھر ہٹا لیے۔

''اللہ کی امان میں جاؤ میرے بچے! خدا تمہیں کامیاب کرے۔'' ان کے ہونٹوں سے دعا نکلی۔

''اچھا پھپھو! اجازت۔'' وہ شینا پھپھو کی طرف پلٹے تو انہوں نے بھی آگے بڑھ کر انہیں پیار کیا۔ آریان خاموش نگاہوں سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''یہ بنگلے کی رجسٹری اور یہ رہا تیس لاکھ روپیہ بہت احتیاط سے جانا۔'' بابر چچا نے ایک بیگ اور ایک فائل ان کے ہاتھ میں تھما دی اور پھر ان کے ساتھ چلتے ہوئے باہر نکل آئے۔ آریان بھی تیزی سے پیچھے لپکی۔ بابر شاہ فواد کو گاڑی تک چھوڑ کر پلٹ گئے تو آریان ہمت کر کے آگے بڑھی۔ فواد اس کے انتظار میں گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑے تھے وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ان کے قریب چلی آئی۔

''اینی! کیا تم کچھ نہیں کہو گی.....'' فواد پہلی بار بے تکلفی سے مخاطب ہوئے۔

''میں.....میں انتظار کروں گی.....'' وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔

''کس کا.....'' لہجے کی طرح نظریں بھی شوخی سے اس کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔

''امی کا.....'' وہ ایک لمحے کو رک گئی.....''اور.....اور آپ کا بھی۔'' یہ کہہ کر وہ رکی نہیں تیزی سے اندر کی طرف بھاگ گئی۔ فواد کی نظریں بھاگتی ہوئی آریان کی لہراتی سیاہ چوٹی پر ٹکی ہوئی تھیں اور ہونٹوں پر ایک دلآویز مسکراہٹ تھی۔ وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئے، انہیں بائی روڈ جانا تھا اس لیے وقت کم تھا۔ گاڑی مناسب رفتار سے چل رہی تھی اور فواد گزشتہ چند ماہ کے بارے میں سوچ رہے تھے کہ زندگی اتفاقات کا ایک بحر بیکراں ہیں جس لڑکی کو کچھ عرصہ قبل تک انہوں نے دیکھا بھی نہیں تھا۔ آج محض اس کی خاطر وہ سب کچھ کر گزرنے کو تیار تھے۔ ان چند ماہ میں پے در پے اتنے عجیب واقعات ہوئے تھے کہ وہ جتنا سوچتے حیران ہوتے جا رہے تھے۔

سورج غروب ہونے سے کچھ دیر پہلے وہ لاہور پہنچ گئے۔ شاہی محلہ کے باہر گاڑی کھڑی کر کے انہوں نے وہ بیگ اور کاغذات کی فائل ہاتھوں میں تھامی اور گاڑی کا دروازہ لاک کر کے باہر نکل آئے، ان کے قدموں میں محسوس کی جانے والی تیزی تھی۔ سرخ لکڑی کا جالی دار دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ وہ ایک ہی سانس میں زینہ طے کر گئے۔ منقش دروازہ بھی کھلا ہوا تھا جیسے کسی کے انتظار میں جان بوجھ کر کھلا چھوڑ رکھا ہو۔ وہ اندر داخل ہو گئے۔ لاؤنج کی دیدہ زیب سجاوٹ ویسی کی ویسی تھی لیکن انہیں اندر داخل ہوتے ہی ماحول پر طاری یاسیت فوراً محسوس ہو گئی۔ ایک طرف صوفے پر ستارہ بیگم بڑے بے ترتیب سے حلیے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ شکن آلود لباس، بے ترتیب بال اور نیم خوابیدہ آنکھیں۔ اس نے کھٹکے کی آواز پر سامنے میز پر رکھے ہوئے جام پر سے نگاہیں اٹھا کر ان کی طرف دیکھا ایک پھیکی سی مسکراہٹ اس کے سرخی مائل ہونٹوں پر جلوہ فگن ہوئی۔

''آؤ..... جوان..... آؤ۔ میں جانتی تھی تم ضرور آؤ گے..... بڑے وقت کے پابند ہو نہ ایک لمحہ ادھر نہ ایک ادھر..... ستارہ بیگم نے ان سات دنوں میں زندگی جی لی۔ پتہ نہیں کیوں ایسا لگتا ہے جیسے وجود کا کوئی حصہ کھو گیا ہے۔'' اس کی آواز لڑکھڑا رہی تھی یقیناً اس وقت وہ نشے بھی تھی۔ فواد نے آگے بڑھ کر فائل اور بیگ اس کے سامنے ٹیبل پر رکھ دیا۔

''میڈم یہ بنگلے کی رجسٹری اور ملکیت کے کاغذات اور یہ بیگ میں پورے تیس لاکھ، سورج ڈوبنے سے پہلے پہلے آپ کی ڈیمانڈ پوری ہو چکی ہے، اب آپ بھی اپنا وعدہ پورا کیجیے۔'' فواد سلجھے ہوئے انداز میں بولے۔

''گھنگھرو..... ادھر آرے'' ستارہ بیگم کی آواز پر غلام عباس تیزی سے آتا دکھائی دیا۔

''جا رے..... چاندنی سے کہہ تیرے وارث آ گئے تجھے لینے..... ارے کیسی بھاگیہ وان ہے مان بھرے رشتوں کا ساتھ مل گیا اسے۔ پر ٹھہر..... ایک منٹ ٹھہر..... ہمیشہ تو جاتا ہے نا اسے بلانے پر آج آخری بار میں جاتی ہوں اس کے پاس۔ آؤ برخوردار۔'' وہ پہلے غلام عباس سے اور پھر فواد سے مخاطب ہوئی پھر صوفے سے اٹھی تو اس کی چال میں واضح لڑکھڑاہٹ تھی۔ وہ بہت آہستہ روی سے چلتی ایک کمرے میں داخل ہوئی تو فواد اور غلام عباس بھی اس کے ہمراہ اندر داخل ہو گئے۔

''ری چاندنی..... ارے خوش بخش دیکھ تو کون آیا ہے۔'' چاندنی سنگھار میز کے آئینے کے سامنے بیٹھی بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔

''کون ہے بائی جی!'' چاندنی نے پلٹ کر دروازے میں کھڑے اس سلجھے ہوئے سوٹڈ بوٹڈ جوان کو دیکھا جو اس سے پہلے کبھی اس نے یہاں نہیں دیکھا تھا۔

''ارے تیرے وارثوں میں سے ہے۔ تجھے لینے آیا ہے ری، تجھے اس کے ساتھ جانا ہے۔''

''کیا مطلب بائی جی؟ کہاں جانا ہے مجھے.....؟ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟''

''ارے گھنگھرو تو نے اسے کچھ نہیں بتایا رے؟''

''نہیں بڑی بائی جی! میں نے کچھ نہیں بتایا۔ اس لیے کہ اس وقت پتہ نہیں تھا کہ یہ کامیاب بھی ہو سکیں گے یا نہیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ سات دن تک امید کا ہاتھ تھام کر چلتے چلتے بی بی ناامیدی کی ٹھوکر کھا جائیں، بہت تکلیف ہوتی ہے ایسے۔''

''ارے گھنگھرو تیری بھی ہر بات نرالی ہے رے۔ چل پھر اب بتا اس کو..... دیکھ کیسے آنکھیں پھاڑے دیکھ رہی ہے میری طرف۔'' ستارہ بیگم پھیکی سی ہنسی ہنس کر بولی۔

''بی بی یہ فواد صاحب ہیں..... انہی کے گھر میں آریان نے پناہ لی تھی اور اس دن یہی آئے ہوئے تھے بڑی بائی جی کے پاس ..... اور آج بڑی بائی جی کی ڈیمانڈ پوری کر کے یہ آپ کو لینے آئے ہیں۔''

''میں اب بھی کچھ نہیں سمجھ پا رہی.....''

''میں آپ کو سمجھاتا ہوں.....'' ستارہ بیگم کے ساتھ آنے والا نوجوان آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ آریان ہمارے گھر میں ہے، گھر

کے ایک فرد کی حیثیت سے اور اب آپ بھی میرے ساتھ چلیں گی۔"

"بائی جی! کیا یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں....." چاندنی متحیر سی ستارہ بیگم کی طرف پلٹ کر بولی۔

"ہاں یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں چاندنی.....ارے تو تو نصیبوں والی ہے کہ تیرے سر پر کوئی آنچل دینے والا ہے، کوئی اپنے گھر میں تجھے مان سمان کے ساتھ لے جانے والا ہے۔ تیرے آنے کے بعد میرے کوٹھے کے مقدر سنورے تھے اور اب جاتے جاتے بھی تو میری خواہشوں کی گود بھر کے جا رہی ہے۔ صرف ایک تیرے وجود سے میں نے زندگی کے اتنے سال سکھ پایا۔ جا چاندنی اس کوٹھے کے مقدر میں اندھیرے لکھ جا۔ اس گھر میں جا کے روشنی پھیلا جہاں تیرے وجود کو اعتبار اور محبت بخشی جائے....." ستارہ بیگم اتنا کہہ کر باہر نکل گئی تو فواد نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ تھام لیے۔

"میرے ابو نے آپ کو بہن کہا ہے کیا اس ناطے میں آپ کو پھپھو کہہ سکتا ہوں۔" فواد کے منہ سے یہ مان بھرا لفظ سن کر چاندنی کی پلکیں بھیگ گئیں۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"پھپھو! ابو خود آپ کو لینے کے لیے آتے لیکن ستارہ بیگم نے انہیں منع کر دیا، صرف مجھے آنے کی اجازت ملی وہ سب بہت بے چینی سے آپ کے منتظر ہیں خاص طور پر آریان۔" آریان کا نام لیتے ہوئے ان کے ہونٹ خود بخود مسکرا اٹھے۔

"چلیے پھپھو....." چاندنی کے لیے یہ مژدہ جانفزا تھا، اسے رہائی مل رہی تھی۔ زندگی کی اس رائیگاں مسافت کو منزل نصیب ہونے والی تھی۔ اس نے ایک نظر اپنے آپ پر ڈالی، شکن آلود لباس پر اچھی طرح چادر اوڑھی اور ان کے ساتھ باہر نکل آئی۔ ستارہ بیگم لاؤنج میں ہی بیٹھی ہوئی تھی۔

"چاندنی.....اپنے ہاتھوں سے ساری بتیاں تو بجھا دیتی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ روشنی کو دیکھ کر میں پھر بھٹک جاؤں۔ اب میرا سفر بھی تو ختم ہونا چاہیے، بہت عرصہ گزر گیا ستارہ بیگم کو لوگوں کے دلوں پر راج کرتے، اب گمنامی چاہتی ہوں۔"

چاندنی ستارہ بیگم کی بات سن کر اس کے قریب چلی آئی۔ "بائی جی کیا میں چلی جاؤں۔" وہ بے یقینی سے بولی۔

"ہاں ری جانا تو ہے تجھے۔"

"بھائی جی! کیا مجھے جانے کی اجازت ہے۔" چاندنی نے دوبارہ پوچھا۔

"جاؤ چاندنی! اوپر والے نے تمہاری زندگی سہل کر دی، تمہارے لیے دعا کروں گی۔" ستارہ بیگم نے کہا تو چاندنی نے فواد کے ساتھ قدم آگے بڑھائے پھر کچھ سوچ کر ذرا فاصلے پر کھڑے غلام عباس کی طرف بڑھی۔

"غلام عباس! تم بھی چلو گے نا میرے ساتھ۔"

"نہیں بی بی! ہمارا سنگ یہیں تک تھا۔ آگے تو راستے بھی جدا ہیں اور منزلیں بھی۔ میری منزل بڑی دور ہے۔ استاد کہتا ہے چشمے کو سامنے دیکھ کر پیاس بجھا لو گے تو جستجو ختم ہو جائے گی۔ چشمے کو دیکھ کر پیاسے ہی آگے بڑھ جاؤ اور پیاسا غلام حسین چشمے کو چھوڑ کر آگے

بڑھنا چاہتا ہے بی بی۔ جستجو کرنی ہے کچھ ڈھونڈنا ہے۔"

"غلام عباس! آج تو بتا ہی دو کہ تمہارا استاد کون ہے!"

"بی بی! کیوں بار بار یہ سوال پوچھتی ہیں..... جو شکر کہ وہ آپ کا استاد نہ ہوا۔ جائیں آپ کی منزل آپ کا انتظار کر رہی ہے۔ رانی بیٹا کا بہت خیال رکھئے گا۔ زندگی سے مہلت ملی تو اس سے ملنے ضرور آؤں گا۔" غلام عباس نے سر جھکا لیا۔ چاندنی فواد کے ہمراہ باہر نکل گئی، دہلیز پر بکھرے ہوئے پھول اس کے پیروں کے نیچے آ کر چرمرا گئے۔

"گھنگھرو! تو کہاں جا رہا ہے رے..... کیا تو بھی مجھے چھوڑ جائے گا۔"

"بڑی بائی جی! بہت عرصہ گزر گیا ماں کا حکم مانتے ہوئے! اب استاد کا حکم ماننے کی باری آئی ہے، میں یہاں نہیں رک سکتا۔ بڑی بائی جی! مجھے بھی اجازت دیجئے۔" غلام عباس نے دونوں ہاتھ باندھ کر التجا کرنے والے انداز میں کہا اور پھر پلٹ کر دروازے سے باہر نکل گیا۔

ستارہ بیگم کی پتھر آنکھ سے شائد پہلی بار آنسو نکلا اور اس کے گال سے ہوتا ہوا گریبان میں غائب ہو گیا۔ پہلی بار تنہائی نے اس کے دل پر دستک دی تھی اور آج وہ اسی تنہائی میں خود کو تلاش کر رہی تھی۔ اس کی نگاہیں پھولوں کی ان مسلی ہوئی پتیوں پر ٹکی ہوئی تھیں جنہیں چند لمحے پہلے چاندنی اور پھر غلام عباس کے پیروں نے کچلا تھا۔

☆.....☆.....☆

راولپنڈی کی مصروف ترین شاہراہ پر گاڑی کی رفتار خود بخود ہلکی پڑ گئی۔ چاندنی کی نگاہیں آزاد، بے فکر چہروں کو بہت حسرت سے دیکھ رہی تھیں۔

"پھپھو..... آپ کیسا محسوس کر رہی ہیں۔" فواد نے پوچھا۔

"پتہ نہیں بیٹا! اس وقت تو مجھے اپنے محسوسات کا کچھ پتہ نہیں۔ ایک عجیب بے یقینی کی سی کیفیت ہے۔ گھٹن زدہ ماحول میں زندگی کے اتنے سال گزارنے کے بعد کھلی آب و ہوا نے حواس سلب کر لیے ہیں۔" چاندنی کا لہجہ سوگوار اور دھیما تھا۔

"پھپھو جس طرح آپ نے آریان کو اس ماحول سے دور رکھا۔ آپ خود بھی تو کوشش کر سکتی تھیں۔"

"نہیں..... میں ستارہ بیگم کی خریدی ہوئی چیز تھی۔ اس کی مرضی کے بغیر سانس بھی نہیں لے سکتی تھیں لیکن آریان اس کی ملکیت نہیں تھی، اس کی تربیت میں نے اپنی مرضی سے کی اور اس میں غلام عباس نے میرا بھرپور ساتھ دیا لیکن بیٹا! اس سب کے باوجود میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ اس دنیا کے لوگ ہمیں کبھی قبول نہیں کریں گے، تمہارے ابو کی بڑائی ہے یہ کہ انہوں نے ایک حرماں نصیب، تہی داماں عورت کو بہن جیسے پاکیزہ رشتے سے نوازا لیکن لوگ تمہارا جینا بھی حرام کر دینگے۔ آریان کو بھی کسی اچھے گھر اور اچھے خاندان کے لوگ قبول نہیں کرینگے۔"

"نہیں پھپھو! آپ ذہن سے سب خدشات نکال دیں۔ ابو نے دل سے آپ کو بہن کہا ہے اور وہ ہمیشہ ایک بھائی کی حیثیت

سے ہی آپ کا خیال رکھیں گے اور جہاں تک آریان کی بات ہے تو کچھ دن پہلے میرے ابو اور بڑی اماں کے درمیان اس مسئلے پر گفتگو ہو چکی ہے۔ بڑی اماں نے آپ کی آمد تک کے لیے پروگرام ملتوی کر دیا تھا کہ آپ آ جائیں تو آپ کی مرضی اور رائے سے میرا اور آریان کا رشتہ طے کر دیا جائے۔'' فواد بڑی بے تکلفی سے بولے۔ یقیناً چاندنی کی نرم خو طبیعت سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔ چاندنی ان کی بات پر مسکرا کر گاڑی کے شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔ جانے پہچانے راستوں پر اس کی نگاہیں پھسل رہی تھیں۔ گاڑی ایک بہت بڑے گیٹ کے سامنے روک کر فواد نے ہارن دیا۔

''یہ..... یہ.....'' اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن زبان نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ فواد کی بھرپور توجہ سامنے تھی، گیٹ کھل چکا تھا، گاڑی آہستہ آہستہ رینگتی ہوئی سادات نگر کے اندر داخل ہو گئی۔ رات کے گیارہ بجے رہے تھے لیکن سادات نگر میں تو جیسے دن نکلا ہوا تھا۔ انہوں نے گاڑی پورچ میں روک کر لان کی طرف دیکھا، گھر کے سبھی افراد وہاں موجود تھے۔ حتیٰ کہ اماں بی بھی جو اس وقت سو چکی ہوتی تھیں، سب کے ہاتھوں میں پھولوں کی پلیٹیں تھیں جو یقیناً چاندنی کے استقبال کے لیے تھیں۔

''دیکھا پھپھو! میں نہ کہتا تھا کہ سب بہت شدت سے آپ کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ دیکھئے آپ کے استقبال کے لیے سب کے ہاتھوں میں پھول ہیں۔ سادات نگر میں کتنی روشنی ہے۔'' فواد نے کہا لیکن وہ تو اس وقت کسی سکتے کی سی کیفیت میں سامنے ہنستے بولتے، کھلتے مہکتے چہروں کو دیکھ رہی تھی۔ روشنیوں میں نہائے ہوئے یہ محبت سے لبریز اپنائیت چہرے کس قدر خوبصورت دکھائی دے رہے تھے۔ فواد گاڑی سے اتر کر لان کی طرف بڑھے پھر جیسے کچھ یاد آنے پر پلٹے۔ وہ ابھی تک گاڑی میں ہی بیٹھی ہوئی تھی۔

''آیئے پھپھو.....'' انہوں نے دروازہ کھول کر اسے باہر آنے کو کہا لیکن اس کے وجود میں کوئی حرکت پیدا نہ ہوئی۔ وہ کسی سنگی مجسمے کی طرح ساکت نظروں سے سامنے دیکھے جا رہی تھی۔

''آیئے نا پھپھو..... آیئے۔'' فواد نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور اسے گاڑی سے باہر نکلنے میں مدد دی۔ آریان بے قراری سے آگے بڑھی لیکن پھر کچھ سوچ کر رک گئی۔ فواد اس کا ہاتھ تھامے نیم اندھیرے میں سے یکدم روشنیوں میں آئے تھے اور اس کے روشنی میں آتے ہی جیسے وقت کی رفتار تھم گئی تھی۔ اماں بی کے ہاتھ سے پھولوں کی پلیٹ نیچے جا گری۔ ایک سکوت اور مہیب سناٹا ماحول پر محیط ہو گیا۔ سب کے قدم یوں زمین میں گڑ گئے جیسے کسی ساحر نے سحر پھونک کر سب کو پتھر بنا دیا ہو۔ اگر ان کے وجودوں میں زندگی کے کوئی آثار تھے تو وہ صرف خوابیدہ سینوں میں دھڑکنوں کا ارتعاش تھا جو ان کے زندہ ہونے کا ثبوت تھا۔

بچے اپنے بڑوں کی اس عجیب و غریب کیفیت سے ہکے بکے نظر آ رہے تھے اور آریان الگ اپنی جگہ ساکت کھڑی کبھی چاندنی کو اور کبھی سادات نگر کے مکینوں کو دیکھے جا رہی تھی اور سادات نگر کے مکینوں کی حالت جیسے دگرگوں تھی، دماغوں میں آندھیوں کے جھکڑ سے چل رہے تھے ان کے سینوں کے اندر گویا تلاطم برپا تھے اور وجود جیسے زلزلوں کی زد میں تھے، سب کی نظریں اس کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں۔

''مسر..... مسرت.....'' فضا میں تنا ہوا سکوت ایک چھناکے سے ٹوٹ گیا۔ بالکل ایسے ہی جیسے بلندی سے شیشہ زمین پر گرے

اور ایک چھناکے سے چکنا چور ہو جائے۔ اسی طرح شینا پھپھو کی آواز نے جیسے مہیب سناٹے کی چادر چیر کر رکھ دی۔ اماں بی نے لڑکھڑا کر لان چیئر کا سہارا لیا۔ ان کی بوڑھی آنکھوں میں شناسائی کے ساتھ ہی کرب واذیت کا ایک بحر بیکراں ہلکورے لے رہا تھا۔ وہ سب اسی طرح کھڑے تھے کہ اظہر شاہ اور بابر شاہ تیزی سے آگے بڑھے۔ انہیں اپنی طرف آتا دیکھ کر مسرت جہاں یوں خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹی جیسے وہ اسے فنا کر ڈالیں گے۔ جیسے اسے مذبح خانے لے جایا جانے والا ہو۔

''نہیں..... میں..... نہیں..... میں..... خود..... نہیں..... آ..... آ..... پ..... میں..... نہیں..... آئی..... آپ..... آپ لے..... لے کر..... آپ۔'' وہ پیچھے ہٹتے ہوئے بے ربط انداز میں بولیں۔

''مسرت جہاں..... ٹھہرو.....'' بابر شاہ اس کی کیفیت سے گھبرا کر بولے۔

''نہیں..... نن..... نہیں..... میں.....''

''مسرت جہاں ٹھہرو..... رک جاؤ.....'' بابر شاہ نے تیزی سے آگے بڑھ کر انہیں کندھوں سے تھام لیا۔

''مم..... میں سچ..... سچ کہہ رہی ہوں..... میں نہیں..... آئی..... آپ..... خود.....'' وہ عجیب ہذیانی انداز میں بولیں۔

''ہمیں پتہ ہے تم خود نہیں آئیں..... ہم لے کر آئے ہیں تمہیں..... ہوش کرو مسرت جہاں.....''

لیکن ان پر تو جیسے ہیجان طاری تھا وہ پیچھے ہٹتے ہٹتے گیٹ کے قریب پہنچ چکی تھیں اور مسلسل خود کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے ہذیانی انداز میں چیخ رہی تھی۔ اظہر شاہ اور بابر شاہ انہیں بازوؤں میں سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے گزرے ہوئے ماہ وسال میں جتنا کرب، جتنی اذیت اور دکھ سہتی رہی تھیں اس دھچکے سے ان کے وجود کے اندر متلاطم ہو گیا تھا اور باہر نکلنے کے لیے ان کے ناتواں وجود کا حصار توڑنے کے لیے سر ٹکرانے لگا تھا۔

''مسرتی..... تم آ گئی..... اچھا ہوا کیونکہ تم نے یہیں آنا تھا۔ تمہاری جگہ یہیں تھی۔ ہمیں معاف کرو دو زیادتی تو ہم نے کی تھی تم سے..... ہوش کرو مسرتی..... کیا کر رہی ہو۔ اب تو تم اپنوں میں آ گئی ہو، دشمنوں میں تو نہیں..... ہوش کرو میری جان۔'' شینا پھپھو نے ان کے چہرے پر آنے والے بادل پیچھے کرتے ہوئے بہت محبت سے بولیں لیکن مسرت جہاں ہوش میں ہی کہاں تھیں۔ بابر شاہ کی بانہوں میں مچلتے ہوئے مسلسل یہی تکرار کر رہی تھیں۔

''مجھے چھوڑ دو..... میں نے یہاں نہیں رہنا..... مجھے چھوڑ دو..... مجھے معاف کر دو۔''

وہ سب جو مسرت جہاں کے وجود سے نا آشنا تھے اور آج پہلی بار انہیں دیکھ رہے تھے ان کا اس گھر سے تعلق اور ربط تو جان چکے تھے لیکن کسی نے مداخلت نہیں کی۔ سبھی کے عالم عجیب تھے۔

''مسرت تمہارا کوئی قصور نہیں..... پھر تم تو اپنے کیے سے زیادہ کفارہ ادا کر چکی ہو۔ ہم میں سے کسی کے دل میں تمہارے لیے کوئی میل نہیں.....'' اظہر شاہ مسرت جہاں سے مخاطب تھے لیکن مسرت جہاں ان کی آواز سے بے خبر ہو چکی تھیں۔ شدید ہیجان اور غیر

متوقع صورت احوال نے ان سے ان کے حواس چھین لیے تھے۔ وہ بے ہوش ہو کر بابر شاہ کے بازوؤں میں جھول گئیں۔ بابر شاہ انہیں بازوؤں میں سنبھال کر اندر لے آئے۔ سبھی اردگرد جمع تھے لیکن یوں جیسے بے زبان ہوں۔ ماحول پر طاری سکوت میں بس سب کی خوفزدہ سانسوں کا دھیما دھیما ارتعاش تھا۔ آریان پریشان سی کھڑی صورتحال کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''فواد..... کچھ کرو..... جلدی.....'' بابر شاہ عجلت میں بولے۔ مسرت جہاں کو اماں بی کے بستر پر لٹا دیا۔ فواد اپنا بیگ اٹھا کر لے آئے۔ اسٹیتھی سکوپ سے ہارٹ بیٹ چیک کرنے کے بعد انہوں نے ایک انجکشن لگایا۔

''ابو! کوئی مسئلہ نہیں بس ذہنی دھچکہ برداشت نہیں کر پائیں، سکون آور نیند کا انجکشن لگا دیا ہے، اٹھیں گی تو بہتر ہوں گی۔'' فواد نے کہا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

''میرا خیال ہے آپ سب بھی اپنے اپنے کمروں میں چلے جائیں..... آرام کریں..... رات کافی گزر چکی ہے۔'' بابر چچا کے کہنے پر سب آہستہ آہستہ سرکنے لگے۔ اب کمرے میں بابر چچا، شینا پھپھو اور اماں بی رہ گئی تھیں۔ رات گزر گئی لیکن مسرت جہاں کے سوا کسی کی آنکھیں نہ بند ہوئیں اور نہ کوئی سو سکا۔ اماں بی کی نظریں مسرت جہاں کے خوبصورت لیکن تھکے ہوئے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں۔ آج سے اکیس سال پہلے سترہ اٹھارہ سالہ مسرت جہاں اور آج کی مسرت جہاں میں کتنا فرق تھا۔ ایسی ہی ایک اندھیری رات میں وہ سادات نگر کی دہلیز پار کر کے گئی تھیں اور اکیس سال بعد ایک رات اور ان سب کی زندگیوں میں آئی تھی جو ملن کی رات تھی۔ بہت ہولے ہولے ان کی پلکوں نے جنبش کی۔ اماں بی کے متحرک ہاتھ تسبیح پر رک گئے اور ہونٹ ورد کرتے کرتے ساکت ہو گئے۔ اگلے ہی پل انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ ایک لمحے تک ان کی آنکھوں میں اجنبیت کا تاثر تھا پھر جیسے ہی ماحول سے آشنائی ہوئی ان کے چہرے پر رات والی وحشت نے ایک بار پھر پنجے گاڑ لیے۔ وہ اٹھ بیٹھیں لیکن اس بار اماں بی نے انہیں کچھ کہنے نہ دیا۔ بس اپنے ناتواں بازوؤں میں بھر کر اپنے سینے سے لپٹا لیا تو مسرت جہاں ایک مدت کے بعد ممتا کا لمس پاتے ہی بکھر گئیں اور ان کے وجود میں سمٹ کر کسی بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں، ایسا لگ رہا تھا جیسے آج وہ اپنے اندر کا سارا دکھ آنسوؤں کے راستے باہر نکالنا چاہتی تھیں یا آج پوری کائنات اپنے آنسوؤں میں ڈبونا چاہتی تھیں۔ ان کے یوں بلک بلک کر رونے کی آواز سن کر باقی سب بھی کمرے میں آ گئے۔ روتے روتے ان کی آنکھیں سوج گئی تھیں اور ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔

''رو لو..... رو لو مسرت جہاں..... ان آنسوؤں کو بہا دو جو تمہارے دل پر بوجھ ہیں، اپنی روح کے تمام زخم دھو لو ان آنسوؤں سے آج کے بعد تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں آنے چاہئیں۔'' بابر شاہ نے آگے بڑھ کر مسرت جہاں کے سر پر ہاتھ رکھا۔

''مسرت جہاں قصور تمہارا نہیں تھا ہماری بھی غلطی تھی۔ ہمارے رویئے، ہماری انا' ہمارا پیدا کردہ ماحول ہی غلط تھا۔ ہمیں جلد ہی پتہ چل گیا تھا کہ تمہارے اس قدم کے پیچھے ہماری خطائیں ہیں۔ بس اب تم بھی ذہن سے سب کچھ نکال دو۔'' بابر شاہ نادم سے لہجے میں بولے۔

''لیکن بھائی میں یہاں نہیں رہ پاؤں گی..... میرا داغدار وجود اس گھر کے تقدس کو بھی میلا کر دے گا.....'' مسرت جہاں کا سر بھی

جھکا ہوا تھا اور نگاہیں بھی اور لہجے میں دل میں ترازو ہو جانے والا کرب تھا۔ اماں بی کا دل کٹ کر رہ گیا۔

''اب اگر دوبارہ تم نے ایسی بات کی تو میں تمہارا منہ توڑ دوں گی۔'' اماں بی کی بات سن کر مسرت جہاں نے چونک کر سر اٹھایا لیکن اس مقدس چہرے پر ان کے لیے غصہ نہیں مامتا کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا پھر ان کی نگاہیں اپنے بھائیوں کی طرف اٹھ گئیں جن کے چہروں پر شرمندگی، تاسف، محبت، اپنائیت اور جانے کون کون سے تاثرات رقم تھے۔ بچوں کے چہروں پر الگ عقیدت و احترام محبت اور امید و بیم کے تاثرات دکھائی دے رہے تھے۔ مسرت جہاں تو ایک عرصہ ہوا رشتوں کی آسودگی کو بالکل ہی بھول چکی تھیں وہ تو ایک ایک رشتہ کو ترسی ہوئی تھیں اور یہاں کتنے ہی رشتے جیسے ان کے منتظر تھے، ان کی محبت اور توجہ کے محتاج..... وہ اماں بی سے ایک بھر پھر لپٹ گئیں، غبار چھٹ گیا تھا..... سب کچھ ڈھل گیا تھا، فضا میں تناؤ اور کشیدگی چھٹنے لگی تھی۔

''پھپھو یہ بڑے آپ کی جان کب چھوڑیں گے کب ہماری باری آئے گی۔'' انیقہ نے مسرت جہاں کے کان میں سرگوشی کی تو انہوں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

''ارے بیٹا! میں یہیں تو ہوں آپ کے پاس.....''

''ارے یار خوشی کا مقام ہے۔ خوشی کے موقع پر تو دیگیں چڑھائی جاتی ہیں اور تم لوگوں نے ہمیں ناشتے سے بھی محروم کر رکھا ہے۔'' اظہر چچا ہلکے پھلکے انداز میں بولے تو شینا پھپھو اور زاہدہ چچی ناشتے کی تیاری کے لیے اٹھ گئیں، دن یونہی گزر گیا۔ ایک مدت بعد ملے تھے سو سارا دن ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ مسرت جہاں فیضی چچی اور انیقہ چچی سے بھی ملیں اور انیقہ چچی اپنی عادت کے برخلاف کافی سلجھے ہوئے انداز میں مسرت جہاں سے ملی تھیں۔ شام کے وقت سب لان میں بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ مسرت جہاں کے لیے سبھی کے چہروں پر محبت تھی۔ یوں لگتا تھا اکیس سال پہلے کا وقت پلٹ آیا تھا، بھائیوں کی وہی محبت لوٹ آئی تھی۔ مسرت جہاں بھی جیسے درمیانی عرصہ کی سازی اذیت بھول کر محبتوں کا نیا جہان سمیٹ لینا چاہتی تھیں۔ بابر شاہ اور اظہر شاہ تو کسی کام سے باہر چلے گئے تھے اور جاتے جاتے ایک نیا شوشا چھوڑ گئے تھے۔

''کہ مسرت جہاں تمہارے لئے ایک اور سرپرائز بھی ہے۔'' ان کے لاکھ پوچھنے پر بھی انہوں نے نہیں بتایا یہ کہہ کر چلے گئے کہ ابھی نہیں کل صبح اور وہ خاموش ہو گئیں..... باتوں باتوں میں فرجاد ملک کے بارے میں بھی بابر چچا نے ساری بات تفصیل سے پوچھ لی تھی۔

''ویسے پھپھو! آپ کیلیے سرپرائز بہت بڑا ہے کہیں خوشی سے بے ہوش نہ ہو جایئے گا۔'' انیقہ عادت سے مجبور فوراً بے تکلف ہو گئی۔

''پٹڑی سے اتر گئی فوراً..... بس پھپھو آپ کی بھتیجی میں یہ بہت بڑی خوبی ہے کہ انہیں بڑے چھوٹے سے بات کرنے کی تمیز نہیں ہے۔'' روبیہ جل کر بولی۔

''اور پھپھو! ہماری بڑی بہن روبیہ صاحبہ میں اس سے بھی بڑی خوبی ہے کہ یہ جلتی کڑھتی بہت خوب ہیں۔'' انیقہ بھلا ادھار رکھنے والی تھی۔

''تم دونوں کیا اسی طرح آپس میں لڑتی ہو.....''

''امی! یہ تو کچھ بھی نہیں۔ ان کی تو لڑائی دن کے چوبیس گھنٹوں میں سے تیئس گھنٹے جاری رہتی ہے ایک گھنٹا غالباً یہ تھک جانے کی وجہ سے آرام کرنے میں گزارتی ہیں۔'' آریان نے کہا۔

''اینی آپی یہ فاؤل ہے آپ اپنی امی کے آتے ہی ہماری مخالف ہو گئیں لیکن ایک بات یاد رکھئے یہ آپ کی امی ہیں تو ہماری بھی پھپھو ہیں۔'' انیقہ نے تڑی لگائی۔

''اچھا خیر باتوں میں یہ تو بتایا ہی نہیں کہ ماموں سرپرائز کیا دے رہے ہیں؟'' آریان نے پوچھا۔

''اینی آپی! زیادہ بے صبری کا پھل کڑوا ہوتا ہے۔'' انیقہ نے کہا۔ رات گئے تک بچے انہیں گھیر کر بیٹھے رہے اماں بی نے جب ڈانٹا کہ بس اب آرام کرو۔ جاؤ سو جاؤ۔'' تو سب منہ بسورتے ہوئے اٹھ گئے۔ مسرت جہاں ان کی محبتیں پا کر خود کو بہت پرسکون محسوس کر رہی تھیں۔

صبح کی نماز ادا کر کے مسرت جہاں اماں بی کے بستر میں دبکی ہوئی تھیں جب کمرے کا دروازہ کھلا اور بابر شاہ اندر داخل ہوئے اور اونچی آواز میں بولے۔

''آ جاؤ بھئی..... سارے اندر آ جاؤ بمعہ سرپرائز کے۔'' اور اس بار جب دروازہ کھلا تو سب سے پہلے اندر داخل ہونے والی شخصیت کو دیکھ کر مسرت جہاں کی پلکیں جیسے ساکت ہو گئیں ان کے چہرے پر ایک سکوت سا طاری ہو گیا اور آنے والے کی کیفیت بھی ان سے کچھ مختلف نہیں تھی۔

''فر..... فرجاد.....'' مسرت جہاں کے ہونٹ بہت ہولے سے وا ہوئے اور خوشبو کی طرح یہ نام ان کے ہونٹوں سے ادا ہوا۔ فرجاد ملک بہت دھیمے دھیمے چلتے ہوئے ان کے بالکل قریب آ ٹھہرے اور اگلے ہی پل انہوں نے بڑھ کر مسرت جہاں کے پیر تھام لیے۔

''مسرت جہاں! مجھے معاف کر دو۔'' ان کے لبوں سے بے اختیار نکلا اور مسرت جہاں نے جیسے تڑپ کر اپنے پاؤں پیچھے ہٹا لیے۔

''یہ کیا کر رہے ہیں آپ..... کیوں گناہ گار کر رہے ہیں مجھے؟''

''مسرت جہاں..... زندگی بھر سکھ دینے کا وعدہ کیا تھا، تمہاری جھولی خوشیوں سے بھرنے کی تمنا کی تھی میں نے لیکن جانے اوپر والے کو منظور کیوں نہ ہوا..... تمہاری جھولی غموں اور کانٹوں سے بھر گئی لیکن مسرتی خدا گواہ ہے کہ میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔ میرے ساتھ فیاض نے دھوکہ کیا، اس نے تو مجھے مار ہی دیا تھا لیکن قسمت میں تم سے دوبارہ ملنا لکھا تھا جو میں خود فراموشی کی کیفیت میں بھی زندہ رہا۔ دنیا والوں کے پتھر سہتا رہا لیکن جیتا رہا شاید تمہاری محبت کی تڑپ مجھے زندہ رکھے ہوئے تھی لیکن پھر بھی..... پھر بھی مسرت جہاں میں تم سے معافی مانگتا ہوں..... تمہارے ساتھ ہونے والے ہر ظلم کی وجہ میں ہوں۔''

''ایسا مت کہیں! میں نے کب گزرے ماہ و سال کا حساب مانگا۔ میں جانتی ہوں کہ آپ بے قصور ہیں، آپ کی کوئی غلطی نہیں۔''

مسرت جہاں کے لہجے میں اضطراب تھا۔ ارد گرد موجود سبھی افراد ان دونوں کو دیکھ رہے تھے اور وہ تو جیسے اطراف سے بے خبر بس ایک دوسرے میں گم تھے، ان کی اس محویت میں مخل ہونا وہاں موجود کسی کو ٹھیک نہ لگا تو ایک ایک کر کے کھسکنے لگے، بچوں کو بھی گھور گھور کر وہاں سے باہر نکالا گیا آخر میں شینا پھپھو نے باہر نکل کر کمرے کا دروازہ بھڑ دیا لیکن مسرت جہاں اور فرجاد اس تمام کارروائی کے دوران بالکل بے خبر رہے۔

''مسرتی! تمہاری محبت سے دور ہو کر میں دنیا میں بس در بدر ہی رہا، میں جی تو نہیں رہا تھا، صرف سانسیں لے رہا تھا اور میری ہر سانس اس پاگل پن میں بھی صرف تمہارے لیے آتی جاتی رہی۔'' فرجاد تشنہ لہجے میں بولے۔

''میں بھی تو تڑپتی رہی..... اکیس سال تک۔ آپ تو ہوش و خرد سے دور تھے ناں فرجاد لیکن میں ہوش میں تھی..... ہر آتی جاتی سانس ایک قیامت بن کر وجود کو زخماتی تھی۔ میں تھک گئی تھی فرجاد! لیکن فیاض کے بتانے کے باوجود کہ آپ مر چکے ہیں مجھے یقین نہیں تھا امید تھی کہ میں اپنی محبت سے ضرور ملوں گی..... ایک بار..... صرف ایک بار ہی سہی لیکن آپ سے ملنے کی آرزو اور امید نے مجھے حوصلہ دیئے رکھا کہ میں اپنی عزت کو بچا کر ایک غلیظ جگہ پے ویسی ہی پاک اور صاف آ گئی جہاں کی غلاظت کے چھینٹے بہت بچ کر گزرنے والوں پر بھی پڑ جاتے ہیں۔'' مسرت جہاں کی بات کے اختتام تک فرجاد نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔ مسرت جہاں چونک کر ارد گرد دیکھنے لگیں ''یہ سب کیوں چلے گئے.....؟''

''سبھی بہت عقلمند ہیں..... سمجھتے ہیں۔'' انہوں نے آگے بڑھ کر مسرت جہاں کو بانہوں میں بھر لیا۔ اس مضبوط حصار میں مقید ہو کر ایک طویل عرصے بعد مسرت جہاں نے پرسکون ہو کر پلکیں موند لیں۔ ان کی تھکی ہوئی روح کی مسافت مکمل ہو گئی تھی۔ اکیس سال کے کرب اور اذیت کا اختتام ہو گیا تھا۔

''فرجاد..... اتنا عرصہ کہاں رہے؟'' مسرت جہاں نے ان کے سینے پر سے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔

''استاد کی ٹھوکروں میں رہا۔'' وہ مسکرا کر بولے تو مسرت جہاں نے چونک کر سر اٹھایا۔

''کیا مطلب؟''

''بھئی کہتے ہیں ناں کہ زمانہ استاد ہوتا ہے تو زمانے کی ٹھوکروں میں رہا لیکن تم کیوں چونکیں؟''

''بس یونہی استاد سے کچھ یاد آ گیا تھا۔'' مسرت جہاں کھوئے کھوئے لہجے میں بولیں۔

''کیا.....؟''

''جس جگہ میں رہتی تھی نا..... وہاں ایک شخص تھا غلام عباس۔ سارے اسے گھنگھرو کہہ کر بلاتے تھے۔ بڑی عجیب عجیب باتیں کرتا تھا وہ، میں آج تک نہیں سمجھی۔ وہ مجھے کہا کرتا تھا بی بی میرے استاد نے مجھے بڑا مشکل سبق دیا ہے۔ وہ پڑھتے پڑھتے میری مسافتیں طویل ہو گئی ہیں پر میں جانتا ہوں میرے سامنے منزل نہیں آئے گی لیکن مجھے یونہی سفر کرتے رہنا ہے۔ پتہ ہے فرجاد وہ وہیں پیدا ہوا، وہیں پلا بڑھا لیکن اس ماحول میں جذب نہ ہو سکا، آپ کے منہ سے استاد کا لفظ سنا تو میں چونک پڑی۔'' مسرت جہاں نے کہا تو فرجاد کے چہرے پر

ایک گہری آسودہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''سمجھ گیا..... اس کو جو بنا رکھا تھا نا وہاں کے لوگوں نے وہ نہیں تھا۔ وہ درویش تھا۔ مجذوب تھا وہ تو عقیدت کے قابل تھا۔ جانتی ہو اس کا استاد کون تھا۔''

''نہیں! میں نے ان اکیس سالوں میں بارہا اس سے یہی سوال کیا تھا لیکن اس نے ہر بار یہی جواب دیا کہ ابھی وقت نہیں آیا اور اب جب فہدی مجھے لے کر آ رہا تھا تو میرے سوال کرنے پر اس نے یہی کہا کہ بی بی بہت تھوڑا وقت رہ گیا ہے، سمجھ جائیں گی۔''

''تو کیا تم سمجھی.....؟''

''نہیں.....'' ان کے نفی میں سر ہلانے پر فرجاد ملک نے ہولے سے ان کا سر تھپتھپایا۔

''ارے پگلی..... عشق کر کے بھی نہ سمجھی تم..... لیکن ٹھوکریں کھا کر میں سمجھ گیا۔ وہ عشق کا شاگرد تھا۔ عشق کا سبق پڑھنے والا۔'' اور مسرت جہاں کی نگاہوں کے سامنے جیسے سارے پردے ایک ایک کر کے اٹھ گئے، اس کی ہر بات کا مفہوم انہیں سمجھ آنے لگا، ان کی پلکوں سے عقیدت کے دو آنسو غلام حسین کے نام پر نکلے اور فرجاد ملک کے کشادہ سینے میں گم ہو گئے۔

☆.....☆.....☆

سادات نگر کی پرسکون فضاء میں شدید ہلچل اس وقت ہوئی جب عارب شاہ زمینوں سے واپس آئے۔ مسرت جہاں کو دیکھ کر وہ جس طرح برافروختہ ہوئے، سبھی کے لیے غیر متوقع تھا۔ سب کا خیال تھا کہ جیسے سادات نگر کے دیگر افراد نے انہیں کھلے دل کے ساتھ قبول کیا تھا۔ عارب شاہ بھی ویسا ہی کریں گے لیکن انہوں نے ایک ہنگامہ مچا دیا۔ فرجاد ملک نے اماں بی سے جانے کی اجازت طلب کر لی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی وجہ سے گھر کا ماحول خراب ہو۔ اس معاملے میں اور بھی کوئی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن اماں بی نے انہیں اس شرط پر جانے کی اجازت دی کہ وہ کہیں اور نہیں بلکہ سلطان پور اپنی حویلی میں جا کر رہیں گے۔ فرجاد ملک ان کی محبت کے آگے مجبور ہو گئے۔ اماں بی نے حویلی مسرت جہاں کے نام کر دی تھی وہ اپنے حصے کی تمام جائیداد آریان کے نامہ ہبہ کر دی تھی۔ بابر شاہ ان کے جانے سے چند دن پہلے حویلی کی حالت ٹھیک کروانے کے لیے چلے گئے۔

اور آج وہ سادات نگر سے رخصت ہو کر جا رہے تھے۔ سبھی انہیں گیٹ تک رخصت کرنے آئے۔ بابر شاہ واپس آ چکے تھے اور اب فرجاد اور مسرت جہاں کو وہاں چھوڑنے کے لیے جانے کا فریضہ اظہر شاہ نے اپنے سر لے لیا۔

''مسرتی وہاں جا کر بھول نہ جانا..... جلدی جلدی چکر لگایا کرنا، ہم بھی بہت جلد آئیں گے۔'' زاہدہ چچی نے معنی خیز نظروں سے آریان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو مسرت جہاں سمجھ کر مسکرا دیں۔

''ضرور بھابھی کیوں نہیں..... میں آپ سب کا انتظار کروں گی۔'' مسرت جہاں کی نگاہوں میں فواد کے لیے پیار تھا اور فواد وہ سامنے گاڑی سے پشت ٹکائے ایک ٹک آریان کو دیکھے جا رہے تھے جو ان کی پرشوق نگاہوں سے بچنے کے لیے مسرت جہاں کی آڑ لینے کی

کوشش کر رہی تھی۔ فرجاد ملک نے ایک نظر آریان کے چہرے پر پھیلتے رنگوں کو دیکھا اور پھر فواد کی بے تاب نظروں کو۔ محبت کرنے والے دور سے محبت کی خوشبو کو پہچان لیتے ہیں اور فرجاد ملک خود بے شک اسیر موسم ہجراں رہے تھے لیکن اپنے بچوں کو تو وہ اسیر ہونے سے بچا سکتے تھے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر فواد کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''فہدی! تمہاری پھپھو کے ذریعے تمہارا پیغام مجھ تک پہنچ چکا ہے..... ہم تمہارے منتظر رہیں گے، تمہاری ایک امانت ہے ہمارے پاس۔ جب چاہو آ کر لے جانا۔'' ذومعنی انداز میں کہہ کر وہ گاڑی میں بیٹھ گئے۔ آریان اور مسرت جہاں سب سے گلے ملنے کے بعد گاڑی کی طرف آئیں۔

''اینی..... میرا انتظار کروں گی نا..... زیادہ نہیں بس چند دن۔'' فواد نے میٹھی سی سرگوشی کی اور آریان اثبات میں سر ہلا کر جلدی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ فرجاد ملک اور مسرت جہاں کی مسافت دم توڑ چکی تھی اور منزل ان کے پیروں کے نیچے تھی۔ فواد ابھی منزل سے چند قدم دور تھے لیکن صبح نو کا انتظار اتنا جان لیوا بھی نہیں ہوتا اور ان میں حوصلہ تھا۔ یہ چند قدم کا فاصلہ پاٹنے کا کہ اس کے بعد تو ہر قدم پر ان کے ہمراہ آریان کو ہونا تھا۔ ایک طمانیت بھری سانس سینے میں اتار کر انہوں نے گاڑی کو گیٹ سے باہر جاتے دیکھا اور مسکرا کر واپس ہو لیے، کبھی کبھی وقتی دوری کتنی حسین رفاقت کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔

---ختم شد---

http://kitaabghar.com